

خدا بخش لائبریری

جرنل

۵۰

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

سہ ماہی

خدابخش لائبریری



پٹنہ



خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر : ۲۳۴۲۴/۷۷ قیمت فی شمارہ : پچیس روپے
شمارہ : پچاسواں سالانہ : ۱۰۰ روپے (ہند)
قیمت : پچیس روپے ۲۰ ڈالر ایشیا، ۳۰ ڈالر دیگر ممالک
۱۹۸۹ء

فہرست

مصطفی کمال ہاشمی نے لبرٹی آرٹ پریس (پرو پرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دہلی میں چھپوا کر خدابخش لائبریری سے شائع کیا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی پہلی تصنیف

پنڈت مدن موہن مالویہ

حالاتِ زندگی

پیشگفتار

پنڈت مدن موہن مالویہ کا تحریک آزادی کے اکابرین میں بڑا درجہ ہے۔ سیاست میں کانگریس اور ہندو مہاسبھا کے ساتھ ان کا نام ہماری تاریخ کا جزو بن چکا ہے۔ اسی طرح تعلیمی میدان میں بھی بنارس ہندو یونیورسٹی کے سرخیل کی حیثیت سے ان کا بڑا مقام ہے۔

مالویہ جی ۲۵ دسمبر ۱۸۶۱ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے، یہ چار بار کانگریس کے صدر رہے، ۱۹۰۹ء، ۱۹۱۸ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء۔ جس سال مسلم لیگ قائم ہوئی اسی سال یعنی ۱۹۰۶ء میں انھوں نے ہندو مہاسبھا قائم کی لیکن ان کا اصل کارنامہ ۱۹۱۶ء میں بنارس ہندو یونیورسٹی کا قیام ہے۔ جس کے لیے یونیورسٹی ایکٹ پہلی اکتوبر ۱۹۱۵ء کو پاس ہوا اور جس نے یکم اکتوبر ۱۹۱۷ء سے کام شروع کر دیا اور ۱۲ دسمبر ۱۹۲۱ء سے باقاعدگی کے ساتھ اپنی عمارت میں منتقل ہو گئی۔ اس یونیورسٹی کے لیے انھوں نے ۱۹۱۱ء سے جدوجہد شروع کی تھی اور ۱۹۱۵ء تک اپنی پرخلوص جدوجہد سے ۲۵ لاکھ روپیہ اکٹھا کر لیا تھا۔ یونیورسٹی نے اپنے بانی کے احسان کو یاد رکھا اور پنڈت مدن موہن مالویہ ۱۹۲۱ء ـ ۱۹۳۱ء تک اس کے شیخ الجامعہ رہے۔

مالویہ جی کی عظمت مذہب کے ساتھ ان کی زبردست وابستگی میں پوشیدہ تھی۔ مذہب انھیں ہر حال میں محبوب تھا۔ سی۔ ایف۔ اینڈریوز (C.F.Andrews) کے الفاظ میں:

"More, perhaps, than any other national leader of the present generation, Pundit Madan Mohan Malaviya has stood out for Hindu orthodoxy in its most binding religious form. This scrupulous exactness of religious observance had made him undergo incredible hardships in the name of his religion which

he holds so dear. In his extreme Hindu outlook lies the main difference betweeen himself and every other leader of first rank in Indian politics to-day. I do not know any outstanding personality who carries his orthodoxy as far as Malaviya. He is conservative to the last degree in everything where Hinduism is concerned, while at the same time in national affairs he is in many respects an advanced thinker. For this reason a conflict is always going on within, between his Hindu orthodoxy and his Indian Nationalism. Divided loyalties tear him asunder; but whenever it comes to a tug of war, Hinduism wins. More and more, as he has grown older, Hindu loyalty has prevailed and Indian Nationalism, as such, has tended to recede into the background".

(Great Men of India,Ed. by L.F.Rushbrook Williams, Delhi, 1985, p. 247.)

لیکن بسا اوقات مالویہ جی نے اپنی اس کٹر مذہبیت کو حب الوطنی پر قربان بھی کیا ہے ۔ سی۔ایف اینڈریوز نے لکھا ہے:

"In certain sudden emergencies, when the call of his country came to him with compelling force, he was ready to throw even his own strict Hindu orthodoxy aside and take steps which led him into forbidden paths". (Ibid. p. 249)

مالویہ جی نے مختلف ہفتہ وار اور روزنامے ہندی اور انگریزی میں نکالے اور مشہور اخبار ہندوستان ٹائمز میں ۱۹۲۴ء سے ۱۹۴۶ء کے طویل عرصہ تک اس کے بورڈ آف ڈائریکٹرس کے چیرمین رہے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں یوپی میں کورٹ کچہری کی زبان فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ مالویہ جی نے دیوناگری رسم الخط کیلئے تحریک چلائی جس کے نتیجہ میں بالآخر ۱۸۹۸ء میں گورنر یو۔پی نے اس مطالبہ کو تسلیم کرلیا۔ مالویہ جی نے اردو کی کبھی مخالفت نہیں کی، بلکہ وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ جو شخص ہندی جانتا ہے، اسے اردو اور انگریزی بھی ضرور سیکھنا چاہئے۔ خود انھوں نے اپنے بیٹے گووند کو (جب باپ اور بیٹا دونوں جیل میں تھے) اردو سکھلائی۔ مالویہ جی کی تقریریں ایسی زبان میں ہوا کرتی تھیں جسے ہندی یا اردو کسی بھی زبان کا جاننے والا بآسانی سمجھ لیتا تھا۔



اعلیٰ پایہ کے انشاپرداز، بلند پایہ کے مفکر سید ابوالاعلیٰ مودودی، سابق حیدرآباد اور حال مقام مہاراشٹر کے ایک شہر اورنگ آباد میں ۲۵ر ستمبر ۱۹۰۳ر کو پیدا ہوئے۔ لکھتے ہیں:۔

"میں نے ۱۹۰۳ر میں اورنگ آباد کے مقام پر ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جو برصغیر پاک و ہند میں انگریزی طرز زندگی اختیار کرنے میں پیش پیش تھا۔ علی گڑھ کالج کے قیام سے کچھ عرصہ پہلے سرسید احمد خاں نے ایک مدرسۃ العلوم

قائم کیا تھا۔ میرے والد مرحوم اس مدرسہ کے اولین طلباء میں سے ایک تھے، اور وہ قدرتی طور پر سرسید کی تحریک سے بہت متاثر تھے۔ لیکن ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۳ء کے درمیانی وقفہ میں ان کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ اس مغربی تعلیم نے ان کی زندگی کو اسلام کے راستے سے ہٹا دیا ہے۔ اس احساس کی بدولت ان میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا۔ وہ اب مغربی تہذیب اور اس کی اخلاقی قدروں سے سخت متنفر ہو گئے تھے۔

... میرے خاندان کے متعلق دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں اس خاندان کو سخت دشواریوں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزوں کے تشدد نے اس خاندان کے افراد میں انگریزوں کے خلاف شدید جذبۂ نفرت پیدا کر دیا تھا۔ اسی رچے بسے جذبے کے تحت والد مرحوم انگریزی ملازمت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اس ماحول میں پروان چڑھنے کے باعث میرے دل میں انگریزی ملازمت کی طرف کبھی میلان پیدا نہیں ہوا۔ والد مرحوم میری تربیت پر خصوصی توجہ دیا کرتے تھے۔ وہ میری زبان اور اخلاق کو معیاری، ستھرا اور پاکیزہ بنانے کی انتہائی کوشش کرتے تھے۔ وہ راتوں کو مجھے پیغمبروں کے قصے، تاریخ اسلام اور تاریخ ہند کے واقعات اور سبق آموز کہانیاں سنایا کرتے تھے ... میں نے گھر پر عربی پڑھی، اسکولوں اور کالجوں میں مختلف علوم زیر مطالعہ لیے۔ انگریزی زبان میں استعداد تعلیمی دور کے بعد حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانہ کا مجھے کوئی خاص واقعہ یاد نہیں۔ میں ایک اوسط درجہ کا طالب علم تھا۔ اور میرے ذہن نے کبھی بھی مستقبل کا کوئی حسین خاکہ نہیں بنایا۔ البتہ اس دور میں مجھے یہ احساس ضرور ہو گیا تھا کہ مجھ میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔

جب میں کالج کی تعلیم سے فارغ ہوا تو اس وقت میری عمر سولہ سترہ سال کی تھی۔ اس کے بعد میں نے 'آوارہ خوانی' شروع کی۔ جو کچھ ملا پڑھ ڈالا۔ ہر موضوع اور ہر عنوان پر ہر قسم کی کتابیں پڑھیں۔ اس آوارہ خوانی کا نہایت خطرناک نتیجہ برآمد ہوا۔ خدا اور آخرت پر سے یقین اٹھتا چلا گیا۔ تشکیک وارتیاب سے ایمان و یقین کی بنیادیں منہدم ہو گئیں۔ خدا کا وجود سمجھ میں نہ آتا تھا۔ تمام دینی عقائد لغو اور غیر منطقی نظر آتے تھے۔ ایک ڈیڑھ سال یہی کیفیت رہی۔

تشکیک و تذبذب کی یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی۔ عربی زبان پر خاصا عبور حاصل تھا۔ میں نے قرآن اور حدیث کا براہ راست مطالعہ شروع کیا۔ حقائق و معارف کھلتے چلے گئے۔ بے یقینی کا غبار دھلتا چلا گیا۔ میں نے دوسرے ادیان کی کتابوں کا مطالعہ کر رکھا تھا۔ ادیان کے تقابلی مطالعہ نے مجھے ایک گونہ اطمینان عطا کیا۔ دراصل اب میں نے اسلام سوچ سمجھ کر قبول کیا تھا۔ مجھے اس کی حقانیت پر کامل یقین تھا۔"

مولانا کی صحافتی زندگی کا آغاز "جمعیت العلمارِ ہند" کے اخبار "الجمعیت" کی ایڈیٹری سے ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ ۱۹۲۶ء میں ایک مسلمان نے مشہور آریہ سماجی سوامی شردھانند کو قتل کر دیا جس پر ہندوؤں نے اسلامی تعلیمات کو مورد الزام ٹھہرایا۔ اس کی تردید میں مولانا نے "الجہاد فی الاسلام" کتاب لکھی اور اسی کتاب سے علمی دنیا میں آپ متعارف ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں آپ "الجمعیت" سے الگ ہو کر حیدرآباد چلے گئے جہاں حکومت آصفیہ کی تاریخ لکھی۔ پھر ۱۹۳۳ء میں آپ نے حیدرآباد سے ایک ماہوار مجلہ "ترجمان القرآن" جاری کیا، جو اب لاہور سے شائع ہوتا ہے۔

(۴) قیام پاکستان کے بعد مولانا لاہور چلے آئے اور اسی شہر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا۔ ۱۹۵۲ء میں جب تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں لاہور میں گڑبڑی ہوئی تو مارشل لا نافذ کر دیا گیا اور دیگر علمار کے ساتھ آپ کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور سزائے موت مقرر کی گئی۔ مگر بعد میں رہا کر دیے گئے۔ ایوب حکومت کے قیام کے بعد بھی آپ کئی مرتبہ گرفتار ہوئے۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو انتقال ہوا۔

مولانا اپنی دینی بصیرت اور اپنے افکار کے لیے تو ایک بڑے حلقہ میں مشہور ہیں ہی، لیکن خود اردو نثر کی تاریخ میں بھی ان کا مقام محفوظ ہے اور بعض تو انھیں ایک صاحب طرز ادیب بھی مانتے ہیں۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ آگے چل کر مالویہ جی ہندو مہا سبھا سے وابستہ ہو گئے اور مولانا مودودی نے جماعت اسلامی کی بنیاد ڈالی۔



پنڈت مدن موہن مالویہ کے حالات زندگی پر مولانا مودودی کی تصنیف "حالات زندگی: آنریبل پنڈت مدن موہن مالویہ آف الہ آباد" انکی پہلی تصنیف ہے۔ اس بات کا انکشاف حکیم حسین خاں شفا اسسٹنٹ لائبریرین رضا لائبریری، رامپور نے اپنے ایک مختصر مقالہ "پنڈت مدن موہن مالویہ کی سوانح" میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"البیرونی نے ۱۰۳۰ء سے قبل ہندوستان کی توصیف و تقدیس بیان کرتے ہوئے ہندوستانیوں کے بارے میں لکھا تھا: "یہ لوگ حمق و خود فریبی کے لاعلاج مرض میں مبتلا ہیں۔ اونچ نیچ چھوت چھات، طبقاتی کشمکش کا شکار ہیں۔ اپنے ذات اور اپنے فرقے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ بیرونی دنیا کے بارے میں ان کی معلومات بے حد محدود ہیں سمندر پار سفر کرنا ان کے یہاں گناہ ہے۔ اگر یہ لوگ ان خامیوں کی اصلاح کر لیں تو اپنے بزرگوں کی طرح دنیا میں نام روشن کر سکتے ہیں۔ ان کے اجداد جن کے علمی کارنامے ہمارے سامنے ہیں ایسے نہیں تھے۔"

البیرونی نے ہزار سال قبل جن امراض کی نشاندہی کی تھی۔ ہندوستانیوں نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ جس کے نتیجہ میں بیرونی طاقتیں ہندوستان پر یلغار کرتی رہیں

اور فتح یاب ہوتی رہیں۔ اور انگریزوں نے انتہائی قلیل تعداد میں ہوتے ہوئے ایک لمبے عرصہ تک ہندوستانیوں کو اپنا غلام بنائے رکھا۔ جس کے خلاف محب وطن ہندوستانیوں کو اپنے پورے وسائل کے ساتھ ایک طویل جنگ آزادی لڑنا پڑی۔ اس جنگ میں مختلف موڑ اور نشیب و فراز آئے۔ مختلف الخیال لوگوں نے اپنے اپنے طریقے سے اس جنگ میں حصّہ لیا۔ اور اپنے مطمع نظر سے اس کی داستان تحریر کی، ہندوستان میں کانگریس پارٹی کی تشکیل اور اس میں مولانا محمد علی جوہر و گاندھی جی کی شمولیت ایک تاریخی واقعہ ہے۔ ان دونوں لیڈروں نے اس بات کو محسوس کیا کہ انگریزوں پر فتح حاصل کرنے کے لیے ہندوستانی قوم میں سیاسی شعور اور حب الوطنی کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم اتحاد بھی اشد ضروری ہے۔ اتفاق سے اسی دوران مسئلہ بقائے خلافت عالم اسلام کو درپیش ہوا۔ جو ایک خالص مذہبی مسئلہ اور مسلمانوں سے متعلق مسئلہ تھا۔ اس کے سلسلہ میں ہندوستانی مسلمان بہت پر جوش تھے۔ یہ گاندھی جی کی سیاسی بصیرت تھی کہ انہوں نے اس مسئلہ میں مسلمانوں کی حمایت کر کے ان کا دل جیت لیا۔ جس کے نتیجہ میں یہ دونوں قومیں شیر و شکر ہو گئیں۔ اور ہندو مسلم اتحاد کا ایسا منظر دیکھنے میں آیا جو اس سے پہلے یا بعد ہندوستان کی تاریخ میں ظہور پذیر نہیں آیا۔ گاندھی جی نے تحریکِ خلافت کے ساتھ اپنی ستیہ گرہ اور تحریک آزادی کو ملا دیا۔ ان تحریکوں کے دوران یہ طے ہوا کہ ہندو اور مسلمان لیڈر اور اہلِ قلم دونوں فرقوں کے قومی رہنماؤں کا احترام کریں۔ قوم کو کانگریس کی پالیسیوں سے روشناس کرائیں اور قومی یک جہتی کو فروغ کریں۔ اگر خدانخواستہ دونوں فرقوں میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آجائے تو اپنے ہی فرقے کی اصلاح کی کوشش کریں۔ دوسرے فرقہ کو موردِ الزام نہ ٹھہرائیں۔ ان دونوں قومی لیڈروں کے اس جذبے کو پروان چڑھانے والوں میں ایک نوجوان صحافی سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام بھی آتا ہے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں اخبار "تاج" جبل پور مدینہ بجنور و دیگر اخبارات و رسائل میں مضامین کے ساتھ دو اہم کتابیں تصنیف کیں۔ ایک مہاتما گاندھی کی سوانح اور دوسری پنڈت مدن موہن مالویہ کے حالاتِ زندگی سے متعلق۔ اس تحریک سے متعلق جو لٹریچر عالمِ وجود میں آیا تھا وہ آج بھی بے حد اہم ہے۔ حسن اتفاق سے اس عہد کی کچھ یادگار چیزیں ذخیرہ رامپور میں محفوظ ہیں۔ جن میں مذکورہ کتاب بھی شامل ہے۔

۱۔ یہ ۱۹۱۹ء میں لکھی ہوئی پنڈت مدن موہن مالویہ جی کی پہلی سوانح ہے جو اردو زبان میں لکھی گئی اس میں ضمناً کانگریس پارٹی کی تاریخ بھی آگئی ہے۔

۲۔ اس کے مصنف عظیم ادیب، مفکر اور جماعت اسلامی کے بانی ہیں۔

یہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی پہلی باضابطہ تصنیف ہے جو پہلی مرتبہ علمی حلقوں میں روشناس ہو رہی ہے۔ اس کتاب کا ذکر نہ تو مولانا نے خود اپنی کسی تحریر یا تقریر میں کیا ہے اور نہ مولانا پر لکھنے والوں میں سے کسی نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے۔

۳۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری پٹنہ نے ایک اہم کتاب "مشاہیر کے اولین صحیفے" کے نام سے ۱۹۷۰ء میں مرتب کی ہے۔ جس میں کافی تحقیق و تلاش کے بعد دیگر مشاہیر کی اولین تحریروں کے ساتھ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی اولین تحریر حوادثِ سمرنا سے متعلق یک ورقی رپورٹ مطبوعہ ۱۹۲۱ء کو قرار دیا ہے۔ بیدار صاحب لکھتے ہیں کہ "مودودی صاحب کی زیرنظر تصنیف سے قبل کا کوئی باقاعدہ تصنیف مجھے ابھی نہیں ملی ہے۔ معارف کے پرچوں میں اپنے نانا قربان علی بیگ سالکؔ تلمیذ غالبؔ کی دو ایک چیزیں چھپوا لینے کا ادبی گناہ البتہ ان سے ایک دو سال پہلے سرزد ہوتا رہا تھا۔"[1] لیکن ہماری دریافت شدہ کتاب ۱۹۱۹ء کی مطبوعہ ہے۔ اور یہ قومی یکجہتی و ہندو مسلم اتحاد کے سلسلہ کی مولانا کی دوسری باقاعدہ تصنیف ہے۔ مولانا اپنی سوانح میں خود تحریر کیا ہے کہ "۱۹۱۸ء میں میں نے اور میرے بھائی نے اخبار مدینہ بجنور میں مل کر کام کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں سیاسی تحریک کی زبردست ابتدا ہو رہی تھی۔ میں نے "انجمن اعانت نظربندان اسلام" میں بھی کام شروع کر دیا اور پھر ۱۹۱۹ء میں جب خلافت اور ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز ہوا تو اس میں بھی حصہ لیا۔ اسی زمانہ میں میں نے گاندھی جی کی سیرت پر بھی ایک کتاب لکھی۔ مگر وہ ابھی زیر طبع ہی تھی کہ میرے ایک عزیز نے پولیس سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی اور اسے ضبط کر لیا گیا"[2] دراصل مولانا نے دو کتابیں گاندھی جی اور مالویہ جی پر ایک ساتھ لکھی تھیں۔ برٹش حکومت جو ہندو مسلم تفریق اور تصادم کے لئے ہر حربہ استعمال کر رہی تھی۔ اسے مولانا مودودی کا ہندو مسلم اتحاد قومی یکجہتی اور کانگریس پارٹی کی حمایت میں کچھ لکھنا گوارا نہیں تھا۔ لہٰذا مولانا کی ان دونوں کتابوں کو ضبط کر لیا گیا۔

گاندھی جی سے متعلق کتاب کے بارے میں اس وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا کیا حشر ہوا یا اب کہاں ہے؟ البتہ حالات زندگی پنڈت مدن موہن مالویہ ۱۹۱۹ء میں دفتر تاج جبل پور سے شائع ہوئی تھی۔

مولانا مودودی کی اس تصنیف کا ایک اچھا اور مکمل نسخہ خدا بخش میں محفوظ ہے۔ آئندہ صفحات میں اسی نسخہ کا عکس پیش ہے۔

——— ادارہ

---

[1] معارف ستمبر ۱۹۱۸ء غزل سالکؔ مرسلہ ابوالاعلیٰ مودودی[؟] معارف اپریل شہر آشوب و مرثیہ دہلی عنایت فرما مولوی ابوالاعلیٰ مودودی سے ملا ہے۔

[2] کتاب نما (دہلی) فروری ۱۹۸۹ء، ص ص ۳۳-۳۵۔

سلسلہ نمبر ۲

حالاتِ زندگی

آنریبل پنڈت مدن موہن مالویہ - آف الہ آباد

جسے

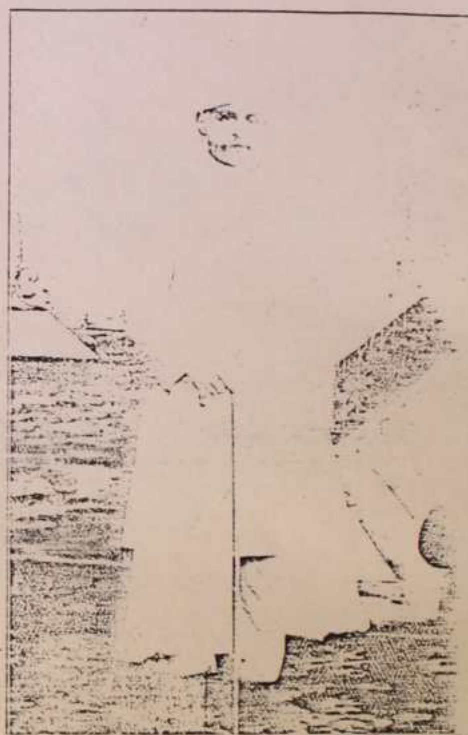
دفتر تاج جبلپور نے شائع کیا

ایک ہزار جلد

مطبوعہ اشتراکی پریس دہلی ۱۳۳۷ھ ۱۹۱۹ء

پرنٹر منشی عبدالمجید

دفتر 'تاج' جبل پور



[illegible]

۸۶

پنڈت مدن موہن مالویہ

تمہید

موجودہ زمانہ میں اگر کسی ہندوستانی کے لئے کوئی سب سے بڑا قابل فخر عہدہ ہے تو وہ انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت ہے۔ وہ کانگریس جو ہندوستان کی تمام بدنظمیوں کو رفع کرنیکے لئے بنائی گئی ہو۔ وہ کانگریس جسکا نشوونما ہندوستان کے اس تاریک عہد میں ہوا ہو جس میں ہندوستانیوں کی آواز پر نہ کوئی کان دھرنے والا ہو اور نہ انکے جذبات و داعیات کی قدر کرنے والا۔ ایسی حالت میں کانگریس کی صدارت کے لیے اگر کوئی شخص موزوں ہوسکتا ہے تو وہ ایسا ہی کہ نہ وہ کسی ملامت کرنیوالے کے خوف سے اپنی آواز کو پست بنالے اور نہ کسی مسلح پولیس کے سپاہی سے ڈر کر اپنے جذبات تلملب کا اظہار کرنا روکدے۔ کانگریس کا صدر وہی ہوسکتا ہو جس میں ہندوستانیوں کے خیالات انکے داعیات اور مطالبات کو سمجھنے کی پوری قابلیت ہو اور وہ اچھی طرح سمجھہ سکتا ہو کہ ہندوستان کے لیے کس قسم کا نظم ونسخ مفید ہوسکتا ہے کانگریس کی ابتدائے پیدایش سے ابتک جسقدر صدر منتخب ہوئے ہیں وہ ہندوستان کے بہترین دماغ تھے وہ جو کچھہ کہتے تھے اسپر عمل بھی کرتے تھے اور یہی

ان کا نصب العین تھا انھوں نے اپنی تمام زندگی قوم اور ملک کی خدمات کے لیے وقف کر دی تھی۔ اور وہ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جنکے کارنامے ہندوستان کی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔

سر سریندر ناتھ بنرجی، دادا بھائی نوروجی، پنڈت اجودھیا ناتھ، مسٹر بال گنگادھر تلک اور سر رامنی آئر کے آغوش میں جس کانگریس نے تربیت پائی ہو اس کی صدارت کے لیے جیسے ماہر سیاست اور ہمدرد ملک و قوم کی ضرورت ہے اس کی قابلیت سے اس آسمان کے نیچے کسکو انکار ہو سکتا ہے پس اگر آپ اس بزرگ قوم سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں جسے نہ صرف اس سال بلکہ اس سے پہلے بھی کانگریس کی صدارت کا شرف حاصل ہوا ہو تو معلوم کیجیے کہ وہ بزرگ پنڈت مدن موہن مالویا ہے۔ پنڈت مدن موہن کو اس سے قبل بھی اس موقع پر ہندوستان کی نظر انتخاب نے چنا تھا جبکہ ہندوستان کے لیے معتوماتے اسکیم طیار کی گئی تھی اور جسوقت ہندوستان کا نیم سرکاری اخبار پائیونیر کہ رہا تھا کہ اب تو تمہارے لیے ایک ایسی اسکیم طیار ہو گئی ہے جو تمہاری خواہشات کو پوری طرح رفع کر سکتی ہے لہذا اب کانگریس کی زندگی کا خاتمہ کر دو! لیکن اس نازک موقع پر بھی اس اسکیم کی صداقت اور اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے پنڈت مالویا ہی منتخب ہوئے تھے اور اب جبکہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ گول میز پر ہونے والا ہے جبکہ ادنیٰ ادنیٰ جماعتوں کو بھی یہ موقع دیا جا رہا ہے کہ وہ حسب منشا کانسٹیٹیوشن کو چاہیں اختیار کریں اور ہر قوم کو اپنی طبیعت اور اپنے ماحولیات کے مطابق کام کرنیکی اجازت دی جا رہی ہے۔ اور ہندوستان کے لیے بھی ایک عجیب و غریب اصلاحی اسکیم طیار کی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ مواقع ہندوستان کے لیے نہایت نازک ہے اور اگر اس نے اس زرین موقع سے

فائدہ نہ اوٹھایا اور اپنے مطالبات کو جمہوریت پھیلانے والی انگلستان اور امریکہ کی جماعتوں کے سامنے نہ پیش کیا تو پھر اس کے لیے ایسا موقع ہرگز نہ پیش آئیگا اور وہ محکومیت کے تاریک و ذلیل گڑھے میں زندگی بسر کرنے کو مجبور ہو جائیگا پس اس موقع پر ضرورت تھی ایک ایسے قابل و فہیم شخص کی جسنے سیاست ہند کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہو جو موجودہ حالات اور ہندوستان کی ضروریات سے کامل واقفیت رکھتا ہو۔ ان قسمتوں کا فیصلہ کرنے والی جماعت کو ہندوستان کے جذبات سے اچھی طرح مطلع کر سکتا ہو۔ اور اس کے لیے ہندوستان نے اپنے لایق ترین فرزندوں میں سے پنڈت مدن موہن مالویا کو انتخاب کیا ہے! +

ابتدائی حالات

پنڈت مدن موہن مالویا ۱۸ دسمبر ۱۸۶۲ء کو پیدا ہوئے انکے دادا اور والد سنسکرت کے بڑے عالم تھے اور انکی قابلیت کی الہ آباد میں بڑی شہرت تھی۔ انکے والد پنڈت برج ناتھ مالویا علاوہ سنسکرت کے ہندی زبان میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے بھگوت گیتا کے اکثر حصوں کا جس قابلیت سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا تھا اسکا یہ اثر تھا کہ انکی آبائی شہرت میں اضافہ ہو گیا اور ہر شخص انکی عزت کرنے لگا۔ پنڈت مدن موہن کی ابتدائی تعلیم خانگی طور پر ہندی اور سنسکرت میں ہوئی اور اس کے بعد وہ شہر کے پاٹھ شالہ میں داخل کر دیے گئے۔ یہاں سے مکمل ہو کر انھیں مقامی اسکول میں داخل کیا گیا اور انٹرنس کی سند حاصل کر کے وہ میور سنٹرل کالج میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ۱۸۸۴ء میں انہوں نے بی۔ اے کامیاب کیا۔ کالج میں انکی طبعی ذہانت اور فطری قابلیت کے جواہر پوشیدہ نہ تھے ہر شخص انکی تعریف کرتا تھا اور پروفیسر انکے دلدادہ تھے۔

ہندوستان کی رسم کے مطابق مسٹر مالویا کو ۱۸۷۸ء میں جبکہ انکی عمر ۱۶ سال کی تھی ازدواج کا نشانہ بنایا گیا ابھی انکی تعلیم کا زمانہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ دنیا کی افکار میں مبتلا کر دیا گیا۔ لیکن جس طرح ہو سکا انہوں نے تعلیم کو جاری رکھکر بی۔ اے کی سند حاصل کی اور مجبوراً ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ انکے پرانے اسکول میں جس سے کہ وہ انٹرنس کامیاب ہوئے تھے ایک انگلش ٹیچر کی ضرورت تھی۔ جہاں انکا تقرر ہو گیا اور ۲ سال تک وہاں ملازم رہے۔ انکی قابلیت اور ذہانت کا یہ اثر تھا کہ طالب علم اور اساتذہ انکے دلدادہ تھے اور سب انکو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن ابھی تک انکے حقیقی جوہر پردہ خفا میں مستور تھے۔ لوگ یہ ضرور جانتے تھے کہ پنڈت مدن موہن ایک ذہین اور قابل نوجوان ہے لیکن کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ نوجوان۔ ہندو قوم کی رہنمائی کرنے کی قابلیت بھی رکھتا ہو اور اس میں وہ ذہانت موجود ہے جس کی اسوقت ہندوؤں کو ضرورت ہے۔ اس پوشیدہ اور مستور جوہر کو سب سے پہلے راجہ رامپال سنگھ نے پہچانا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا تھا۔ راجہ رامپال سنگھ جو اودھ کے ایک روشن خیال تعلقہ دار تھے۔ کلکتہ میں اس نوجوان سے ملے۔ انہوں نے اس میں فراست اور دانائی کے دراہدار کی چمک کو محسوس کیا اور اپنے روزانہ اخبار "ہندوستانی" کی اڈیٹری کے لیے تجویز کیا۔

روزانہ اخبار "ہندوستانی" ہندی زبان کا ایک روزانہ اخبار تھا۔ راجہ صاحب نے اسے جاری کیا تھا اور خود ہی اسکو اڈیٹ کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے اس ۲۴ سالہ نوجوان کو بہ نسبت اپنے اس کام کے لیے زیادہ موزوں پایا۔ انہوں نے پنڈت مدن موہن میں آزادی، حب الوطنی اور غیر مفتوح جوش پایا اور اس کے بعد تحریر کی خوبی پر فریفتہ ہو گئے۔ انہوں نے مالوی جی کو مجبور کیا کہ وہ "ہندوستانی"

کی اڈیٹری قبول کرلیں۔ حقیقتاً راجہ صاحب نے ہندوستان پر یہ ایک ایسا احسان کیا تھا جو اسے کبھی نہ بھولنا چاہیے۔ پنڈت مدن موہن باوجود ایک نوعمر شخص ہونے کے اس اہم کام کے لیے مستعد ہوگئے اور نہایت سنجیدگی اعتدال پسندی اور سلیقہ مندی سے اپنے فرائض کو انجام دیتے رہے۔ راجہ صاحب قابل تہنیت ہیں کہ انہوں نے ایک نوجوان کو جسکا ہندوستان باوجود ناواقفیت کے ارزومند تھا ملک کی خدمت کے لیے تیار کیا۔ ورنہ وہ اپنی زندگی کی ساعتیں جواب نہایت کارآمد ہیں ایک صوبہ کے محکمہ تعلیم میں ختم کردیتا جو یقیناً ملک کے لیے اسقدر مفید نہیں ہوتیں۔ پنڈت جی نے ڈیڑھ سال تک اتنی کامیابی سے اڈیٹری کی کہ لوکل گورنمنٹ اس سے اسقدر متاثر ہوئی کہ سالانہ رپورٹ میں انکی بہت تعریف کی گئی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد پنڈت مدن موہن نے غور کرکے یہ محسوس کیا کہ ایک اڈیٹر کی بہ نسبت ایک وکیل قومی و ملکی خدمات اچھی طرح ادا کرسکتا ہے۔ گو کہ ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ اڈیٹر کسی طرح وکیل سے کم خدمت ادا کرسکتا ہے لیکن مالوی جی کا رجحان بہ نسبت اڈیٹری کے وکالت کی طرف زیادہ تھا۔ اور ان کے رجحان کی ایک بڑی وجہ انکے چند محبوب دوستوں کے مجبور کرنے سے متعلق تھی۔ راجہ رامپال سنگھ نے انکے ارادہ میں کوئی مخالفت نہ کی اور انکو موقع دیا کہ وہ جس کام کو اپنے لیے موزوں سمجھیں اسے اختیار کریں۔ انہوں نے نہ صرف اتنا ایثار کیا کہ ایک قابل اڈیٹر کو اپنے سے جدا کیا بلکہ وکالت کی تعلیم کے لیے انکو جسقدر روپیہ کی ضرورت تھی وہ بھی مہیا کردیا۔

۱۸۹۱ء میں پنڈت جی الہ آباد ہائی کورٹ کے پلیڈرشپ کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور ۹۲ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرکے ہائی کورٹ میں داخل ہوگئے۔ اور اپنی دماغی قابلیت سے اس میں معقول کامیابی حاصل کی۔

اس زمانہ میں پنڈت اجودھیا ناتھ جیسے محب وطن اور ذی اقتدار بزرگ سے مالوی جی کی ملاقات ہوئی اور بشمبر ناتھ اور اے۔ این۔ کا باڈے جیسے ملک و وطن کے جاں نثار انہیں خوش قسمتی سے ملگئے تھے۔ اس اتحاد اربعہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ انہوں نے ۱۸۸۴ء میں ان لوگوں کی اعانت سے ہندو سماج قائم کیا۔ اسکا مقصد ہندوؤں کی سوشل اور پولیٹیکل حالات کو درست کرنا اور انکی ہر طرح اعانت کرنا تھا انہوں نے یہ محسوس کرکے اس انجمن کی بنا کی کہ ہندوؤں کی مختلف ذاتیں باہم اسقدر اجتناب اور نفرت سے زندگی بسر کرتی ہیں کہ اس سے تمدن اور معاشرت کو نقصان پہنچتا ہے اور ایک حد تک سیاسی اغراض بھی اس کے اثر سے محفوظ نہیں رہتیں ایسی حالت میں ضرورت تھی کہ اگر تمام فرقوں کی بیخ و بنیاد کو قطع کرکے اصل ہندو مذہب کی تعلیم دیکر ہندوؤں کو انکے مذہب کے حقیقی سنٹر پر نہیں لایا جاسکتا تو کم سے کم انہیں آپس میں متحد ضرور کر دیا جائے چنانچہ اس کام کو انجمن نے اپنی پوری قوت سے اس کام کو انجام دیا۔ دوسری یہ بات کی کہ غیر زبان میں تعلیم دینے سے تکمیل نہیں ہوتی اور دماغ کو زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے لہذا ہندوؤں کو دیسی زبان میں تعلیم دیجائے۔ مالوی جی نے بالکل ہندوؤں کی ترقی کے لیے اپنے کو وقف کر دیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ آج انکی سب عزت کرتے ہیں اور وہ نہ صرف ہندوؤں کی نظروں میں معزز ہیں بلکہ ہمارے لیے بھی ایک قابل تقلید و پیروی بزرگ ہیں۔

ہندو سماج کی سب سے پہلی کانفرنس ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس سے چند ماہ قبل منعقد ہوئی تھی۔ ہندو سماج کے کاموں کے ساتھ ہی ساتھ وہ میونسپل معاملات میں بھی دلچسپی لیتے رہے۔ اور یہ دلچسپی اسوقت تک قائم رہی جبتک کہ وہ وائس چیرمین رہے۔ حقیقتاً ضرورت اس بات کی تھی کہ پنڈت

مدن موہن جیسے لایق آدمی قانونی کونسل میں ضرور شریک ہوں لہذا وہ اپنی زبردست خدمات کے ذریعہ اس میں داخل ہوگئے۔

سنہ ۱۹۰۲ میں وہ لوکل قانونی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور انہوں نے اس خدمت کو اس آزادی کے ساتھ انجام دیا جیسی کہ یک غیر سرکاری ممبر کے لئے ضروری ہے انہوں نے کونسل کی ممبری کسی خطاب کی آرزو میں نہیں کی اور نہ وہ ضمیر فروشی کرکے صاحب ..... کی نظروں میں ذلیل ترین وقعت حاصل کرنیکے آرزومند تھے وہ صرف ملک کو وہ فائدہ پہنچانا چاہتے تھے جو ایک ضمیر کے مطابق کام کرنیوالا کونسل کا ممبر پہنچا سکتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر اور کانشنس کی مطابقت اور پیروی پر اسقدر دلیر تھے کہ نہ انہیں بڑے صاحب سے اختلاف کرنے میں کوئی باک تھا اور نہ چھوٹے صاحب سے کوئی ڈر۔

سنہ ۱۹۰۳ میں جبکہ کونسل میں بندیل کھنڈ کی اراضی کی تقسیم کے متعلق مسودہ پیش ہوا اسوقت پنڈت مالوی جی نے جس دلیری سے اس کی مخالفت کی کہ انکی رائے سے سر انگلینڈ کالوین سر چارلیس کراسویٹ آنریبل مسٹر امپی، آنریبل مسٹر گیڈل جیسی ذی اقتدار اور قوی شخصیتوں کو اتفاق کرنا پڑا۔ انکی رائے تھی کہ بندیل کھنڈ کے باشندوں کا افلاس اور انکی تنگدستی بیحد افسوسناک ہے لیکن اس کی وجہ وہ نہیں جو وہاں کے حکام بیان کرتے ہیں۔

ہندوستانی کونسل کی اصلاحی اسکیم کے ماتحت انکا دوبارہ منتخب کیا جانا اسبات کی کافی دلیل ہے کہ انکی گذشتہ خدمات سے پبلک خوش ہے اور انکے کاموں کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اور حقیقت میں وہ اس کے مستحق بھی تھے جس شخص نے پرانی کونسلوں کی اصلاح پر پرزور کوششیں کیں ہوں اور اس کے قابل اعتراض نظم کو ایک حد تک روبہ اصلاح کیا ہو کیا وہ اس بات کا مستحق تھا کہ اسے کونسل کا

ممبر انتخاب نہ کیا جائے۔

سنہ ۱۸۶۱ء کے قانون کے ماتحت جو کونسلیں قائم ہوئی تھیں انکے سب کے سب ممبر سرکاری تھے اور وہ ہرگز اس قابل نہ تھے کہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی بہبودی کے لیے صاحب ․․․ کی ذرہ بھر مخالفت کریں اور اپنی اس عزت میں ذرا بھی فرق پیدا ہونے دیں جو انہیں ڈالی اور خوشامد سے حاصل ہوئی ہے۔ خان صاحب اور رائے صاحب کبھی ملک کے دردمند نہیں ہو سکتے۔ ہم انپر یہ الزام نہیں لگاتے کہ وہ ضمیر فروشی کرتے ہیں۔ بلکہ افسوس تو اس بات کا ہے کہ انکا ضمیر بھی وہ ہے جس میں خطاب کی حفاظت ہو سکے اعزازی کرسی کا استحقاق بھی قائم ہے اور صاحب اپنا راست و چپ بھی بنائے رکھیں۔ حقیقت میں غیر سرکاری ممبروں ہی سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ کونسل میں وہ کہیں جو ہندوستان کہتا ہے اور وہ آواز بلند کریں جو ۳۱ کروڑ ہندوستانیوں کی ہے ہندوستان کو ممنون ہونا چاہیے ان لوگوں کا جنہوں نے اپنی پوری کوشش اس کام میں صرف کر دی کہ کونسل میں غیر سرکاری ممبر ضرور شریک ہوں تاکہ پبلک فیلنگ کی ترجمانی ہو سکے۔ اور انہیں لوگوں میں پنڈت مدن موہن مالویہ بھی قابل صد مشکوری ہیں۔

سنہ ۱۸۸۶ء میں کانگریس کے دوسرے اجلاس میں مالوی جی نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ۔

"انگریزی حکومت کے سامنے ان اصلاحات کی ضرورت، انکا ملک کے لیے"
"فائدہ مند ہونا، اور وقت کے لحاظ سے انکی اہمیت ظاہر کرنا میرے نزدیک"
"غیر ضروری اور بے فائدہ ہے۔ ظاہر ہے کہ انگریز نہ مطلق العنان بادشاہ ہیں"
"اور نہ خود غرض حاکم کہ محض اپنے مفاد کے لیے رعایا کے حقوق کو پامال کریں"
"اور اس کی حالت سے بے پرواہ ہیں۔ وہ قوم جس کے آبا و اجداد نے اپنا"

"خون بہا کر اور اپنی ہستیوں کی قربانیاں کر کے اپنے قدرتی حقوق حاصل کیے"
"ہیں کیا اس بات کی محتاج ہے کہ انہیں اصلاح کی ضرورت اور رعایا کے قدرتی"
"حقوق دینے کے فرض سے آگاہ کیا جائے:-
"کیا وہ انگریز انگریز کہلانے کا مستحق ہے جو جمہوری اصول کے مخالف ہو۔ مجھے"
"اُن انگریزوں کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے جو مطلق العنانی حاصل کرنے اور"
"جمہوریت کو پامال کرنیکے لیے اپنی قوت صرف کرتے ہیں حالانکہ اس راہ میں"
"قوت صرف کرنا ایک طرح سے قوت کا ناجائز استعمال ہے۔ اصول جمہوریت"
"ایک انگریز کی زندگی کے لیے ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا کہ اسکی زبان اور"
"اسکا لٹریچر۔ کیا کوئی مجھے یہ کہہ سکتا ہے کہ انگریزی قوم ہمکو ہمارے ملکی و"
"قدرتی حقوق دینے سے انکار کرے گی جنھیں حاصل کرنیکے طریقے اسی نے"
"ہمکو سکھلائے ہیں اور اسی کی تاریخ پڑھکر ہمکو ان وسائل پر آگاہی ہوئی ہے"
"ایک انگریزی سیاسی انجیل کی یہ سب سے پہلی آیت ہے کہ کوئی ٹیکس"
"اسوقت تک حکومت کو حاصل کرنیکا حق نہیں جب تک کہ وہ اس کی ضروریات"
"کو پورا نہ کرے اسلیے کہ ٹیکس خدمت کا ایک معاوضہ ہے۔ اس آیت پر ایمان"
"رکھتے ہوئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی سیاسی انجیل کے خلاف ہم سے ٹیکس"
"تو پورا پورا حاصل کریں اور پھر ہمیں بھیڑوں کے گلہ کی طرح رکھیں" اصلاحات کا"
"علانیہ مطالبہ مسٹر مالویہ نے اپنی اس پُر زور تقریر میں کیا جو ۱۸۹۳ء کے اجلاس کانگریس"
میں ہوئی تھی :-
"مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ ہمکو اپنے نمایندے قانونی کونسل"
"میں موجود رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اسلیے کہ ہمارے حکام خواہ کسی قدر نیک"
"نیت ہوں اور ہماری حکومت خواہ کسی قدر رحم دل ہو لیکن وہ بہرحال"

"غیر ملکی ہے۔"

"حضرات! روس کے سوا تمام یورپ کے ملکوں نے یہ اعلان کر دیا ہے"
"کہ سب سے بہتر طریقہ حکومت وہ ہے۔ جو خاص خاص اشخاص کے ہاتھ میں نہ ہو"
"بلکہ وہ پبلک نمائندوں کے مشورہ پر ہو۔ اسلیے کہ وہ حکومت جس میں رعایا کے"
"نمائندوں کی آواز کا اثر نہ ہو مہذب نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ طرز حکومت یورپ"
"کے لیے ضروری ہے جہاں حاکم و محکوم راعی و رعایا ایک قوم اور ایک"
"مذہب سے تعلق رکھتے ہیں تو اس کی ہندوستان میں بہت زیادہ ضرورت"
"ہے جہاں حاکم و محکوم ہم مذہب ہیں نہ ہم قوم۔ ہم تو اپنا وہ حق مانگتے"
"ہیں جس کی تائید نہ صرف یورپ بلکہ امریکہ آسٹریلیا اور کل مہذب قومیں"
"کرتی ہیں۔ اور جسے وہ لازمہ تمدن قرار دیتی ہیں۔ حضرات! جب یہ حالت"
"ہے تو میرا خیال ہے کہ ہمیں اس کے لیے متفقہ آواز بلند کرنی چاہیئے۔"

"وہ اصلاحات جو ہم مانگتے ہیں ہمکو بلا تاخیر و تامل ملجانی چاہئیں:"

۱۸۸۹ء کے اجلاس کانگریس میں اصلاحی اسکیم پر بحث کرتے ہوئے مسئلہ انتخاب کے متعلق انھوں نے مندرجہ ذیل تقریر کی:۔

"قانونی کونسل کیسی زبردست عدالت ہے کہ جسکے سامنے اہم سے اہم معاملات"
"پیش کیے جاتے ہیں جنکا نہ صرف ہمپر اثر پڑتا ہے بلکہ ہماری آیندہ نسلیں بھی"
"اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اور انصاف کا یہی مقتضا ہے کہ"
"کونسل جب اپنا آخری فیصلہ صادر کرے اسوقت اسکا فرض ہے کہ وہ ہمیں"
"اس بات کا موقعہ دے کہ ہم اپنے منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعہ اپنے"
"خیالات کا اظہار کر سکیں۔"

"حضرات! حضور مجسٹی کی رعایا کے ایک مجرم سے مجرم فرد کو بھی یہ حق حاصل ہے"

"کہ وہ اپنا ایک وکیل بنا کر اس آخری فیصلہ سے بچاؤ کر سکے جو اس کی قسمت"
"کا فیصلہ ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ انکی عام رعایا کی قسمتوں کا فیصلہ بغیر اس کے"
"آزادی کے کیا جائے اور اسے اتنا اختیار نہ ہو کہ وہ اپنی رائے ظاہر کر سکے"
"مجھے امید ہے کہ بہت عرصہ تک ہم اپنے اس حق سے محروم نہ رہینگے جو ہمارا"
"قدرتی حق ہے۔ جب کوئی مقدمہ جیوری کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو"
"جج ملزم سے دریافت کرتا ہے کہ تمھیں جیوری سے کسی قسم کی شکایت تو نہیں"
"اور اگر اسے کسی قسم کی شکایت ہوتی ہے تو جیوری علحدہ کر دیا جاتا ہے لیکن یہاں"
"تو یہ بھی نہیں دریافت کیا جاتا کہ ہمارے سرکاری ممبروں کے انتخاب سے تمھیں"
"اتفاق بھی ہے یا نہیں"

۱۸۹۸ء کے اجلاس کانگریس میں انگریزی حکومت کے متعلق مسٹر آنند چارلو نے کہا۔
"ہم انگریزی حکومت سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس ملک پر انصاف سے"
"حکومت کرے اور ان شریف اور بلند اصولوں پر عمل کریں جن پر انھیں فخر ہے"
"اور جنکی وجہ سے انکا پوزیشن دنیا میں ایک بہت بلند درجہ پر پہنچ گیا ہے۔"
"صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کی بدولت برٹش گورنمنٹ ہندوستان میں"
"باعزت ہو سکتی ہے۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہوتے وقت ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے تمام ہندوستانیوں کو مژدہ سنایا گیا تھا کہ انکے مذہب میں کوئی تعرض نہ کیا جائے گا انہیں انصاف سے حکومت کی جائیگی اور ہر شخص آزادی و عافیت سے زندگی بسر کریگا ایک حیثیت سے یہ اعلان ہندوستانیوں کو ہر معاملہ میں انصاف طلبی کی پوری اجازت دیتا ہے۔ اور یہ ہندوستانی قومیت کا سنگ بنیاد ہے۔ اور وہ اس معاملہ میں انکی مدد کرتا ہے کہ وہ اپنے مطالبات نہایت آزادی سے پیش کریں۔ اس اعلان تمام احکام کی تردید کر سکیں جو انکی قومیت

کو نقصان پہنچاتے ہیں چنانچہ اس اعلان شاہی کے متعلق مسٹر مالویا نے ۱۹۰۳ء
کے اجلاس کانگریس میں کہا

"یہ اعلان ہمارے کل مطالبات کا بنیادی پتھر ہے۔ میں اس سرکاری افسر"
"کی غلط بیانی کی پوری قوت سے تردید کرنیکے لیے تیار ہوں جس نے کہا"
"تھا کہ یہ اعلان سچے دل سے نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ محض تسخیر قلوب کی پالیسی"
"پر مبنی تھا"

۱۹۰۳ء کی کانگریس میٹنگ میں انھوں نے کہا تھا کہ

"اس ملک پر ملکہ وکٹوریہ انجہانی نے جن اصولوں کو بیان کیا تھا انھیں"
"ہر قوم عزت سے دیکھیگی۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی قوم اپنی محکوم قوم کے سامنے"
"اس سے بہتر اصول حکومت نہیں پیش کر سکتی۔ ہم حکومت سے کسی بات"
"کے خواہش مند نہیں اور ہمارے مطالبات اسکے سوا اور کچھ نہیں کہ خدارا"
"جو اعلان ملکہ وکٹوریہ نے ۱۸۵۸ء میں کیا تھا اس کے اصولوں کے مطابق"
"ہم پر حکومت کرو اور انکے پابند رہو"

پنڈت مالوی کا یہ مطالبہ حقیقتاً ہمارے تمام مطالبات کا مجموعہ ہے۔ اگر ہمارے حکمران حضرات اس اعلان کو پوری توجہ سے ایک دفعہ پھر اٹھا کر دیکھیں اور اس پر عمل کرنے لگیں تو واللہ پھر ہم اپنے کچھ نہ مانگیں گے اور نہ اپنے مطالبات کو زیادہ وسیع کرینگے۔

انگریزی حکومت کے اصولوں کا خاکہ کھینچتے ہوئے مسٹر مالویا نے کہا

"ہماری دعا ہے کہ ہندوستان پر حکومت کرنیکے لیے انگریز وہ اصول"
"استعمال کریں جنسے ہم یہ نہ محسوس کریں کہ ہم کسی غیر ملکی حکومت کے ماتحت"
"ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری خدمتگذاریوں کا اعتراف نہیں کیا جاتا ہم کو"
"ایک نیچے درجہ کی قوم سمجھا جاتا ہے۔ اور حاکم و محکوم میں گورے اور کالے"

"سے امتیاز پیدا کیا جاتا ہے۔ اور یہ ان اصولوں کی خلاف ورزی ہے جن پر"
"سلطنت برطانیہ قائم ہوئی ہے اور حکومت قائم کرتے وقت جنکا اس نے"
"اعلان کیا تھا ہر ایک نو آبادی جو دولت برطانیہ کے ماتحت ہے اسقدر حقوق"
"کی مالک ہے جنکے ہم طالب ہیں۔ انگلستان اور دوسرے ملکوں میں جن پر"
"انگلستان کا مستقل اثر ہو گیا ہے انکی آبادی کو کامل حق ہے کہ وہ حکومت کے"
"کاموں میں دخل دیں اور اپنی خواہش کے مطابق تمام سے حکومت کرائیں"
"ہم جانتے ہیں کہ اور بہت سی یورپین اقوام نے انگلستان کے زیر سایہ رکر"
"اس کی آزاد خیالی اور نصفت شعاری سے فائدہ اٹھایا ہے آزادی اور انصاف"
"جمہوریت اور سیلف گورننگ کے خیالات انگلستان سے نکر اور ملکوں میں"
"پھیلے۔ جس ملک نے انکو تسلیم کیا۔ اور جس حکومت نے انکو پیش نظر رکھا اسنے"
"ترقی کی اور تمدن و تہذیب خوشحالی و تعلیم کی حصہ دار ہو گئی اُنکے پھیلانے"
"کا ادعا دولت برطانیہ کو ہے۔"

ایک اور عظیم الشان اور اہم مسئلہ جس کے مطالعہ کرنے میں پنڈت مالوی نے اپنی عمر کا بڑا حصہ صرف کیا ہے وہ ہندوستان کا افلاس ہے۔ ہندوستان جو اپنی زرخیزی اور جائے وقوع کے لحاظ سے ہمیشہ سے دنیا کے بادشاہوں کے لیے رشک کا باعث بنا رہا ہے جو کسی زمانہ میں نہ صرف اپنی ضروریات بلکہ ایشیا سے لیکر یورپ تک کی ضروریات پوری کر سکتا تھا آج اسقدر محتاج ہو گیا کہ یورپ سے آمد و رفت کا سلسلہ بند ہو جائے (جیسا کہ اس جنگ عظیم میں دیکھا گیا ہے) تو اس کے پاس تن پوشی کے لیے کپڑا تک نہیں رہتا اُس کے جو افسوسناک اور دل آزار اسباب ہیں انکے سمجھنے پر نہ صرف پنڈت مالوی نے بلکہ مصیبت زدہ ہندوستان کے ہر دردمند اور بہی خواہ نے اپنی عمریں وقف کر دی ہیں لیکن اس وقت ہمارا موضوع صرف پنڈت مالوی کے

خیالات سے بحث کرتا ہے۔ جو اس مسئلہ پر نہایت قیمتی ہیں۔ ۱۸۹۳ء کی کانگریس میٹنگ میں انہوں نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہا۔

"جو لوگ ہم پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اور جنہیں دعویٰ ہے کہ وہ ہمیں خوشحالی اور"
"ترقی یافتہ بنانے کے لیے یہاں آئے ہیں تو وہ ایک مرتبہ یہاں آئیں اور اس"
"ملک کو اپنے اس ادعائی نظر سے دیکھیں اور معلوم کریں کہ ہم کس قدر"
"خوشحال ہیں اور ہمنے کسقدر ترقی کی۔ وہ دیکھیں گے کہ فلاکت و افلاس"
"کی وبا میں ہم لوگ گرفتار ہیں! کیا یہ ترقی ہے کہ پہلے ہملوگ اپنے ملک کا"
"بنا ہوا کپڑا پہنتے تھے ہماری مصنوعات انگلستان تک جاتی تھیں اور ہم"
"میں کا ہر شخص فارغ البالی و خوش حالی سے زندگی بسر کرتا تھا! لیکن آج ہم ہر بات"
"میں غیر ممالک کے محتاج ہیں۔ جب ایک شخص اس مسئلہ پر غائر نگاہ ڈالتا"
"ہے تو وہ اچھی طرح محسوس کر لیتا ہے کہ یہ سب باتیں غدر تک بھی قائم تھیں"
"اور اس کے بعد ہم میں اتنی قابلیت بھی نہیں رہی کہ ہم اپنی ضروریات حوائج"
"خود مہیا کریں۔ یہاں جسقدر اصحاب موجود ہیں وہ سب انگریزی کپڑے"
"پہنے ہوئے ہیں اور جو کچھ بھی انکے پاس ہے وہ سب باہر کا ہے۔ اب"
"لے دے کر ہمارے پاس صرف زراعت رہگئی ہے اور نہایت ذلیل و"
"حقیر تجارتیں جن میں نہایت قلیل فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ملازمت اور تجارت"
"کے معاملہ میں ہم لوگ ۱/۲۰ حصہ فائدہ کے مستحق ہیں پس یہ کیسے ہو سکتا ہے"
"کہ ہم لوگ خوشحال رہیں اور اسپر کس طرح تعجب کیا جا سکتا ہے کہ یہ ملک"
"مفلوک و مفلس کیوں ہے!"

اسی طرح ۱۹۰۰ء کی کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا

"باوجود ان تمام باتوں کے جن کے باعث ہم انگریزوں کا شکریہ ادا کرنے پر"

"مجبور ہیں اور باوجود ان تمام احسانات کے جنکے بارے ہم سرگراں ہیں ا"
"ایک بات نہایت افسوسناک اور شرمناک ہے، اور اسکی ہمیشہ ہمیں شکایت"
"رہیگی یعنی ہماری غربت و فلاکت ایسی بلا ہے جسکے باعث ہماری ترقی کی شاہراہ"
"بالکل تنگ ہوگئی ہے اور ہم کسی طرح پنپنے نہیں پاتے۔ عوام کے درمیان رہکر"
"اور اپنے روزانہ کے مشاہدات دیکھکر ہم اچھی طرح معلوم کر لیتے ہیں کہ عوام"
"کی حالت بالکل ردی اور قابل رحم ہے اور موجودہ طرز حکومت بالکل اصلاح"
"طلب ہے"

"حضرات! اگر پچھلے پندرہ سال کے وہ تمام ریزولیوشن بنظر غور دیکھیں"
"جو اس مسئلہ پر کانگریس میں منظور کئے گئے تھے تو آپ اچھی طرح معلوم کرینگے"
"کہ ہمنے کسقدر استقلال اور ادب سے حکومت کی توجہ بار بار اپنے مصیبت"
"زدہ اور قابل رحم حالت پر منعطف کرائی۔ مگر کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوا۔ ہم اس سے"
"بحث کرنا فضول سمجھتے ہیں کہ برٹش گورنمنٹ کی سلطنت سے پہلے ہماری"
"کیا حالت تھی اور نہ ہمیں یہ بیان کرنے کی ضرورت ہے کہ ہندوستانی"
"تاریخ میں کبھی پہلے بھی ہم اس حالت میں تھے؟ بلکہ غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ"
"کیا ہمیں اس حکومت کے ماتحت رہکر اور اس سول سروس کے محکوم بنکر"
"بھی اس حالت میں رہنا چاہیے جو دنیا میں سب سے قابل طبقہ مانا جاتا ہے؟"

یہ تمام خیالات اس ملک کی نظروں میں جسقدر وسیع اور قابل عزت ہونے چاہئیں وہ ظاہر ہے۔ کیا کوئی شخص اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان کا سب سے بڑا مالدار شخص امریکہ اور یورپ کے ایک معمولی سے تاجر کی حیثیت رکھتا ہے؟ باوجودیکہ ترقی کے جو ذرائع و وسائل ہندوستان کو نصیب ہیں خوشحالی و دولتمندی کے جن آلات کا ہندوستان مالک ہے! اور دولت کے جن پوشیدہ اور محنت طلب خزانوں پر

ہندوستان قابض ہے وہ دنیا کی تمام دولتمند اور ترقی یافتہ قوموں میں سے ایک کو بھی نصیب نہیں۔ اگر کوئی شخص میرے اس دعوے سے انکار کرسکتا ہے تو یقیناً اس میں یہ بھی قدرت ہے کہ وہ سورج کی روشنی اور پانی کی مائیعت سے انکار کردے کوئلہ جو موجودہ تمدن کے لئے ضروری اور لازمی ہے ہندوستان میں کافی مقدار میں موجود ہے اور یقیناً اگر کوشش کی جائے تو بندھیاچل کی گھاٹیوں اور دکن کی وادیوں میں سے بافراط نکل سکتا ہے۔ روئی جو کپڑے کی اصل ہے اور جو تجارت میں ایک بڑا حصہ لیتی ہے ہندوستان میں کئی لاکھ ٹن پیدا ہوتی ہے مگر ہندوستان سے اب یہ قابلیت چھن گئی ہے کہ وہ اپنی روئی کو خود کپڑے کی صورت میں منتقل کرے اور اسے مجبوراً غیروں کے ہاتھ نہایت ارزاں فروخت کرکے اسے نہایت گراں خریدنا پڑتا ہے۔ لوہا جو کوئلے کے بعد تمدن کے لوازم میں دوسرے درجہ پر ہے ہندوستان میں بکثرت ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ بھی ہم سے چھن جاتا ہے اسکے کمانے اور ڈھالنے کی قابلیت ہم میں نہیں رہی۔ اور ہمیں بہ مجبوری منگلہم کو دیدینا پڑتا ہے اور وہاں سے پھر ریلوں وغیرہ کے پہیے ڈھل کر یہاں آتے ہیں اور ہمارے ہی مال کو دوسرے کوڑیوں کے دام لیکر اور اپنی محنت صرف کرکے اشرفیوں کے دام ہمیں دیدیتے ہیں۔ سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے اور جس سے یہ تمام ضروریات تمدن مہیا کی جاسکتی ہیں وہ محنت وجفاکشی ہے۔ اور اسمیں بھی اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ہندوستانی اہل یورپ سے بڑھے ہوئے ہیں۔ جو محنت ایک ہندوستانی دھوبی کڑاکڑاتے جاڑے میں کپڑے دھونے کے لیے صرف کرتا ہے جو محنت ایک ٹوکری ڈھونے والا مزدور بار بار سر پر پتھر وں اور مٹی کی ٹوکریاں لیکر پہاڑ پر چڑھنے اور اترنے میں صرف کرتا ہے اگر ایک یورپین اسکا دسواں حصہ بھی کرے تو ہم اپنا شکوہ غربت وافلاس چھوڑنے پر طیار ہیں۔

پس جب ہمارے پاس تمام وسائل ترقی بھی افراط سے موجود ہیں اور ہم جفا کشی میں بھی اہل یورپ سے زیادہ ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ترقی نہیں کر سکتے؟ اسکی جو علت حقیقی ہے وہ بہت مجمل طور پر یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ ہماری محنتیں اور ہماری دماغی قوتیں ایک غلط راستہ پر صرف ہو رہی ہیں۔ ہماری جو پرانی تعلیم تھی وہ ہمیں ان تمام اشیا کے استعمال سکھاتی تھی جو قدرت نے ہمیں ہمارے ملک میں مہیا کر دی ہیں لیکن ہمیں اس تعلیم سے منحرف کر کے نئی تعلیم دی گئی۔ ہم نئی تعلیم کے مفید ہونے کا کلیۃً اعتراف کرتے ہیں۔ اور ہم کبھی اس جدید تعلیم کو ناقص نہیں ٹھیراتے جو یورپ نے اختیار کی ہے لیکن ہمیں شکایت تو اس بات کی ہے کہ ہمیں اس اصلی جوہر تعلیم کی تو ہوا بھی نہیں دی گئی جس کی بدولت آج یورپ ہمارے ملک کی پیداوار کو ضروریات تمدن کی صورت میں منتقل کر کے ہمیں دیتا ہے اور ہم خود اپنی چیزوں کو اپنے استعمال کے قابل بنانے سے عاجز ہیں۔ پرانی تعلیم کا یہ اثر تھا کہ ہماری مصنوعات سے آج ترقی یافتہ یورپ حیران و متعجب ہے۔ ڈھاکہ کی چھینٹ اور دکن کا مشروع ہندوستان کی پرانی صنعتوں کی یادگاریں ہیں۔ خصوصاً فن معماری میں ہندوستان کی جو ترقی تھی اور ہندوستان کی جو پرانی عمارتیں ابتک موجود ہیں ان کی نظیر باوجود اسقدر ترقی کے اہل یورپ نہ دے سکے۔ لیکن آج اسی ہندوستان کے باشندے اور انہیں اسلاف کے اخلاف جدید تعلیم کے ناقص طور پر مسلط ہو جانے کے باعث بالکل جاہل اور غیروں کے محتاج بنگئے ہیں اور دنیا کی اسقدر بڑی اس قدر جفا کش اور پر دماغ آبادی محض ذاتی مفاد کی بدولت جاہل ہے اور کوئی کام نہیں کر سکتی۔ کیا یہ ہمدردان علم اور بہی خواہان بنی نوع انسانی کے لیے افسوسناک اور شرمناک امر نہیں۔؟

اس مسئلہ پر مسٹر مالویا کا خیال ہے جو انہوں نے ۱۹۰۵ء کی کانگریس میں ظاہر کیا تھا۔
"ہم کہتے ہیں کہ حکومت کو دیسی صنعت کو ترقی دینی چاہیے ایک وہ وقت تھا"

"کہ اسی شہر لکھنؤ میں نہایت کثرت سے دیسی صنعت و حرفت کے کارخانے"
"موجود تھے اور ہر معمولی مزدور بھی اسقدر معقول آمدنی کا مالک تھا جس سے"
"وہ نہایت آرام اور خوشحالی سے بسر کرتا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے اگر آج ہم اسی شہر"
"لکھنؤ میں آکر یہاں کے باشندوں سے کیفیت حال دریافت کرتے ہیں تو"
"معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی اور غیر ملکی کارخانوں نے ہندوستانی صنعت"
"کو بالکل برباد کر دیا ہے۔"

"حضرات! ہم کوئی الزام حکومت پر نہیں لگاتے بلکہ ہم تو اس سے درخواست"
"کرتے ہیں کہ وہ عام طور پر ہندوستان میں صنعت و حرفت کی تعلیم پھیلائے"
"اور ہندوستان کو اپنی ضروریات خود پوری کرنا سکھلائے تاکہ کروڑہا روپیہ"
"جو یہاں سے باہر چلا جاتا ہے وہ یہیں رہے۔ ہم یہ اچھی طرح محسوس کرتے ہیں"
"کہ اگر حکومت ہمارے تمام ان مطالبات کو پورا کر دے جو سرکاری ملازمت"
"کے متعلق ہیں تب بھی ہم وہ ترقی نہیں کر سکتے جو ہم اپنی صنعت و حرفت کے"
"جاری ہو جانے سے کر سکیں گے۔ ہمارا اگر کوئی سب سے بڑا مطالبہ ہو سکتا ہے"
"تو وہ یہی ہونا چاہیے کہ ہمیں اپنی ضروریات خود پوری کرنے کی قابلیت"
"بخشی جائے۔ انگلستان میں جسقدر اس مسئلہ پر غور کیا جاتا ہے اور جرمنی و"
"جاپان میں جتنا وقت اس خیال کو عملی صورت میں لانے کے لیے صرف کیا"
"جاتا ہے اگر اس کا ایک عشر عشیر بھی ہندوستان کا سول سروس طبقہ"
"یہاں کی رعایا کے لیے صرف کرے تو ہندوستان موجودہ حالت سے"
"بہت بہتر حالت میں پہنچ سکتا ہے۔"

اسی طرح موجودہ گئی گذری حالت میں بھی جو صنعت یہاں ہوتی ہے اس کی نمائش یعنی
صناعوں کی حوصلہ افزائی کے پنڈت مالوی بہت مؤید ہیں چنانچہ اس کے متعلق آپکی

راے یہ ہے۔

"نمائش سے ہم یہ معلوم کر سکیں گے کہ ہمارے پاس خام اشیا کیا کیا موجود"
"ہیں کون کونسی اشیا ہم باہر بھیجتے ہیں اور ہم کس طرح اپنی تجارت کو نئی مشینوں"
"سے فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ اور نئے اصول سے تجارت کو کس طرح ترقی دیجا سکتی"
"ہے۔ نمائش ہمیں بتلائے گی کہ تل اور چکیاں وغیرہ یورپ میں کس طرح چلائی"
"جاتی ہیں اور اس سے کس قسم کے فوائد اور سہولتیں حاصل ہوتی ہیں اور ہندوستان"
"کے مختلف صوبوں میں کس کس قسم کے آلات استعمال ہوتے ہیں اور کون"
"کونسی کلیں رائج ہو گئی ہیں بضلع کی نمائش گاہوں کا بھی یہی مقصود ہو کہ ترقی"
"یافتہ کلوں کا استعمال عوام کو بتایا جائے۔ گھر میں بیٹھکر وہ کتابوں سے انکی"
"حالت معلوم کر سکتے ہیں لیکن جب تک عملی طور پر انکا استعمال انکو نہ بتایا"
"جائیگا اسوقت تک ان کلوں کا محض علم کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔ یورپ"
"اور امریکہ میں کاشتکار زمین کے لیے ہوا تک سے کھاد حاصل کر لیتے ہیں"
"مگر یہاں فضلات کا بھی مفید اور کامل طریقہ سے استعمال نہیں آتا۔ ایک"
"باقاعدہ سائنٹیفک ایگزیبیشن (علمی نمائش) کے ذریعہ یہ تمام باتیں ہندوستانیوں"
"کو سکھائی جا سکتی ہیں۔ نمائش عملی طور پر عوام کو یہ بتائے گی کہ وہ کس طرح بغیر"
"کسی سخت مشقت کے چیزیں اچھی اور کارآمد بنا سکتے ہیں۔ اور اس کے لیے"
"ضرورت ہے موجودہ مکانزم (فن آلات) کے اچھے ماہروں کی جو خود اس"
"میں کامل مہارت رکھتے ہوں۔"

اسی طرح انکے بیش بہا خیالات مزارعوں کی مشکلات اور ہندوستان کے دائمی اور عالمگیر قحط کے متعلق حسب ذیل ہیں۔

"ہندوستان کی رعایا اکثر زراعت پیشہ ہے۔ لیکن جو اس کی مشکلات ہیں انکی"

"وجہ سے یہ ملک ہمیشہ قحط زدہ رہتا ہے۔ ان تمام مشکلات میں سے ایک"
"بڑی مشکل یہ ہے جیسا کہ میرے لایق دوست سر یندرناتھ بنرجی نے بھی"
"کہا کہ بنگال جسکو مستقل بندوبست نصیب ہوا وہ قحط کی مصیبت سے بہ نسبت"
"اور صوبوں کے محفوظ ہے ہر اس تعلیم یافتہ کا جس نے اس مسئلہ پر غور کیا ہے،"
"یہ خیال ہے کہ لگان کے متعلق ایک میعاد مقرر کردینا ضروری ہے صرف ہم"
"لوگوں کا ہی یہ خیال نہیں بلکہ حکام کا ایک زبردست طبقہ بھی ہمارا اس خیال"
"میں موید ہے۔ میں یہاں ان اعلانوں کو بیان نہ کرونگا جو ملکہ معظمہ کے وزیر ہند"
"نے سنہ ۶۲ وسنہ ۹۲ وسنہ ۹۰ میں مستقل بندوبست کے متعلق"
"لکھا تھا۔"

حقیقتاً اگر بنظر غور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس جنگ کے زمانہ میں ہندوستان کو جسقدر مالی وزراعتی نقصانات ہوئے ہیں۔ اور غلہ کی گرانی کی وجہ سے ہندوستانیوں کی مصائب جسقدر سخت ناقابل برداشت ہوگئی ہیں وہاں اسے ایک بہت بڑا فائدہ بھی ہوا ہے اور میں کہوں گا کہ جنگ یورپ ایک حیثیت سے ہندوستان کے لئے رحمت الٰہی ثابت ہوئی ہے۔ غالباً کچھ لوگ میرے اس دعوے پر ہنسینگے اور تعجب کرینگے مگر میرے پاس اس ادعا کے کافی دلائل موجود ہیں۔ اس جنگ سے پہلے ہندوستان اپنی تمام ضروریات میں جسقدر یورپ کا محتاج تھا وہ ظاہر ہے جرمنی اور انگلینڈ کی مضبوط اور خوشنما مصنوعات کے آگے کوئی شخص سودیشی مال کی قدر ہی نہ کرتا تھا۔ ہر شخص یورپین مال کو خریدتا اور اپنے ملک کی ترقی کی شاہراہ کو پتھروں اور سنگین دیواروں سے مسدود کرتا تھا۔ لیکن جنگ کے زمانہ میں اور خصوصاً آخری ۲ سالوں میں ہندوستان کو مجبوراً دیسی مال خریدنا پڑا اور کچھ تو یورپین مال کی گرانی اور کچھ اس کی کمیابی کی وجہ سے ہندوستانی صنعت کو نسبتاً ترقی حاصل ہوئی۔ جنگ سے تھوڑے

ہی زمانہ قبل جرمن تاجروں نے ہندوستانی تجارت کو بالکل اپنی ملک کر لیا تھا خصوصاً موسیقی کے الات اور رنگ وغیرہ اشیا بالکل جرمنی سے آتے تھے اور انگلینڈ کو کوئی پوچھتا تک نہ تھا۔ اور صرف الات موسیقی ورنگ بلکہ دیگر اشیا بھی زیادہ تر جرمنی سے آتی تھیں۔ اور جب انگلینڈ کے مال تک پر جرمنی مصنوعات کو ترجیح دیجاتی تھی تو ہندوستان غریب کا تو حساب ہی کیا تھا۔ یہاں ہم ان اشیا کی تعداد بتلاتے ہیں جو جنگ سے ایک سال قبل جرمنی سے ہندوستان آئیں۔

سوتی کا کپڑا .. .. ایک کروڑ تیس لاکھ مارک

رنگ وغیرہ - - - - - .. .. ایک کروڑ چالیس لاکھ مارک

لوہے اور فولادی مستعملات - - .. .. ایک کروڑ نو لاکھ ستر ہزار مارک

ریل اور اس کے ہمجنس اشیا - - .. .. .. ۲ کروڑ مارک

اونی کپڑا .. .. ایک کروڑ بیس لاکھ

ان اعداد وشمار سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ جرمن کارخانہ داروں نے جس طرح ہندوستان کو لوٹا ہے اور اس کی صنعتی و مالی ترقی کے جسم نحیف کو جسقدر مجروح کیا وہ کس قدر افسوسناک اور دل آزار ہے۔ اس کی بڑی وجہ تو وہی ہے جسے میں پہلے بیان کر چکا ہوں یعنی ہماری تعلیمی خرابی اور دوسری وجہ بھی اسی کا ایک جزو ہے یعنی ہماری تعلیمی خرابی ہمیں اصل مسئلہ پر غور نہیں کرنے دیتی اور ہم خود چمکدار اور مضبوط مال دیکھکر اپنی نان جویں کو چھوڑ دیتے ہیں اور غیروں کے پلاؤ اور زردہ کو بے غیرتی سے کھانے لگتے ہیں۔ یہ بات ہمارے لیے ہی مضر نہیں بلکہ ہماری حکومت کے لیے بھی مضر ہے اسوجہ سے کہ جس طرح برطانیہ عظمی نے اپنی تجارتی ترقی کی وجہ سے ہندوستان کو اپنے زیر نگین کر لیا اسی طرح اگر کوئی اور قوم ہندوستان کی تجارت پر حاوی ہو جائے اور اس کی مالک بنجائے تو بہت ممکن ہے کہ یہی واقعہ اس کے بھی حسب حال ہو جائے

اس سے ہندوستان کو اور برطانیہ عظمیٰ کو جسقدر نقصان پہنچیگا وہ ظاہر ہے۔ برطانیہ عظمیٰ سے بہتر گورنمنٹ اقوام یورپ میں سے تو ہمیں ملنی مشکل ہے اور اسی طرح برطانیہ کو بھی ہندوستان جیسا زرخیز وہ وفادار ملک ملنا محال۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہندوستانی صنعت کو ترقی نہیں دیجاتی اور غیر اقوام کو موقع دیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان میں تجارت کریں۔ دراں حالیکہ برطانیہ عظمیٰ کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ ہندوستان پر تمام ممالک متمدنہ کی نگاہیں بہت طمع آلود پڑ رہی ہیں۔

پنڈت مدن موہن مالوی جہاں صنعت و حرفت کی اشاعت اور فن زراعت کی تعلیم کے سرگرم حامی ہیں وہاں وہ مذہبی اور سیاسی تعلیم .. کی اشاعت کے بھی بہت مؤید ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ ہندوستانی اگر بہترین صنائع اور موجودہ آلات و ادوات کے استعمال سے اچھی طرح واقف ہوں تو اسبات کی بھی ضرورت ہے کہ وہ اپنے مذہب کو پہچانیں اور فن حکومت سے واقفیت حاصل کریں۔ اسوجہ سے کہ فن حکومت ایسا فن نہیں کہ ہندوستانی اس سے ناواقف رہیں۔ اور اپنے ملکی و وطنی حقوق سے محض اسوجہ سے محروم رکھے جائیں کہ ہم میں اسقدر قابلیت نہیں کہ اپنے معاملات کو خود سمجھیں۔ اسی طرح ہم میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سائنس اور علوم رائجہ سے پوری پوری واقفیت بہم پہنچائیں اور پردۂ جہالت میں نہ رہیں چنانچہ اس موضوع پر انہوں نے ۱۹۰۲ء کی کانگریس میٹنگ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

"وہ زمانہ گذر گیا جبکہ یہ کہا جاسکتا تھا کہ اشاعت تعلیم کا فرض رعایا پر عائد"
"ہوتا ہے۔ اور اسی کو تعلیمی کام اپنے ذمہ لینا چاہئے مگر اب حقیقت"
"یہ سورج کی روشنی کی طرح ظاہر روشن ہوگئی ہے کہ کوئی حکومت"
"جب تک اپنی رعایا کو اعلیٰ تعلیم نہ دے گی اسوقت تک وہ ہرگز کامیاب"

"نہیں ہو سکتی۔ یورپ کی تمام مہذب سلطنتیں اپنی رعایا کو خود اعلیٰ تعلیم دیتی"
"ہیں۔ حتیٰ کہ انگلینڈ نے بھی اپنے نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم دینے کا فرض محسوس"
"کر لیا ہے۔ چنانچہ سر جان گورسٹ نے صنعت و حرفت کی اشاعت کے"
"متعلق تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "جو قوم قدرت کے پوشیدہ خزائن اور"
"زمین کی قیمتی اور کارآمد پیداوار سے مستفید ہونا چاہتی ہے اسکا فرض ہے"
"کہ وہ اپنے نوجوانوں کو سائنس کی تعلیم دے اور ان میں صنعت و حرفت"
"کی اشاعت کرے۔" اس معاملہ میں جرمنی سب سے پیش پیش ہے اور"
"اس نے اس راستہ میں انگلستان کو شکست دیدی ہے۔ اس نے اپنے"
"ملک میں ایسی درسگاہیں اور ایسے عظیم الشان معمل تیار کرائے ہیں جہاں"
"سائنس کی نہایت اعلیٰ تعلیم دیجاتی ہے۔ اور نوجوانوں کے موجد اور کارآمد"
"دماغوں سے کام لیا جاتا ہے۔ یہی راستہ جاپان نے بھی اختیار کیا ہوا اور اسی پر"
"اہل جاوا نے علم نباتات و معدنیات کی بڑی بڑی درسگاہیں قائم کی ہیں۔"
"اور وہاں ان علوم کے بڑے بڑے پروفیسر جرمنی سے بلائے گئے ہیں"
"تاکہ وہ انہیں ترقی کرنے کے عملی وسائل دشوار یہ پر قابض کرا دیں۔ مگر"
"ایک ہم (اہل ہند) ہیں کہ باوجودیکہ ۳۰ کروڑ کی عظیم الشان آبادی کے"
"ہزارہا مفید اور کارامد اشیا کے قدرتی طور پر موجود ہونے کے باوجود"
"ترقی کی تمام لوازم پر قدرت حاصل کرنیکے ہم تن پوشی اور شکم پروری"
"تک میں غیروں کے محتاج ہیں۔ یہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے اور اس بات"
"سے ہر شخص واقف ہے کہ ہمارے ملک میں خام اشیا کثرت سے موجود"
"ہیں۔ لیکن محض اعلیٰ تعلیم، اور تجارتی قابلیت کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے بالکل"
"معذور اور بیکس ہیں۔ اگر ہمیں اعلیٰ تعلیم دیجائے تو مثلاً ہمارے ملک سے"

"اس قدر کثیر تعداد میں ہڑی نہ جائے جو ارزانی یہاں سے جاتی ہو اور ملک"
"وغیرہ سے سینکڑوں اشیا بنکر آتی ہیں اور ہم نہیں جانتے ہیں کہ انکے بنانے کے"
"ذرائع کیا ہیں؟ ان اسباب کے مہیا کیے بغیر میں نہیں سمجھ سکتا اور کونسے"
"وسائل بنی نوع انسانی کے سب سے بڑے دشمن قحط کے رفع کرنے"
"کے لیے مل سکتے ہیں۔"

یہ خیالات معلوم کرنے کے بعد کیا کوئی اس بات پر تعجب کر سکتا ہے کہ آج سے ۵۲ سال پہلے پنڈت مالوی کے دماغ میں ہندو یونیورسٹی کا خیال آیا تھا۔ ہندو یونیورسٹی بنی اور اس طرح بنی کہ ہمارے فلسفہ کثرت و قلت کے ماہرین دیکھتے رہ گئے اس کے مؤید اور اس کے محرک پنڈت مالوی اور انہیں جیسے اولوالعزم حضرات تھے۔ اس کے معاون انریبل منشی مادھولال جیسے ذی ہمت لوگ تھے اور محض یہی شخصیتیں تھیں جن کی بدولت ہماری ہموطن قوم ایک قومی یونیورسٹی کی مالک ہے اور اپنے ایک قدرتی حق سے متمتع ہوگئی ہے خواہ وہ تمتع کلیۃً ہو یا نہ ہو۔ تجویز نہایت وسیع پیمانہ پر کی گئی اور اس کے پہلے پرنسپل پروفیسر میکسمولر تھے۔ یونیورسٹی کے متعلق ابتدائی عملی تجویز ۱۹۰۴ء میں شروع ہوئی۔ اور بنارس کے ایک جلسہ میں پیش کی گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سودیشی تحریک نہایت زور پر تھی۔ بنگال میں ایک سخت بائیکاٹ کی صورت پیش آنے والی تھی۔ الہ آباد کا نیم سرکاری اخبار پائونیر ہندو یونیورسٹی کو بھی سودیشی تحریک کا ایک ضمیمہ سمجھے ہوئے تھا اور وہ یونیورسٹی میں ایجی ٹیشن کی آگیں بھڑکتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے اڈیٹوریل کالموں میں یونیورسٹی کے خطرناک مسئلہ کو خوب واضح کیا اور اس کے بانیوں کو حکومت کی بیخ و بنیاد کمزور کرنے والوں میں شمار کیا۔ آخر مجبوراً مالوی جی کو اس الہ آباد کی تیز و طرار زبان کا ایک دندان شکن جواب دینا پڑا اور انہوں نے یونیورسٹی

کی حقیقت اور اس کی ضرورت وغیرہ تمام باتوں کو وضاحت کے ساتھ پبلک میں پیش کرکے بتا دیا کہ اینگلو انڈین دماغ کس قدر لینز سے مشابہ ہیں۔

ہندو یونیورسٹی کی تعلیمی تجاویز کو ابتداءً گورنمنٹ نے منظور کر لیا۔ لیکن مذہبی تعلیم کے متعلق اس میں جو کچھ حصہ تھا اس پر اعتراض کیا اور کہا گیا کہ ایک عیسائی سلطنت کسی غیر مذہب کی اشاعت نہیں کر سکتی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ کسقدر دل آزار و بےچین کر دینے والا جواب ہندوؤں کو دیا گیا۔ اگر کوئی عیسائی سلطنت بذات خود کسی غیر مذہب کی اشاعت نہیں کر سکتی تو کیا وہ یہ بھی اجازت نہیں دے سکتی کہ جو لوگ کسی مذہب کے پیرو ہیں وہ اس سے واقفیت حاصل کریں اور اپنی مذہبی تعلیم حاصل کریں؟ لیکن اس مسئلہ پر ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے اسوجہ سے کہ ہر کان معقول اور مدلل آواز نہیں سنتا۔

مسز بیسنٹ نے اس معاملہ میں ہندوؤں کی اعانت کی اور انہوں نے انگلستان تک انصاف طلب آواز کو پہنچایا۔



پنڈت مدن موہن مالوی کی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ کھینچکر اب ہم انکے اخلاق و خصائل سے بحث کرینگے جو ایک شخص کی لائف کا سب سے ضروری اور بہت اہم جزو ہے اگر کوئی شخص دنیا بھر کی اسناد حاصل کرے اور اپنی علمی قابلیت کا تمام عالم میں سکہ بٹھا دے مگر اسکا کیرکٹر بدنما داغوں سے آلودہ ہو اس کے اخلاق و عادات مذموم و غیر مقبول ہوں تو وہ ہرگز لائق انسان نہیں کہلایا جا سکتا اور نہ اسکا قول و فعل قابل تقلید و ستائش ہو سکتا ہے پنڈت مالوی جہاں بحیثیت ایک ذی علم بزرگ کے بحیثیت ایک محب وطن کے بحیثیت ایک ذی وجاہت و اقتدار شخص کے ایک ممتاز اور بلند درجہ پر ہیں اور ان لوگوں کی صف میں نظر آتے ہیں جنہیں ہندوستان کی کشتی کا ملاح کہا جا سکتا ہے وہاں ان سب باتوں کے علاوہ بھی انہیں چند ایسی باتیں ہیں جو بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ اور جن کی ایک

رہنمائے قوم اور ایک خادم ملک کے لیے بہت سخت ضرورت ہے۔

پنڈت مالوی میں ایک بہت پسندیدہ بات یہ ہے کہ موجودہ محققان راہ باطل کی طرح اپنے مذہب سے برگشتہ نہیں اور وہ اپنے کام کے اوقات میں سے ایک حصہ مذہبی ارکان ادا کرنیکے لیے نکال لیتے ہیں۔ انکی مثال ان لوگوں کی مثال نہیں ہے جو درد قوم ظاہر کرتے میں مذہب پر جان دیدینے اور دینی الحج پر قربان ہوجانے کی دھمکی دیتے ہیں لیکن جسوقت مذہبی عبادت کے متعلق سوال کیاجاتا ہو تو اسکا جواب انکے پاس خاموشی کے سوا کچھ نہیں ایسے واہیات اور ذلیل کیریکٹر کے لوگ انہیں متعصب تنگ نظر اور ملکی ترقی کی راہ کو مسدود کرنیوالا شخص سمجھتے ہیں لیکن اگر مذہب کی پابندی ہی تعصب و تنگ نظری ہو اور اباؤاجداد کے مذہب پر عقیدت رکھنا ملکی ترقی کو مسدود کرتا ہو تو خدارا مجھے بھی متعصبوں اور ملک کے بدخواہوں کی فہرست میں شمار کرو میں بھی اس جماعت میں داخل ہونا چاہتا ہوں جو مذہب کے پابند رہنے اور اپنے مذہب کی عزت قائم رکھنے کے جرم میں ملک کی بدخواہ تنگ نظر اور متعصب سمجھی جاتی ہو۔ ممکن ہے کہ بعض سیاسی مسائل میں کچھ لوگ انکے مخالف ہوں اور اسی مخالفت میں انکو زیادہ غلو ہوگیا ہو۔ مگر ہمیں اس سے بحث نہیں ہمیشہ لوگوں میں ایک دوسرے کی ارار وافکار سے باہم اختلاف ہوتا ہو مگر مذہب کی پابندی اس بات کی علامت نہیں کہ کوئی شخص اگر پابند مذہب ہے تو وہ متعصب بھی ہے۔

اسی طرح انکی تقریر اور انکی آزادخیالی بھی بہت قابل تعریف ہی۔ وہ تقریر کرتے ہیں اور نہایت جوش کے ساتھ وہ اپنے ضمیر کے مطابق زبان کو حرکت دیتے ہیں اور دلیری کے ساتھ مگر چاہے وہ کیسی ہی زوردار تقریر کرتے ہوں اور چاہے کسیقدر انہیں جوش آگیا ہو مگر انکی تقریر چاہے کسی مختلف فیہ مسئلہ پر ہو مگر کوئی شخص خواہ وہ مخالف ہو یا موافق یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ شاندار نہیں۔ اسیطرح وہ اپنے خیالات کو آزادی سے

ظاہر کرنے اور اپنے ضمیر کے مطابق بولنے پر جسقدر دلیر ہیں اسکا ثبوت انکی زندگی کے بہت سے واقعات سے ہوتا ہے۔ مگر سر مائیکل اوڈوائر لفٹننٹ گورنر پنجاب سے پنڈت مالوی نے جسقدر دلیری اور آزادی سے مقابلہ کیا وہ انکی زندگی کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ سر مائیکل اوڈوائر نے وائسرائے کی کونسل میں فوجی بھرتی پر تقریر کرتے ہوئے ہوم رولر طبقہ پر سخت ترین حملہ کیا یعنی انہوں نے کہا کہ میری گورنمنٹ میں ہوم رول کا خیال زیادہ نہیں ہوا اسلیے وہاں سے دولت برطانیہ کو جان و مال سے بہت زیادہ مدد دی گئی مگر دیگر صوبوں میں ہوم رولرس کی کثرت ہے اسلیے وہاں باوجود دولت اور کثرت آبادی کے بہت کم مدد دی گئی ہے۔ غرضکہ اسی قسم کے چند حملے انہوں نے اس دلیری کے ساتھ کیے جنھیں پنڈت مالوی مسٹر جناح وغیرہ صبر نہ سن سکے۔ چند غیر سرکاری ممبر بہت زیادہ مغلوب الغضب ہوگئے اور انہوں نے اپنی وہاں موجودگی کو قومی خودداری کے خلاف سمجھا اور اٹھکر چلے گئے۔ لیکن پنڈت مالوی نے اوڈوائر صاحب کی سخت مخالفت کی اور انہوں نے ایک ذی اقتدار تازک دماغ لفٹننٹ گورنر کی نہایت صاف الفاظ میں تردید کرتے ہوئے اپنے دلکو پیدرمیں جلال سے مرعوب و سند رش نہ ہونے دیا۔ اس دن وائسرائے کونسل میں صدر نہ تھے۔ دوسرے دن وائسرائے بہادر کونسل میں تشریف لائے اور انہوں نے اس واقعہ پر اظہار تاسف کیا۔ اور فرمایا کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ جلسہ اسقدر اہم ہوجائیگا میں چند وجوہ سے شریک نہ ہوسکا۔

پنڈت مالوی نے اپنے مضامین سے تمام ہندوستان کو آگاہ کردیا کہ کونسل میں کس طرح ہمارے جذبات وحسیات کی پروا نہیں کیجاتی اور بغیر کسی شرم وغیرت کے نہایت جسارت کیساتھ ہمپر دل آزار حملے کیے جاتے ہیں۔ ان مضامین سے تمام ہندوستان میں ایک آگ لگ گئی اور ہر شخص سر مائیکل اوڈوائر صاحب کی اس تقریر سے سخت نالاں

تھا۔ تیسرے اجلاس میں مالوی جی کو بلایا گیا اور چاہا کہ وہ شریک ہوں لیکن انہوں نے صاف کہدیا کہ جبتک لفٹنٹ گورنر صاحب اپنے الفاظ واپس نہ لینگے اسوقت تک میں ہرگز کونسل میں شریک ہونیکی ذلت گوارا نہیں کرسکتا۔ آخر مجبوراً او ڈوائر صاحب نے اپنے الفاظ واپس لیے اوراسطرح مالوی جی کی بدولت کونسل میں ہندوستان کی عزت و حشمت قائم رہی۔

گو پنڈت مدن موہن جہاں بہت آزاد خیال اور اظہار مافی الضمیر پر دلیر ہیں تاہم وہ طلبا کو سیاست اور ایجی ٹیشن سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ انکی رائے یہ ہے کہ طلبا سیاست سے واقف ضرور ہوں انکے خیالات و عقائد کا نشو و نما سیاست اور مذہب کے پانی سے ہو مگر وہ اسکے موافق نہیں کہ طلبا سیاسی معاملات میں عملی حصہ لیں اس معاملہ میں ہم پنڈت مالوی کی پوری تائید کرتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے طلبا اس سے ناواقف رہیں کہ ہم کیا ہیں اور ہمکو کیا ہونا چاہیے اور نہ ہم اسکی ضرورت سے منکر ہیں کہ طلبہ کو اپنے زمانہ طالب علمی میں اس قابل ضرور ہونا چاہیے کہ جب وہ اپنی طالب علمانہ زندگی ختم کریں اسی وقت سے ملکی اور قومی فرائض کو انجام دیں اور اپنے ان حقوق کو حاصل کرنیکی جد و جہد میں مشغول ہو جائیں جنسے وہ محروم کردیئے گئے ہوں۔ لیکن ہم اس خیال کو ہرگز قابل عمل نہیں سمجھتے بلکہ ہم اسے اپنے طالب علم نوجوانوں کی زندگی خراب کرنیوالا خیال سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی مدرسہ کی زندگی ہی میں طلب حقوق کی سعی کریں اور بغیر تعلیم کی تکمیل کے سیاسی معاملات میں حصہ لیں درانحالیکہ یہ ملک کے واسطے نقصان دہ ہے۔ وہ لوگ ملک کو کبھی فائدہ نہیں پہنچا سکتے جو بغیر اپنی بنیاد تعلیم کو مستحکم کیے سیاسی معاملات میں حصہ لیتے ہیں۔ اس خیال میں سر سریندر ناتھ بنرجی ہمارے مخالف ہیں لیکن ہم نہیں سمجھ سکتے کہ بنرجی صاحب کس بنا پر طلبا کے سیاست میں عملی حصہ لینے کے مؤید ہیں انہیں پنڈت نے مدراس میں طلبا کو ایک بہتر نصیحت کی تھی اور انہیں اسکے نتائج سے آگاہ کیا تھا۔ اسی طرح بنگال کے ایجی ٹیشن کے زمانہ میں انہوں نے بنگالی پرجوش نوجوانوں کو ایک تقریر میں اپنے خیالات سے آگاہ کیا اور بہت مدلل طریق سے اپنے خیالات کو ظاہر کیا تھا۔

ابوالاعلیٰ مودودی

ڈاکٹر ایرکن ترکمان
رئیس شعبۂ اردو
سلجوق یونیورسٹی قونیہ، ترکی

اردو میں ترکی الفاظ

پیش گفتار: ہم اس مختصر سے مطالعہ میں ان ترکی الفاظ کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جو اردو میں یا تو براہ راست داخل ہوئے ہیں یا پھر فارسی کے ذریعے آئے ہیں۔ ایسے الفاظ کی فہرست سب سے پہلے اولو ڈیشیس[1] نے سن ۱۹۵۵ء میں دی تھی لیکن اونوں نے ۱۵۰ الفاظ کو ترکی دکھا کر ان کے صرفی ثبوت نہیں دیے۔ انھوں نے کچھ ایسے الفاظ بھی اپنی فہرست میں داخل کر دیے جو یا فارسی تھے یا منگولی۔ مثلاً ساوغات، الاش، تسمہ، آقا، چاقو وغیرہ۔ اولو صاحب نے ترکی کی پرانی لغت "دیوان لغات الترک"[2] سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ دور حاضر کی دو اور لغات ہیں جو اس کام کیلیے بہت فائدہ مند ثابت ہوتی ہیں۔

I-Sir Gerard Clauson, An Etymological Dictionary of pre-Thirteen Century Turkish, Oxford, Clarendon Press, 1972

(۱۳ویں صدی عیسوی سے پہلے کی ترکی کی صرفی لغت)

2- Prof.G.Deorfer, Turkische and Mongolische Elements in Neupersischen, I, 1963; II 1965; III 1967; IV 1975 Wiesbaden

(جدید فارسی میں ترکی اور منگولی عناصر)

ہماری فہرست میں ان لغات سے پورا استفادہ کیا گیا ہے۔

علی گڑھ کے میرے دوست جناب ڈاکٹر واکمل ایوبی[3] نے بھی بہت سے فارسی الفاظ کو ترکی بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر یعقوب مغل[4] اور پروفیسر مخمک (مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۰ء) نے ایک مشترکہ فارسی اور عربی الفاظ کی فہرست دی ہے جو کسی بھی ترکی

۱، ۲، ۳ ان تصانیف کے لیے دیکھیے یہاں "فہرست کتب"

4-Dr.Muhammad Yaqub Mughal, Heritage of Common Words in use in Turkey, Pakistan and Iran, Turk Tarih Kurumu, Ankara 1980.

یا فارسی فرہنگ میں مل سکتی ہے۔ اس لیے اس کام کو دوبارہ ہمیں ہی ہاتھ میں لینا پڑا۔ یہ فہرست پہلی دفعہ ترکی زبان میں "ترک دلی (زبان ترکی)" حکومت کے سب سے بڑے رسالے میں چھپی تھی۔ اس فہرست کے دو حصے تھے[1]۔ پہلے حصے میں ترکوں اور ہندوستانیوں کے درمیان جو تجارتی تعلقات پیدا ہوئے ان کا ایک خلاصہ پیش کیا گیا تھا۔ دوسرے حصے میں الفاظ کی فہرست دی گئی تھی جس میں ایک طرف ترکی الفاظ کا اردو میں مطلب اور ان کے سامنے ان الفاظ کا ترکی میں مطلب مع تاریخی پس منظر پیش کیا گیا تھا۔ جب یہ مضمون یہاں مقبول عام ہوا تو یہ پھر قدرے تفصیل سے انگریزی میں "دی ٹرکش ایلی منٹس ان اردو" کے عنوان کے تحت چھپا[2]۔ اس مضمون میں اردو اور ترکی گرامر کے مشترکہ عناصر پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی۔ یہی مضمون دوبارہ جون کاتون خدا بخش لائبریری پٹنہ کے جرنل شمارہ ۴۰ (۱۹۸۷ء) میں شائع ہوا ہے۔ اب اسی مضمون کو ذرا اور تفصیلات کے ساتھ اردو میں پیش کرتا ہوں۔ یہ کام بھی آخری نہیں ہے بلکہ ماہرین لسانیات کے لیے ایک رہنما کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہندوستان میں ترکی زبان اور ادب کے اثرات:۔ ترکی ادب اور زبان کے جو اثرات ہندوستان اور پاکستان میں پائے جاتے ہیں انھیں چار بڑے ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) اسلام سے قبل۔ (۲) محمود غزنوی سے بابر تک۔ (۳) بابر سے شاہجہاں تک (۴) شاہجہاں سے دور حاضر تک۔

(۱) اسلام سے قبل:۔ وسط ایشیا کی ایک ترکی قوم بادشاہ کی سربراہی میں ہندوستان میں آ گر فتک آئی اور چار سو سال تک شمالی ہندوستان میں حکمراں رہی۔ وہیں بادشاہ کشان نے ایک شاندار تمدن کی بنیاد ڈالی[3]۔ ظاہر ہے ان قبائل کی زبان بھی کسی قسم کی ترکی ہوگی لیکن افسوس ہے کہ آج تک ان کی زبان اور ادب کا کوئی سراغ نہیں ملا اور ابھی اس موضوع پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ جب وسط ایشیا کی ترکی قوم اویغور نے بدھ مت کا مذہب اختیار کر لیا تو دوبارہ ہندوستان اور ترکوں کے درمیان ایک تمدنی پل پیدا ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اویغوری ترکی میں بے شمار سنسکرت کے الفاظ داخل ہو گئے۔ اسی طرح ترکی کے الفاظ بھی سنسکرت میں داخل ہونے لگے[4]۔ اب چونکہ اس زمانے کی تصانیف یا کتبے ہم تک نہیں پہنچے اس لیے یہ بتانا مشکل ہوگا کہ کون سے الفاظ یا افکار ترکی الاصل ہیں لیکن یہ امر قرین قیاس ہے کہ چار سو سال میں کچھ لین دین ضرور ہوئی ہوگی۔

(۲) محمود غزنوی سے بابر تک:۔ غزنوی کی فوج کا بڑا حصہ ترکی سپاہیوں اور سپہ سالاروں پر مشتمل تھا۔ ان کے پنجاب میں آنے سے ترکی کے اثرات بہت گہرے پڑے ہونگے۔ اس بات کا ثبوت ہمیں ترکی الاصل شاعر امیر خسرو

1— Turk Dili, no.397 (January); no. 399 (March) 1985, TDK, Ankara

2— The Journal of Ottoman Studies, Vol. VI, Istanbul 1986

3— G.Allana, Our Freedom Fighters, Ferozsons Ltd. P.5

4— Prof.Dr.Abidin Itil, Turkce-Sanskrit Arasinda Linguistik Paraleller, "Dogu Dilleri", Dil ve Tarih Cog. Fak., Ankara 1970, I.c. 4.sayl p.139-150

(۱۲۵۳-۱۳۲۵) دہلوی کے ان اشعار سے ملتا ہے :

شہرت ترکی ہم ازان شد یقین | کاغلب شدہ ترک برآمد بر زمین
شد سخنش خاصگی از جو زبر | عامہ گرفت و بجہان گشت سمر
ہند ہمین فائدہ دارد بسخن | ہندوی بود در ایام کہن
غوری و ترکی آمد شاہزادہ | پارسی بود بدیدار نہان [۱]

(اس میں شک نہیں کہ ترکی کی شہرت بھی اس لیے وقوع میں آئی کہ پہلے ترکی بادشاہ ہی نے اس زمین (ہندوستان) پر قدم رکھا تھا۔ اس کے مقربوں نے جب اس زبان کو سیکھ لیا تو عام لوگوں نے بھی اسے اپنا کر افسانے کی مانند پھیلا دیا۔ ہندوستان میں زبانوں کا کچھ ایسا ہی طریقہ چلا آ رہا ہے۔ پرانے زمانے میں جب ہندوی بولی جاری تھی تو انھوں نے غوری (اور غزنی یا ترکی کا نام) اور ترکی سیکھ لی اور ابھی فارسی کہیں نظر نہیں آتی تھی۔)

ان اشعار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ترکی فارسی سے پہلے ہندوستان میں آئی تھی اور بعد میں شاہی زبان ہو کر رہ گئی۔ چونکہ ترکی ہندوی سے بالکل مختلف تھی اور فارسی ہندوی کی پرانی بہن تھی اس لیے ہندوستان کے باشندوں نے آہستہ آہستہ فارسی ہی کو اپنانا شروع کر دیا۔ ترکی بادشاہوں نے بھی فارسی کو رسمی زبان بنا لیا لیکن یہ ضرور یاد رہے کہ جو فارسی ہندوستان میں پھیلی تھی وہ تورانی فارسی تھی جس میں بے شمار ترکی الفاظ ملتے تھے۔ افکار بھی ترکی طرز کے تھے۔ جن کا ایرانیت سے زیادہ تعلق نہ تھا۔ قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش (فاتح)، غیاث الدین بلبن (بلابان)، خلجی اور تغلق سب یہ فارسی دان ترکی بادشاہ تھے۔ محلوں میں فارسی اور ترکی دونوں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ منگولوں کے جور و ستم سے بچ کر ترکی قبیلے ایران سے ہوتے ہوئے اناطولیہ جا رہے تھے اور ان کا ایک حصہ ہندوستان جا رہا تھا۔ شمس الدین التمش اور غیاث الدین بلبن کی سخاوت اور محبت کی داستانیں سن کر ترکی قبیلے جوق در جوق ہندوستان گئے لیکن اتنا فرق تھا کہ جو لوگ اناطولیہ گئے وہ مقامی باشندوں سے ذرا دور رہے۔ انھوں نے اپنی زبان اور تمدن کو محفوظ رکھا حالانکہ فارسی یہاں بھی حکم چلاتی رہی۔ لیکن جو ترکی قومیں ہندوستان گئی تھیں وہ افغانستان میں افغان بن بیٹھیں (جیسے خلجی جن کو ترکی میں قال آچ کہتے ہیں) [۲] یا پھر منگولوں سے مل کر مغل بن گئیں۔ جو باقی رہیں وہ بھی ہندوستان کی گنجان آبادی میں ڈوب کر رہ گئیں۔ [۳]

---

[۱] امیر خسرو دہلوی کا نہ سپہر، حکیم اوغلو علی پاشا (؟) نمبر ۲۲ صفحہ ۱۲۹

[۲] بلوکمان، دی ہیرو سوڈی آف دی پرشین، فلو پریس، آمسٹرڈیم ۱۹۷۰ء، ص ۱۶

[۳] اس موضوع پر جرمنی کے ممتاز پروفیسر دیور فر گرھارڈ نے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

وسط ایشیا کے ترک سمرقند، بخارا اور خراسان میں تینوں زبانوں یعنی فارسی، عربی اور ترکی پر عبور رکھتے تھے۔ وحدت اسلام کی وجہ سے زبان اور قومیت کا امتیاز نہیں تھا، یہی تینوں زبانوں کا جب ملاپ ہوا تو اناطولیہ میں اس کا نام عثمانی رکھا گیا۔ لیکن ہندوستان میں چونکہ ایک مقامی بولی ہندوی بھی تھی، اس لیے اس کا نام اردو پڑ گیا۔ عثمانی میں ترکی کے افعال آتے ہیں اردو میں ہندی کے باقی فارسی اور عربی الفاظ وہی ہیں۔ اس لحاظ سے عثمانی اور اردو میں بہت مشابہت ہے۔ یہ امر خاص طور پر اشعار میں بہت واضح ہے۔

محمود غزنوی سے لے کر اورنگ زیب تک وسط ایشیا سے ترکوں کی کوچ باقاعدہ جاری رہی جبکہ خود محمود کے محل میں تقریباً ...۴ ترک سپاہی پہرہ دیتے تھے تو ترکوں اور مغلوں کا کیا حالت ہو گی؟ الغرض جب تک مغلیہ جمہوریت کے قیام تک فارسی کا رواج رہا تو ہندوستان میں کیوں کم ہوتا۔ ایرانی، رومی اور تاجی ہندوستانی فارسی کو پسند کرتے تھے[۱] بلکہ اس زبان کا مذاق بھی اڑایا کرتے تھے۔ اُس تعصب کی بنا پر دھیرے دھیرے ہندوستانی مسلمانوں نے ایک نئی زبان کو اپنانا شروع کیا جس کا نام اردو ہے۔ عثمانیوں نے بھی فارسی کو چھوڑ کر مخلوطی زبان عثمانی کو اپنا لیا۔ اس لحاظ سے اردو زبان اور ادب کے ساتھ عثمانی زبان اور ادب کے درمیان گہرے تعلقات ملتے ہیں۔ ادب میں جب تعلق ہے تو زبان جس کا نام بھی ترکی ہو تو اس میں کیوں نہ ترکی عناصر پائے جائیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اگر ترکی قبیلے خود فارسی کے بجائے ترکی پر زور دیتے تو ظاہر ہے کہ اردو میں ہزاروں ترکی الفاظ داخل ہو جاتے۔ ترکی زیادہ تر محلوں اور کوشکوں ہی میں محدود رہی۔ اس کے باوجود مدرسوں میں ترکی پڑھائی جاتی تھی۔ امیر خسرو کی "نصاب ترکی" ان دنوں کی یادگار ہے[۲]۔ نصاب کا ذکر خدا بخش لائبریری کے ایک مخطوطے میں بھی ملتا ہے[۳]۔

خسرو دہلوی کی کثیر الجہت طبیعت نے فارسی، ترکی، ہندی اور عربی کو مخلوط کر کے اردو کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لیے انھیں بانی "اردو" کہا جا سکتا ہے۔ خسرو کے بعد ہندوی کو فارسی سے ملانے کی عادت ہو گئی۔ چلتے چلتے اردو میں فارسی عربی، ترکی عناصر بڑھتے گئے۔ کسی بھی زبان کی پیدائش کی ایک معین تاریخ نہیں دی جا سکتی یہی حال اردو کا بھی ہے۔ لیکن تاریخی حقیقتوں کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کی بنیاد پنجاب ہی میں ڈالی گئی تھی۔ اس امر کا پورا ثبوت محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں دے دیا ہے۔ اس سے الگ ہم جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ پنجابی میں روزمرہ کے کئی الفاظ

---

[۱] جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، حصہ دوم، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۸۲ء ص ۲۲۔

[۲] پنجاب لائبریری لاہور " (Ap1) نمبر ۶

[۳] خدا بخش لائبریری پٹنہ، مخطوطہ نمبر ۱۷، ص نمبر ۲ ب (۱۹ ویں صدی)

ترکی سے آئے ہیں۔ مثلاً باجی، آپاجی، سائیں، بابا، وغیرہ۔ رسم و رواج میں اور بھی زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ جیسے دلہے کو گھوڑے پر بٹھانا، مہندی کی رات، سہیلیوں کے گانے اور ان کا طرزِ بیان، لوک گیت وغیرہ۔[۱]

اسلامی تہذیب کی غمازی کرنے والے الفاظ جیسے کھانوں کے نام:۔ کباب، قورمہ، پلاؤ، اچار، دولمہ۔

لباس کے نام:۔ شلوار، شال۔ ہتھیاروں کے نام:۔ توپ، توپچی، تفنگ، تمنچہ۔ ملٹری اصطلاحات جیسے:۔ ہراول، تمغہ۔ اور رتبے جیسے:۔ بیگ، خان، خان خانان، اولو خان، قتلو خان۔ اردو میں فارسی اور ترکی کے ذریعہ آئے ہیں۔ ویسے بھی اردو میں جو ترکی الفاظ ملتے ہیں دو طرح کے ہیں ایک وہ جو براہ راست ترکی سے آئے ہیں دوسرے وہ جو فارسی کے ذریعے داخل ہوئے ہیں۔ بہت سے مرزی الفاظ انگریزوں کے زمانے میں ناپید ہو گئے۔

نوزاد اردو کی پہلی پرورش وسط ایشیا سے آنے والے ولیوں نے کی جن میں ترکی ولی بھی موجود تھے۔ ان میں سے معین الدین چشتی اور بابا فرید قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے خیالات میں ترکی تصوف کی بو آتی ہے۔ یہ وہی خیالات ہیں جن کی بنیاد کو پیر ترکستان احمد یسوی نے مضبوط کیا تھا۔ رومی پر اور ان کے ابعاد پر بھی ان کا خاصا اثر ہوا تھا۔ تیموریوں کا جب زمانہ آیا تو اردو جیسے نئے دکن کے ترکمانی بادشاہوں (قطب شاہی) کی سرپرستی میں نشوونما پاکر ایک نوجوان لڑکی کی حالت اختیار کر چکی تھی۔ قلی قطب شاہ نے اردو کا پہلا دیوان مرتب کیا۔[۲] حیدرآباد ہی میں ترکوں نے ترکی، فارسی کی لغات تیار کروائیں۔ ان میں سے ایک یادگار ۱۱۸۳ صفحوں پر مشتمل "فرہنگ ترکی" ہے جو تقی بیگ بن قوام الدین ترکمان نے سن ۱۷۲۵ء میں لکھی تھی۔[۳]

۳۔ بابر سے شاہجہان تک:۔ بابر شاہ ایک ایسا بادشاہ تھا کہ اسے ترک ہونے پر پورا فخر تھا۔ وہ علی شیر نوائی کے بعد مشرقی ترکی (چغتائی ترکی) کا سب سے بڑا شاعر تصور کیا جاتا ہے۔ چونکہ وہ شاعرانہ طبیعت کا بادشاہ تھا اس لیے اسے ادب سے بہت لگاؤ تھا۔ اس نے شعرا کی حوصلہ افزائی کی اور خود بھی شعر کہے۔ اردو کی قدر افزائی کرنے کیلئے ترکی اور اردو سے مخلوط یہ شعر کہا ؎

مجھ کو نہ ہوا کوئی ہوس مانک موتی ۔۔۔ فقرا ہلنہ بس بلغوسی در پانی و روٹی[۴]

"مجھے کوئی مال و ملک کی ہوس نہ ہوئی۔ فقیروں (اللہ والوں) کے لیے پانی اور روٹی ہی کافی ہے۔"

بابر کے بیٹے کامران نے بھی ترکی میں اشعار کہے۔ بیرام خان اور اس کے بیٹے عبدالرحیم خان خاناں نے ترکی اور ہندی کو خوب ملایا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانہ میں بھی ترکی ادب اور زبان اچھی طرح مقامی تمثیلات کے ساتھ گھل مل

---

[۱] اس موضوع پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ [۲] محمد قلی قطب شاہ، کلیات قلی قطب شاہ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ابراہیمیہ مشن پریس حیدرآباد ۱۹۴۰ء۔ [۳] اورینٹل مینوسکرپٹ لائبریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، شرناکا حیدرآباد، مخطوطہ نمبر ۸۹۔ [۴] ڈینی سن روس، دیوانِ بابر بادشاہ، جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ ۱۹۱۰ء ص ۲۱۔

گیا۔ ہمایوں کے ساتھ اور بعد میں جب ایران کے راستے سے ترکی قبیلے آئے تو انھوں نے اپنی فارسی تصانیف میں کچھ ترکی الفاظ استعمال کیے جو بعد میں اردو کا حصہ بن گئے۔ اکبر شاہ چونکہ یہ جانتے تھے کہ وسط ایشیا سے آنے والی قومیں اب واپس نہیں جا سکتیں۔ اب ہندوستان ہی ان کا وطن ہے۔ اس لیے انھوں نے مذہب اور زبان میں یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مذہبی آمیزش میں وہ کامیاب نہ ہو سکے لیکن ریختے نے خوب ترقی کی۔ جہانگیر کے زمانے میں تو اسمٰعیل نے طوطی نامہ کو ریختہ میں ڈھالا۔

جب شاہ جہاں نے دارالخلافہ کو آگرہ سے دہلی منتقل کیا تو اس نے شہر کا نام "شاہجہان آباد" رکھا، اور جہاں خرید و فروخت ہوتی تھی اس جگہ کو "اردو بازار"، فوجی مرکز کو "اردوئے معلی" کا نام دیا گیا۔ لفظ اردو یہیں سے مروج ہو گیا۔ ترکی، فارسی اور ہندی بولنے والے سپاہی یہاں اکٹھا ہوتے تھے اور اپنی زبانوں میں بات چیت کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ہندی اور فارسی زیادہ چلتی ہوگی۔ فرہنگ آصفیہ کے مؤلف سید احمد دہلوی کا یہ بیان مجادلے بھی سے خالی نہیں:

"اہل ہند ان الفاظ مخلوط کو اردوئے معلے یعنی سلاطین کے لشکر کی بولی کہنے لگے۔ پھر کثرت استعمال سے زبان کا لفظ محذوف ہو کر خود اس زبان کا نام اردو پڑ گیا۔ جب شاہجہان کے زمانے تک متواتر اس زبان کو ترقی ہوتی چلی آئی تو بادشاہ مذکور نے اس کے رواج پر کمر باندھی اور ہر ایک بازار میں دلال مقرر کیے تاکہ جو الفاظ خرید و فروخت کے وقت ان لوگوں کی زبان سے سرزد ہوں انھیں مع موقع استعمال راست بی کم و کاست لکھ کر حضور میں پیش کرتے رہیں"[1]

اس بیان میں کوئی مبالغہ نہیں کیونکہ حیدرآباد کی اردو میں ترکی کے اثرات بہت کم نظر آتے ہیں۔ حالانکہ قلی قطب شاہ خود ترکی الاصل تھے[2]۔ انھوں نے آج کی اردو کے لحاظ سے بہت کم فارسی، عربی اور ترکی الفاظ استعمال کیے ہیں اس لیے یہ بھی یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ جدید اردو نے دہلی ہی میں نشو و نما پائی تھی[3]۔ یہ بھی دلچسپ کی بات ہے کہ آج بھی ترکی کے ہر شہر میں اردو بازار (اردو بازاری) ملتا ہے جہاں پر صرف سپاہی ہی نہیں بلکہ عام لوگ بھی خرید و فروخت کر سکتے ہیں۔ بہ ویسے یہ فوجیوں کا بازار۔ شاہ جہاں کی سلطنت کے دور کو اردو کا سنہری زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ترکوں اور ہندوستانیوں کی مشترکہ پیداوار ہے۔ ایرانیوں کا اس میں صرف اتنا حصہ ہے کہ ترکی قبائل خود فارسی بولنے لگے تھے ورنہ ایرانی مہاجروں کی تعداد ترکوں کے لحاظ سے بہت کم تھی۔

(۴) شاہجہان سے دورِ حاضر تک:۔ یہاں تک ہم دیکھ چکے ہیں کہ وسط ایشیا سے ترکوں کا سیلاب آتا رہا اور آ کر ہندوستان میں سکونت اختیار کرتا رہا۔ اب دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ گئے کہاں؟ آج وہ لوگ ان ناموں کے پیچھے چھپے بیٹھے ہیں: "مرزا، بیگ، ترکمان، ترکی بنجارہ، غوری، خوجہ، جوجہ، چغتائی، خلجی وغیرہ۔ جب

---

[1] فرہنگ آصفیہ ۱، ص ۹۰۔ [2] آصفیہ، وہی صفحہ۔ [3] محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، جلد ۲، ص ۳۵۔
[4] محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، ص ۱۸۔

انگریزوں کا زمانہ آیا تو ترکوں کی شامت آگئی۔ ان کو مغل ہتاتار کے نام سے رسوا کیا گیا۔ ترکی الاصل الف نہ کی جگہ انگریزی ٹھونسی گئی۔ ہندوستان میں ترکوں کی تاریخ کے شیرازے بکھیرے گئے۔ خلجیوں کو پٹھان بنایا گیا۔ بابر کو مغل کا نام دیکر الگ کر دیا گیا انگریزوں نے اپنی قوم کو فرشتوں (ANGEL) سے نسبت دے کر ہندوستانیوں کے دماغ میں انگریزی بادشاہت کی گہری بنیاد ڈالی جو آج تک پھل پھول رہی ہے۔ اس قومیت پرستی کا یہ نتیجہ ہوا کہ سارا عالم اسلام تتر بتر ہو کر رہ گیا۔ خوش قسمتی سے ترکی میں انگریزوں کی جڑ فوراً ہی خشک ہو گئی اور انگریزی یہاں اپنا رنگ نہ دکھا سکی۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اردو جو ترکوں اور ہندوستانی بھائیوں کی مشترکہ پیداوار ہے پاکستان کے بننے کے بعد انگریزوں اور ہندوؤں کی بے جا عداوت سے محفوظ رہے گی۔

اردو ادب کے برگزیدہ ادیب اور شعرا میں ترکوں کو فوقیت حاصل ہے۔ بانیٔ اردو امیر خسروؔ، اسد اللہ خاں غالبؔ، قلی قطب شاہ، مرزا بیدلؔ، میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ، انشا اللہ خاں انشاؔ، سعادت یار خاں رنگینؔ، جیسے ممتاز شعرا ترکوں ہی کی یادگار ہیں۔ اس لیے اردو ادب کا مطالعہ کرنا ایک حد تک ترکی ادب کا مطالعہ کرنا ہے۔ جب ایسے شعرا اور ادیبوں کے خیالات کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو یہ بات اور بھی واضح ہو جائے گی کہ وہ اس قوم سے کتنا گہرا تعلق رکھتے ہیں جو ایران سے ہوتی ہوئی اناطولیہ آ گئی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ترکوں نے یورپی ظلم و استبداد کے خلاف جھنڈا اٹھایا تو ہندوستان کے مسلمان بالکل ایسا محسوس کرنے لگے جیسے وہ خود ترکوں کے ساتھ جنگ میں تھے۔ ان کے دلوں میں سیاسی انقلاب کا ولولہ پیدا ہو گیا۔ ایسی حالت میں خالدہ ادیب کے قومی افسانے پڑھے جانے لگے۔ سجاد حیدر یلدرم نے ترکی افسانوں کے ترجمے کیے۔ محمد اقبال نے "طلوع اسلام" میں اپنے جذبات اور ترکوں سے عقیدت کا اظہار کیا۔

اس مختصر سے تاریخی جائزے کے بعد ہم اب اپنے اصل مقصد کی طرف آتے ہیں۔ جناب ڈاکٹر اکمل ایوبی جن کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں نے کئی بار "اردو میں ترکی الفاظ" پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی لیکن ہر دفعہ الفاظ کی فہرست دی لیکن کوئی وضاحت نہیں دی بلکہ غلطی سے کچھ فارسی الفاظ کو ترکی بنا دیا چند مثالیں یہ ہیں: چشمہ، بابچہ، جیب، سودا، سوداگری، لالہ، سپاہی وغیرہ[1]۔ ڈاکٹر محمد صابر صاحب نے بھی ایک فہرست دی ہے[2] لیکن ان الفاظ کے ترکی ہونے کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں دیا۔ ویسے بھی ان کی "ترکی اردو لغت" حرفی

---

[1] اکمل ایوبی، "عکس جمیل" ادارہ علوم اسلامیہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۸۴ء

[2] محمد صابر، ترکی اردو لغت، لائبریری پروموشن، کراچی، ۱۹۱۸ء

انداز میں نہیں ہے۔ سات سال کے لگ بھگ سلجوق یونیورسٹی کے ترکی ادب اور زبان کے شعبہ میں جب استاد کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا تو میری ملاقات بڑے بڑے ماہرین زبان ترکی سے ہوئی اور انھوں نے بڑی قیمتی تصانیف سے بھی متعارف کرایا۔ اردو میں ترکی الفاظ کی فہرست بنانے اور ان کا تاریخی پس منظر دینے کے لیے انھوں نے میری حوصلہ افزائی بھی کی۔ اب ـــــــ یہ فہرست اردو زبان کے ماہرین کے ملاحظہ کے لیے یہاں پیش کرتا ہوں۔

ترکی سے اردو میں جو الفاظ داخل ہوئے ہیں ان کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) وہ الفاظ جو جوں کے توں اردو میں داخل ہوئے ہیں۔ (۲) وہ الفاظ جو فارسی کے ذریعے بلکہ ذرا بگڑ کر داخل ہوئے ہیں۔ (۳) وہ الفاظ جو اردو یا ہندی کی صرفی شکل کی زد میں آ کر بالکل بدل چکے ہیں۔ (۴) منگولی الفاظ جو مشرقی ترکی کے ذریعے اردو میں داخل ہوئے۔ ان چاروں طرح کے الفاظ کو فہرست میں مندرجہ ذیل مخففات کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔

۱۔ **(ت)** یہ الفاظ ترکی ہیں اور جدید ترکی میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اگر اب استعمال نہیں ہوتے تو یہ عبارت ملے گی۔ "(ج ت) میں استعمال نہیں ہوتے"۔ یہ الفاظ بھی اردو کی صرفی ساخت کی تاثیر میں تلفظ کے لحاظ سے بدل گئے ہیں۔ اردو میں ترکی کی طرح غیر گولائی دار پچھلے گولائی دار اگلے اور درمیانی حروف علت نہیں پائے جاتے اس لیے یا تو وہ اگلے حروف علت جیسے ای (i)، اے (e)، اے (ey) یا پچھلے حروف علت جیسے او (u) او (o) اور (aa) ہو جاتے ہیں۔ مثلاً "سُرمہ" (sürme) اردو میں "سُرما" ہو گیا۔ اور "تاورمہ" اردو میں "تورما" ہو گیا۔ یہاں (ü) کی شکل ترکی میں حرف صحیح ہے جبکہ اردو میں یہ پچھلا حرفِ علت ہو گیا ہے۔

۲۔ **(ت+ف)** یہ وہ الفاظ ہیں جو فارسی کے ذریعے اُردو میں داخل ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض فارسی کی تاثیر سے ذرا بدل گئے ہیں جیسے "یُورُیوش" (یاورُو یاوش) ترکی کا اصل تلفظ ہے جو "یورمک" (yurumek) ، "چلنا" سے اسم ہے۔ اس لفظ میں (یُو) کی آوازیں ربطی عناصر ہیں جو فارسی میں آکر گر گئیں۔ اس طرح یہ لفظ "یُورش" ہو گیا اور اردو میں مزید تبدیل ہو کر "یورِش" کی شکل اختیار کر گیا۔ ترکی میں زیادہ تر ایک ہی طرح کے حروف علت سے مل کر الفاظ بنتے ہیں۔ جس سے صوتی ہم آہنگی قائم رہتی ہے لیکن اردو میں ایسا نہیں ہے۔ اس لئے الفاظ میں خاصی تبدیلی ہو جاتی ہے[۱]۔

۳۔ **(ت+ا)** یہ ایسے الفاظ ہیں جو یا تو بالکل بدل چکے ہیں یا وہ اردو سے ایسے گھل مل گئے

---

[۱] صوتی ہم آہنگی کے لیے دیکھیے، محمد صابر، ترکی اردو لغت، ص ۲۵ (مقدمہ)۔

ہیں کہ انھیں پہچاننا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ جیسے "کُمِچُوک" ترکی سے فارسی میں "کُوچک" (ک و چ ک) ہو گیا اب اردو میں آخری "ک" گر گئی اور "پتا" (حرف ضمیمہ بدل کر) "کچھ" ہو گیا۔ ایک اور مثال "کابک" ہے جو اردو خیال کیا جاتا ہے حالانکہ یہ ترکی کے لفظ "قابوغ" (قابوق) سے ماخوذ ہے۔ ایسے الفاظ کے لیے ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ لیکن اتنا ضرور یاد رہے کہ ترکی الفاظ کو عربی املا میں لکھنا بہت مشکل تھا۔ مثلاً "طپنجہ" کی پندرہ مختلف شکلیں موجود تھیں (دیورفرج ۲ ص ۹ ۳۳۹)۔ ترک جب پہلی بار مسلمان ہوئے تو "خوشلکتے"، "مذکور"، "موقمات"، عثمان کو "توتمان" کی شکل میں لکھا تھا۔[1] اس لیے جو الفاظ پرانے زمانہ میں اردو میں داخل ہوئے ہیں اُن کا بڑی احتیاط سے مطالعہ کرنا پڑے گا۔

۴۔ (م ← ت) یہ وہ الفاظ ہیں جو منگولی الاصل ہیں لیکن اردو میں مشرقی ترکی کے ذریعے داخل ہوئے ہیں۔ جیسے "توزک"، "باورچی"، "قینچی" وغیرہ۔

اس فہرست کی تیاری میں ہم نے وہ متون بھی چھانٹے ہیں جن میں ترکی الفاظ بہت استعمال ہوئے ہیں جیسے: "بابر نامہ"، "ہمایوں نامہ" لیکن یہاں صرف وہ الفاظ داخل فہرست کیے گئے ہیں جو واقعی اردو ہی میں مستعمل ہوئے تھے یا ہوتے ہیں۔

اردو میں ترکی الاصل الفاظوں کی فہرست

لفظ	اردو میں اس کا مطلب	ترکی میں مطلب اور تاریخی استناد
۱۔ آپا:	(ت) "بڑی بہن، بہن" (فیروز ص ۴) اور اردو "ابا = باپ"	آپا (آبا): بہن، بڑی بہن، باپ، دادا، اجداد (اویغور ۱۸، راڈ ۱۰، ۱۲۰۱۷، کلاؤ ص ۵)
۲۔ اتا:	(ت) "باپ، والد" (فیروز ۲۱)	اتا: "باپ، لقب" (اویغور ۴۴، دت فہرست ۴۷)
۳۔ اتاق:	(ت) "خیمہ، گھر" (فیروز ۶۱)	اتاغ یا اوطاق "خیمہ بڑا اور سجا ہوا خیمہ" (قاب ۴۴، دت ۲، ۲۰۸، ت ص ۵۷۵) چ ت میں بالکل انغار ہے "اودہ" = "کمرہ" ہو گیا ہے۔
۴۔ اتالیق:	(ت) "ادیب، ادب سکھانے والا، تربیت دینے والا، سدھارنے والا، استاد" (آگہی، ۱، ص ۱۰۳)	اتالیق: کفیل، کسی بادشاہ کا کفیل، منھ بولا باپ، رعایا کی شکایتوں کو سن کر بادشاہ تک پہنچانے والا شخص" (ش ص ۴، راد، ۱، ۴۵۸)

[1] شناسی تیکن، اسلامی تملار، سلجوقلی الاشتر ملار ورگیسی، ج ۴، ص ۱۵۵ (انقرہ ۱۹۷۵ء)

۵۔ اتگہ: (م، ت)، "اتا یا دائی کا شوہر" (فیروز ص ۶۲)

۶۔ آتو یا آتون: (ت) "استانی، معلمہ، جو لڑکیوں کو لکھنا، سینا، پرونا سکھاتی ہے۔" (آ ص ۱۰۸)

۷۔ اجاغ: (ت)، "چولہا، دیگدان" (فیروز ص ۶۴)

۸۔ اچا: (ت)، "باپ، دادا، نانا، دائی، بزرگ ملازم، ماما" (آ ص ۱۱۹)

۹۔ اچار: (ت)، کسی پھل یا ترکاری کا مرکب جسے تیل، سرکے یا پانی اور مسالے سے تیار کیا جائے۔" (فیروز ۶۹)

۱۰۔ اچک: (ت +ا) "چھین کرلے جانے والا، شوخ، تیز و طرار" (قال ۱۹) اور فعل کی حالت اچکانا۔ دفعتہً اٹھا لینا۔

۱۱۔ اردو: (ت)، "لشکر، فوجی کیمپ، لشکرگاہ، ۲۔ لشکری بولی اور ہندوستانی وہ زبان جو عربی، فارسی، ہندی، ترکی، انگریزی وغیرہ سے مل کر بنی ہے جسے اردوئے معلیٰ بھی کہتے ہیں۔" (آ ص ۱۴۲) اردو بازار، "صدر بازار" "اردو بیگی" = تیموریوں کے دربار میں پہرہ دار عورت۔ (میرا خیال ہے کہ اُسے عورت نہیں مرد ہونا چاہیے کیونکہ "ی" یہاں تانیث نہیں اضافی ہے)

۱۲۔ ارمغان: (ت)، "تحفہ، ہدیہ، سوغات، نئی چیز"

اتا اور اکہ سے مل کر یہ لفظ بنا ہے۔ اتا = باپ + اکہ (م)، = چچا، بڑا بھائی، وہ چچا جو باپ کی جگہ لے۔" اکہ" بہن کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (بابرنامہ ص ۵۷۹)

قاتون (قادین)، "خاتون، بیگم" (دت، ۱، ۱۲۸)" ایک دیندار آدمی کی بیوی، ملکہ، بیگم" (راد، ۱، ۶۴۲) خاتون اور آتون بھی اسی لفظ کی شکلیں ہیں۔)

اوجاق "چولہا" اس کی پرانی شکل "اوچاغ" تھی (دت، ۱، ۶۷)

اچا: "ماں، بوڑھی عورت، بڑی بہن یا خاندان کی کوئی بزرگ عورت یا مرد" (دت، ۱، ۵۸ اور شی ص ۵)

آچار: "وہ ترشی جو بھوک کھولنے کے لیے کھائی جاتی ہو۔" (دیورفر II، ۲۷۴)

اوچمک: "ایک پرندے کی طرح لپکنا، اڑنا" (کلاؤ ص ۱۹ اور دت، ۱، ص ۱۶۳)

اردو: ۱۔ مرکز حکومت، دارالخلافہ یا چھاؤنی۔ ۲۔ بادشاہ کا محل یا وہ شہر یا خیمہ جہاں بادشاہ مقیم ہوتا ہے۔ ۳۔ لشکرگاہ۔ ۴۔ حرم، محل سلاطین۔ ۵۔ سردار، بیگ کی رعایا یا اس کا ملک ۶۔ ملک کی ساری فوج (تفصیلات کے لیے دیکھیے میرا مقالہ: "لفظ اردو کا مطلب اور تاریخی پس منظر" اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان، جولائی ۱۹۸۷ء خدا بخش لائبریری جرنل، شمارہ ۴۶ ص ۰۰۰)

ارمغان "تحفہ، ہدیہ، سفر سے لوٹنے پر لایا گیا تحفہ"

(آص ۱۸۱۴ لیکن یہ لفظ اف، نہیں ہے۔)

(دت ۱/ ۱۴۰ اور کلاؤ ۲۳۲)۔

۱۳۔ آش: (ت ف) "حریرہ، شوربا، رقیق غذا" (فیروز ص ۲۱)

آش: "قربانی کے دن دیے جانے والی دعوت، وہ حیوان جو قربانی کے لیے تیار کیا جائے، غذا، پلاؤ وغیرہ (او یغور ۲۳، ش س ۱۳، کلاؤ ۲۶) ج ت میں پکا ہوا کھانا۔

۱۴۔ اشلک: (ت) "تہمت، بہتان، یہ لفظ در اصل "اشلق" تھا جسے بیگمات قلعہ نے "اشلک" بنالیا۔ (آص ۱، ۱۷۵)

اشاقلق: "غیبت، بہتان" (اشاق = غیبت وراشاقلامق = غیبت کرنا) (دت ۱/ ۱۲۲ اور کلاؤ ص ۲۵۹)

۱۵۔ آغا: (م ت) "۱۔ آقا، صاحب ۲۔ بڑا بھائی ۳۔ حاکم، آفسر (فیروز ۲۲۔ ۲۴)

آغا (آقا اور آکا): "بڑا بھائی، امیر آدمی، گاؤں کا مالک، صاحب خانہ" (او یغور ۶، ج ت میں بہت استعمال ہوتا ہے ہو سکتا ہے کہ منگولی میں ترکی کے فعل "اغمق" = اوپر لے جانا یا بڑھانا" سے لیا گیا ہو۔)

۱۶۔ آل: (ت) "ایک درخت کا نام ہے جس کی جڑ میں سے سرخ رنگ نکلتا ہے۔ لال رنگ" (آص ۱، ۲۰۹)

آل: "سرخ رنگ" (کلاؤ ص ۱۲۰)

۱۷۔ اُلاغ: (ت) "چھوٹی کشتی، ڈاک کا گھوڑا، خریار کش" (فیروز ۱۰۶) فیروز نے (ف) اور آص نے (ع) دکھایا ہے۔

اُلاغ: "زنجیر، خط، رابطہ، بارگیر، پانی کا منبع، تاؤ، وہ گھوڑا جسکو ایک قاصد لیکر ایک ایسے مقام تک جاتا ہے جہاں پر ایک اور قاصد تیار ملتا ہے۔" (ش س ۳۸، دت ۱، ۱۲۲ اور کلاؤ ۱۳۶)۔

۱۸۔ التمغا: (ت) "سرخ مہر (آل = سرخ + تمغہ = مہر) فرمان بادشاہ، مہر شاہی، انعامی عطا شدہ جاگیر کی سند" (آص ۱، ۲۰۹)

التمغا: "در اصل وہ وثیقہ جو بادشاہ کی طرف سے سرخ مہر کے ساتھ تیار کیا گیا ہو، وہ زمین جو بادشاہ کی طرف سے ہمیشہ کیلئے بخشی گئی ہو یا اس کا وثیقہ" (بائیور ۱، ۴۴۲) (ج ت میں استعمال نہیں ہوتا۔ یلغار صحیح شکل ہے جس کا مطلب یہاں آگے چل کر دیا جائے گا۔

۱۹۔ الغار (ت ا) "بہت، بافراط، کثرت سے" (یہ لفظ ترکی ہے "الغار" = ڈبل کورج اردو میں عورتیں بہتات کے معنی میں استعمال کرتی ہیں۔

۴۰۔ الاغوچی: "وہ شخص جو امانت میں بے ایمانی کرے" (اوتو ۲۲۴) "الاغوچی کرنا" اس کا مصدر ہے

اس لفظ کا سراغ جدید ترکی میں نہ مل سکا۔

۴۱۔ اُگش: (ت) "امیروں کا پس خوردہ، کسی بزرگ یا معزز آدمی کا جوٹھا کھانا، آگے کا اُٹھا کھانا" (آ ص ۱، ۲۱۵)

الش: "کسی خان یا بادشاہ کا جوٹھا کھانا جو تحفہ کے ... پر کسی سپاہ سالار کو دیا جاتا ہے جس نے دشمن ... کر بہادری دکھائی ہو" (راد ص ۱، ۱۸۵۳) ... کا اصلی مطلب "ایک حصہ" ... والا ہے (کلاؤ ... ص ...)

۴۲۔ اتّا: (ت) "دایہ، دودھ پلانے والی عورت" اصل میں اتا بمعنی مادر تھا (آ ص ۱، ص ۳۳۳)

اتا: "ماں، مادر" (اویغور ۱۴) "ایک عورت یا ... جو بچہ رکھتا ہو" (ت ص ۳۸)

۴۳۔ اولما: (ت) ترکی اولمہ لغوی معنی پوست کشیدہ خواہ انسان کا ہو خواہ حیوان کا مگر گرم پانی سے جلا کیا ہوا۔ اصطلاحی معنی وہ قیمہ جو انتڑیوں میں بھر کر پکاتے ہیں۔ اولما کرنا: قیمہ قیمہ کرنا، ٹکڑے ٹکڑے کرنا" (فیروز ۱۳۳ اور آ ص ۱، ۱۳۳)

اولما: "ٹکڑے ٹکڑے کرنا، کھُلنا" (کلاؤ ...) ترکی میں اولمہ بھی ہے جس کا مطلب ہے "... کو گرم پانی میں ڈال کر اس کے بال ... کو کھینچنا" (ت ۱۱۱، ...) "کھینچ کر اُکھاڑنا"۔

۴۴۔ ایاغ: (ت) "پیالہ، جام، ساغر" (فیروز ۱۳۵)

ایاق: "ساغر" (اویغور ۲۰) "پیالہ، جام شراب" (ش ص ۴۵، ت ۱۰۱، ۲۷ اور III ۲۷۲)

۴۵۔ ایبک: (ت) غلام، قاصد، بردہ، بت معشوق۔ (فیروز ص ۱۳۵)

ایبک: "آی: چاند + بیک" (آن ۱، ۱۴۱۵) بیگ اور بیک میں پرانی ترکی میں فرق تھا۔ بیک: "منصب ... بڑا" (کلاؤ ۳۲۲) اور بیگ (دیکھیے یہاں ...) میں اور بھی اختصار سے "بے" ہوگیا ہے۔ پرانی ... میں ایبک کا مطلب "چاند دیوتا" بھی تھا۔ بے ... بیگ کا مطلب "مسٹر" ہے۔

۴۶۔ اِلتُتمش: التمش، (ت) "سلطان شمس الدین کا لقب۔

اِلتُتمش: "اِل: ملک، لوگ، رعایا" (کلاؤ ۱۲...) تُتمش: "پکڑنے والا، ضبط کرنے والا اور اس کا مص...

۲۷۔ ایلچی: (ت) صحیح "یلچی"۔ ترکی زبان میں سفیر اور وکیل کو کہتے ہیں۔ "پیغامبر، قاصد، نامہ بر، جیسے ایلچی کو کیا زوال" (آ ص ۲۳۴)

۲۸۔ بابر: (ت) "شیر ببر" بادشاہ ظہیر الدین کا لقب (فیروز ۱۴۰) "ایک درندہ کا نام جو شیر کا دشمن خیال کیا جاتا ہے۔ کہری، ایک قسم کا بڑا شیر جو افریقہ کے بنوں میں پایا جاتا ہے۔" (آ ص ۲۶۳)

۲۹۔ باجی: (ت) "بہن، بڑی بہن، جی جی، چھوٹی عمر کی ماں"۔ (آ ص ۲۴۶)

۳۰۔ بارود: (ت۔ف) "گندھک، شورے اور کوئلے وغیرہ کا مرکب جس سے توپ وغیرہ چھوٹتے ہیں"۔ (فیروز ۱۵۵)

۳۱۔ بخشی یا بقشی: ت) "فوج کی تنخواہ تقسیم کرنے اور حساب کتاب رکھنے والا" اب چوکیدار کی تنخواہ بانٹنے والے کو کہتے ہیں۔ جنرل یا کمانڈر انچیف، میر سپاہ، سپہ سالار، سپہدار" (آ ص ۱، ۲۷۴)

۳۲۔ باورچی: (ت۔ف) "لغوی معنی اعتبار دار، خانساماں، طباخ، رکابدار" (آ ص ۱، ۳۴۱)

"تمغ"۔ پکڑنا یعنی ملک کا فاتح اس لیے لفظ "التمش" بالکل غلط ہے۔ خسرو دہلوی کے ایک پرانے مخطوطے میں التتمش ہی کی شکل ملتی ہے (ح ک م، سلیمانیہ کتب خانہ سی، استنبول ص ۱۶۱)

ایلچی: "سفیر یا قاصد" (کلاوُسنے خاص تفصیل [illegible] ہے ص ۱۲۹) اس کی اصل شکل "یلچی" ہے لیکن ایلچی کو کیا زوال؟ ضرب المثل ترکی میں موجود ہے۔

بابر: (ببر) "شیروں میں سب سے بڑا، پُر ہیبت جانور" (ت ل، ۱، ۵۶۵) نیز (یاقوت ص ۷۷) اور (راڈ، ۴، ص ۵۶۵)

باجی: "بڑی بہن، گھر میں کام کرنے والی عورت، نوکرانی"۔ (ت ل ۲، ۷۰، د س، ۲، ۷۵۴، ش س ۷۰)

بارود: "وہی مطلب ہے جو اردو میں ہے"۔ یہ لفظ فارسی بھی ہو سکتا ہے۔ زیور فر بھی مشکوک ہیں۔ (دیورز ۲، ۲۲۹)

باقشی: "سازندہ، عاشق" (ش س) "کلرک، حساب داں، ڈاکٹر" (ب ن ۵۸۵، اک ۲۵۲) اور (راڈ، ۴، ۱۴۴۶)

باور (ف) یہ "اعتبار کرنا" + چی (ترکی لاحقہ) سے یہ لفظ بنا ہے۔ ایجاد وسط ایشیا کے ترکوں کی ہے اور [illegible] کی فہرست میں بھی یہ لفظ آیا ہے لیکن [illegible] سے [illegible] میں استعمال [illegible]

۲۳۔ باولی: (ا م ۔ ت) "وہ چیز جس کے ذریعے پرندوں کو شکار پکڑنا سکھاتے ہیں، وہ پرندہ جس کو شکار کروانے کی تعلیم میں استعمال کیا جاتا ہے، فریب، جھانسا" (فیروز ۱۶۲، آصفیہ، ۱، ۳۶۲)

باولی۔ "تازہ اندام میں پالا ہوا، تعلیم یافتہ" (ش ی ۷۲) اور (راد، ۴، ۱۴۳۱) (ج ت) میں مستعمل نہیں ہے۔

۲۴۔ برما: (ت) "لکڑی میں چھید کرنے کا اوزار" (فیروز ۱۶۹)

بُرما "لکڑی میں چھید کرنے کا اوزار" (اوتو ۲۲۷، راط، ۴، ۱۸۲۴) مصدر ہے برمک "موڑنا"

۲۵۔ بقچہ: (ت ف) "جامہ پیچ، کپڑے رکھنے کی گٹھڑی، پٹلیا" (آصفیہ، ۱، ۳۹۹)

یہ لفظ بوغ (ت) = بنڈل، زین کیلئے تیار کردہ تھیلا" (دت، ۲، ۱۲۳ اور ۳، ۸-۱۲۷) "بنڈل بنانے کیلئے ایک مربعہ کی شکل میں کپڑا" (دت ۱۳۱۳) + چہ (ف) اسم تصغیر کا لاحقہ سے بنا ہے۔

۲۶۔ بکاول: (ت) "باورچی، خانساماں" (آصفیہ، ۱، ۴۰۰، فیروز ۱۸۷)

بکاول (بکاوول) "چشنی گیر، وہ شخص جو بادشاہ کے کھانوں کو چکھتا ہے" (ت ل، ۱، ۲۲۰) "دیوان کا رئیس، دیوان بیگی" (ع ش ۲۲۵) (ج ت) میں استعمال نہیں ہوتا۔

۲۷۔ بلبن: (ت) "ترکی بادشاہ غیاث الدین کا لقب"۔

بلابان (بالابان) "بہت بڑا" (ریڈ ۲۷۹) "وہ آدمی جو قوی نظر آتا ہو، بڑے سر والا، ایک باز جیسا پرندہ جس کا سر بڑا ہوتا ہے۔ (ت ل، ۱، ۶۴۱)

۲۸۔ بُلاق: (ت) "ایک زیور کا نام جو دیہاتی میں پہنتے ہیں، کانچ کا لمبوترا موتی جو بعض کی ناک میں عورتیں اس غرض سے ڈالتی ہیں کہ ہمارے اور زیوروں کی طرح یہ بھی نہ مرجائیں" (آصفیہ، ۱، ۴۰۷)

بُلاق: "فوارہ، ناک کا پردہ یا وہ زیور جو ناک کے پردے پر لگایا جاتا ہے" (اوتو ۲۲۸) اس لفظ کے بارے میں کوئی زیادہ سراغ نہیں مل سکا۔

۳۹۔ بوتہ: (ت) "اونٹ کا بچہ، بھدے اور بھونڈی شکل کے آدمی پر بھی اسی کی پھبتی کستے ہیں۔" (آمں، ۱، ۱۹۱م)

بوتا: "بچہ، چھوٹا بچہ" (ش س ۷۶) "اونٹ کا بچہ" (کلاؤ ۲۹۹) اردو کا لفظ "بوتا" اسی سے لیا گیا ہوگا چونکہ ترکمانی میں "بوتا" کی شکل ملتی ہے۔ ترکی میں بھونڈی شکل کے آدمی کو بھی "بودور یا بوتور" کہتے ہیں۔

۴۰۔ بوز: (ت) "گھوڑا خصوصاً سفید اور بھورا گھوڑا۔" (ق ل ۵۰)

بوز: "سفید گھوڑا" خچر یا گدھا" (کلاؤ ۲۹۹) "سفید، سرخ یا بھورا گھوڑا" (ش س، ۲، ۵۰۰، ۷)

۴۱۔ بوزہ: (ت) "جو، چاول یا کسی اور غلے سے بنائی ہوئی شراب۔" (ق ل ۵۰)

بوزہ: "کسی غلے یا جو میں پانی ڈال کر ذرا گاڑھا سا محلول بنانا اور خمیر دے کر کھٹا پن دینا۔" یہ شراب نہیں ہے۔ ترکی میں سردیوں میں رات کو بیچتے ہیں جیسے کہ ہندستان میں کلونجی کا رواج ہے ویسے ہی ترکی میں بوزے کا۔

۴۲۔ بوغما: (ت) "ہرزہ، بیہودہ، گھوڑے کے ایک مرض کا نام اس کے تمام جسم سے پسینہ ٹپکنے لگتا ہے، گلمھڑ۔" (آمں، ۱، ۲۲۲م)

بوغمہ: "گلمھڑ، گلے کو گھونٹنے والی بیماری" (ش س ۷، ۲) اس کا فعل ہے بوغمق یہ "گلے کو گھونٹنا۔" (م ص ۲۱)

۴۳۔ بہادر: (ت) "موتی کی سی قیمت رکھنے والا، سورما، جری، جوانمرد، جنگی، دلیر، ایک خطاب جو امرائے شاہی یا اعلیٰ ملازمان گورنمنٹ کو دیا جاتا ہے۔ لڑائی کا مرغ۔" (آمں، ۱، ۵۱۱م)

بہادر (پرانی شکل) "باغاتور": "تھشا (ترکی قوم) میں اسم خاص، جنگجو، وہ آدمی جو جنگوں میں لڑائی کرتے کرتے نامور ہو جاتا ہے، غازی" (کلاؤ ۳۱۲، ت س ۹)

۴۴۔ بیرق: (ت)، "وہ جھنڈا جو دشمن سے لی ہوئی زمین پر گاڑا جاتا ہے۔" (اد لو ۳۴۹) "فوج کا جھنڈا، نشان، علم، عوام 'بیرکھ' کہتے ہیں۔" (آمں، ۱، ۴۶۴م)

بائراق: "یہ ترکی کے پرانے لفظ 'باطراق' 'وہ چیز جو گاڑی جائے۔' سے ماخوذ ہے (کلاؤ ۳۰۷، ابا ت) میں بھی "بائراق" ہے (م ص ۲۲)

۴۵۔ بیگ: (ت) "سردار، امیر، شہزادہ مغلوں کا ایک خطابی لفظ جو ان کے نام کے آخر میں

بیگ (بے) "شہزادہ، ایک قبیلے کا سردار، شوہر، شادی شدہ آدمی" (دت فہرست ۷۸) "آدمی، شوہر۔"

لگایا جاتا ہے۔" (آص، ۱، ۶۷۰م)

(کلاوز ۲۲۲ اور راوینیور ۳۷) "امیر آدمی، کسی حکومت کا سردار یا نواب۔" (ت س ۱۰۰)

۴۶۔ بیگم: (ت) "بیگ کی تانیث، خاتون، بانو" (فیروز ۲۱۵)

بیگم۔ "لیڈی، خاتون۔" (ش س ۹۳) (ت ت میں) بیگ کا بہت رواج ہے لیکن بیگم استعمال نہیں ہوتا۔

۴۷۔ پاشا: (ت مف) "عامل، حاکم، لارڈ، ترکوں کا سردار، ترکی سرداروں کا لقب۔" (آص، ۱، ۷۷۴م)

پاشا: "باشا = "سر" + آغا = "صاحب" = سردار، "جنرل، ملٹری کمانڈر۔" (ت س ۹۴۱)

۴۸۔ تگا (اتگہ، ت) "شوہر دایہ، اَنّا کا خاوند، دودھ پلانے والی کا خصم، یہ لفظ اصل میں بزبان ترکی "اتاگاہ" تھا کیونکہ ترکی میں اتا = پدر گاہ = قائم مقام یعنی وہ شخص جو باپ کا قائم مقام ہو، آتگہ اس کا مخفف ہے (آص، ۱، ۱۹۱)

تاغہ: "ماموں" (ش س ۱۰۱) "ماں کا بھائی" (کلاوز تغائی ص ۴۷۴)

۴۹۔ تپک: (ت) "توپ کی تصغیر" (آص، ۱، ۵۹۲) ہو سکتا ہے کہ تفنگ بھی اسی لفظ کی بگڑی ہوئی شکل ہو۔

تیک: "ایک گولہ یا توپ" (کلاوز ۴۳۰) "وہ نالی جس میں مٹی کی گولیاں بھر کر سانس مارنے کے ساتھ پھینکی جائیں" (خطائی ۲۱۴ اور ت س ۷۴۹)

۵۰۔ تپہ: (ت+ا) "ٹیلا" (ق ل ۸۹) اونچی جگہ" (فیروز ۳۷۶)

تپہ: "ایک ٹیلا، چٹان" دراصل اس لفظ کا مطلب ہے "پہاڑ کی چوٹی" (کلاوز ۴۳۰) "اونچی پہاڑی" (خطائی ۲۱۸)

۵۱۔ تتق: (ت) "پردہ، خیمہ، سراپردہ" (فیروز ۳۰۹)

تتق: "ابر آلود آسمان، گونگا بے زبان، پردوں میں گھرا ہوا، دروازوں کے سامنے رکھا ہوا پردہ یا سکرین" (کلاوز ۴۵۳) "عورتوں کا پردہ" (ہی ت ۲۱۵)۔

۵۲۔ تزک: (ت) "انتظام، ترتیب، قاعدہ، ضابطہ، لشکر، ضابطہ مجلس، شان و شوکت، روزنامچہ شاہی" (فیروز ۳۲۴)

تزک: "انتظام، مناسب، درست، بہت اچھا اور حیرت انگیز" (ش س ۱۱۹) "انتظام" (ا ج ت اور ب ن ۶۵۹ اور ۳۲۹) اس کا مصدر ہے تزک: "کسی چیز کو نظام دینا" (کلاوز ۵۰۲)

۵۳۔ تمغا (تمغہ) (ت)، "محصول چنگی، فرمانِ شاہی، عزت کا نشان، سند، جاگیر کی سند، انعامی زمین، داغ، چرکا، سکہ، میڈل، ڈپلوما، عوام اسکو "تمغا" کہتے ہیں، "تمغا بٹھانا" = رعب جمانا" (فیروز، ۳۴۵)

تمغا (طامغہ یا دامغہ): "ایک بادشاہ یا شہنشاہ کی مہر" (دت فہرست، ۵۶۷) "حیوانوں پر لگائے ہوئے نشان، ایسے نشان لگانے کا اوزار، مہر لگانے کا اوزار" (کلاؤ، ۵۰۵، اش س ۴۳۹)

۵۴۔ تکہ: (ت)، "بکری" (داؤ، ۳۰۹)

تکہ: "بکری کا نر" (اش س ۳۳۴) "بکری، ترکمانوں کا ایک قبیلہ" (اش س ۱۱۰ اور کلاؤ ۴۷۷)

ووگمہ: اش - تفصیلات کے لیے دیکھیے (کلاؤ ۴۸۲)

۵۵۔ تکمہ: (ت)، لغوی معنی ہیں "گھنڈی مگر اردو میں حلقہ گریبان وغیرہ" (آصف، ۶۱۷)

۵۶۔ تلاش (ت)، "جستجو، سعی، کوشش، تحقیقات" (فیروز ۳۴۹)

تلاش: یہ لفظ ترکی "تالاء جھگڑا" سے ماخوذ ہے یعنی "جھگڑا، جنگ، ہیجان وغیرہ لیکن "جستجو" کا مطلب ترکی میں نہیں ہے (دیورفر، ۲، ۱۰۴۱، ۵۴)۔

۵۷۔ تمن: (ت)، "دس ہزار، رسالہ، پلٹن، سواروں کا دستہ، سو سو آدمیوں کا فریق جس میں ایک نشان، باجہ اور عہدہ دار ہوتا ہے۔ یہ تعداد دہلی کے شاہانِ مغلیہ میں رائج تھی، ایک سکہ طلا جو اب ساڑھے چار روپیہ کا ہوتا ہے پہلے بیس روپے کا ہوتا تھا" (آصف، ۶۲۷)

تمن: "بڑی تعداد" (تمن تمن دت فہرست، ۶۷۰) "دس ہزار، بڑی تعداد میں" (کلاؤ ۵۰۷) "بڑی بھاری ڈویژن اور دس ہزار سپاہی" (جت،

۵۸۔ توشک (ت ف)، "روئی دار بستر، گدا، نہالچہ، گدڑی، بچھونا، روئی دار فرش پلنگ، سوزنی" (آصف، ۱، ۶۳۸)

تشک: "روئی دار بستر" (دت، ۱، ۲۸۷) "بستر" (کلاؤ ۵۶۳) فارسی میں ترکی سے آیا ہے (دیورفر، ۲، ۹۶۰)

۵۹۔ تورہ (ت)، "شرع، سنت، طریق، قانون اسلام، دستور العمل، مختلف کھانوں کا ایک خوان یا کئی خوان جو امیروں میں شادی وغیرہ کے موقعہ پر

تورہ (ترو یہ قانون، دستور العمل" (کلاؤ ۵۳، نظام، رسم و رواج" (دت فہرست ۶۴۷)

کھوروں پر پیشتر تقسیم کے جاتے ہیں (آمں ۱، ۲۴۴)

۶۰۔ جنزات (ت): "دہی" (ق ل ۹۳)

یوغرت: "دہی" (کلاؤ ۹۰۵ اور ج ت)

۶۱۔ جیجی (جی جی) (ت): "بہن، ہمشیرہ، پستان، چھاتی" (آمں ۱، ۸۶)

جی جی "خوبصورت، اچھی چیز، پیاری (بچوں کی زبان) جیسے جی جی انّا = پیاری ماں۔

۶۲۔ چابک (ت، ف): "کوڑا، تازیانہ، ہنٹر" (فیروز ۶۷۴) "چست، چالاک" (آمں ۲، ۸۸)

چابک: "کوڑا، تازیانہ" (کلاؤ ۳۹۵) "چاوغ" (ت، ۳۷۵) "تیز رفتار، جلدی" (ج ت)

۶۳۔ چادر (ت، ف): "ردا، بڑا اور چوڑا دوپٹہ" (آمں ۲، ۸۸)

چادر (چاتر): "ہوسکتا ہے یہ لفظ سنسکرت "چھتر" سے ترکی میں آیا ہو (کلاؤ ۴۰۳) لیکن ترکی میں چاتمق = "خیمہ لگانا، خیمہ کے اردگرد پردہ لگانا" کی شکل بھی ہے اسلیے ہوسکتا ہے یہ لفظ ترکی ہی ہو۔ (دیورفر ۳، ۱۶)

۶۴۔ چاق (ت): "تندرست، چست و چالاک، مضبوط، ہوشیار" (آمں ۲، ۹۲)

چاق: "ٹھیک بالکل صحیح، ٹھیک تعداد، ٹھیک وقت پر، ایک دم حرکت میں آجانا یا کسی چیز کو چلانا (کلاؤ ۴۰۵، ۴۰۴)

۶۵۔ چاقو (م ت): "قلم تراش، کاردِ خورد" (آمں ۲، ۹۲)

"قلم تراش، چاکو" (دیورفر ۱، ۴۱۷) ج ت میں "چاقی" ہے۔

۶۶۔ چاوش (ت): "چوبدار، عصا بردار، نقیب" (فیروز ۴۷۳)

چاوش: "محافظ، حوالدار، وہ شخص جو جنگ کے وقت سپاہیوں کو قطار اور نظام میں رکھتا ہے اور ان پر ظلم نہیں ہونے دیتا۔" (د ت فہرست ۱۲۹)

۶۷۔ چپلقش (ت): "لڑائی جھگڑا، ٹنٹا، رد و بدل، بکبک، جگہ کی تنگی، بھیڑ بھاڑ" (آمں ۲، ۱۰۹)

چپقالیش: "بھیڑ بھاڑ، ہلچل، غالب ہونا، لوگوں کا گروہ" (دش س ۱۵۹) اس کا فعل "چاپمق" ہے یعنی حملہ آور ہونا، جلدی کرنا، زخمی کرنا وغیرہ (کلاؤ ۳۹۴)

۶۸۔ چلم (ت، ف): "غماز، کترا، سخن چین، کنکر جو چلم میں رکھ کر اوپر سے تمباکو رکھا جاتا ہے۔" (آمں ۲، ۱۱۱)

چوغول (چغل): "غیبت خور، شکایت کرنے والا، بولنے والا" (دش س ۱۵۷) "کسی کو تہمت لگانا" چوغولچی = چغل خور، چوغولامق = غیبت کرنا (ت ل ۲، ۴۴۹)

۶۹۔ چِق (ت،۱): "چک، بانس یا سرکنڈے کی تیلیوں کا پردہ" (آص،۲، ۱۱۱)

چِقا: "وہی مطلب جو اردو میں ہے" (دت،۲، ۲۰۶ اور کلاؤ ۴۰۴)

۷۰۔ چقماق (ت): "ایک پتھر جس میں سے آگ نکلتی ہے" (فیروز ۴۸۱)

چقماق: "آگ لگانے کیلئے کوئی اوزار" (دت، فہرست ۱۲۲)

۷۱۔ چقر (ت،۱): "جوہر، چشمہ، ڈابر، تالاب" (آص،۲، ۱۱۱ اور فیروز ۴۸۰)

چوقور: "خندق، گڑھا، کھڈ" (ادویتیر ۶۰)

۷۲۔ چقندر (ت): "ایک ترکاری جو شلغم سے مشابہ اور نہایت سرخ ہوتی ہے" (فیروز ۴۸۴)

چوکندر (چوغندر): "شلغم، سرخ شلغم، گاجر وغیرہ" (دش ص ۵۲۲، دس،۲، ۲۰۷ اور دیورفر،۲، ۱۰۸۶)

۷۳۔ چلم (ت،ف): "سرقلیان" (آص،۲، ۱۱۶)

چلم (چیلیم): "وہی مطلب جو اردو میں ہے" (دیورفر لفظ نمبر ۱۱۱) اس لفظ کا ترکی ہونا ذرا مشکل نظر آتا ہے۔

۷۴۔ چلمچی (ت): "طشت، ہاتھ منہ دھونے کا برتن جس کے سرپوش میں چھید ہوتے ہیں" (سلفچی اور چلپچی آص،۲، ۱۱۰)

چیلاپچی: "وہی مطلب" (راڈ،۲، ۲۰۵۰) ترکی میں "سلیپچہ" کی شکل بھی ملتی ہے (دس،۱، ۳۳۴ اور (ادوتو ۴۳)

۷۵۔ چمچہ (ت): "کوئی اور تیل چیز پینے کا آلہ، ڈوئی، کفچہ" (فیروز ۴۹۲)

چومچہ: "کفچہ، کفگیر" (کلاؤ ۴۲۲) "لکڑی کا بنا ہوا چمچہ" (دت، فہرست ۱۵۱)

۷۶۔ چوغہ (ت،ف): "عبا، لبادہ، جبہ، ایک قسم کا مہذب لباس" (آص،۲، ۱۲۹)

چوقا، چوخا، چوغا، چوغہ: "ایک بھاری سا کپڑا جس سے جبہ بنایا جاتا ہے" (تی ت ۵۹) "جبہ جو کپڑوں کے اوپر پہنا جاتا ہے" (ق ب ۱۲۰) کلاؤ کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے یہ پرانی فارسی ہو لیکن یہ غلط ہے کیونکہ ترکی میں ایک فعل ہے "چوغمک" یعنی پہننا، کفن میں لپیٹنا۔ دیورفر بھی اسے ترکی قبول کرتے ہیں۔ (ص ۱۱۱، لفظ نمبر ۱۳۲)

۷۷۔ چوماق (ت): "ڈنڈا، لاٹھی" (میرامن دہلوی، باغ و بہار، ۱۹۷۶ء، ۲۵۱)

چوماق: "لاٹھی، ڈنڈا" (دت، فہرست ۱۵۷)
(ح ت "لاٹھی")

۷۸۔ چیچک (ت): "سیتلا، ٹھنڈی ماتا" (آص،۲، ۱۵۰)

چیچک: "ٹھنڈی ماتا" (کلاؤ ۴۰۰ اور دیورفر،۲، ۲۰۲)

اصل میں اس کا مطلب پھول ہے۔

۷۹۔ چیخ (ت+ا)، "شور و فریاد، زور کی آواز۔"
(آصفیہ، ۲، ۱۵۰)

چیخ "بلند آواز، فریاد و شور" (سامی، ۵۲۷)
(ج ت "چیغلک۔" فریاد و فغان")

۸۰۔ خاتون (ت)، "امیر گھر کی عورت کا لقب، امیر زادی، شہزادی، لیڈی، ملکہ، نواب زادی، بیوی"
(آصفیہ، ۲، ۱۷۳)

قاتون "خاتون، عورت، افراسیاب کی لڑکی کا نام" (دت، فہرست، ۱۷۲) ج ت میں "خاتون" اور "قادن" رواج میں ہے۔

۸۱۔ خاقان (ت) "سلطان، بڑا بادشاہ، چین اور ترکستان کے سابق بادشاہوں کا لقب"
(فیروز، ۵۴۱)

خاقان (کاغان) "ایک قبیلے یا لوگوں کا خود مختار بادشاہ، سلطان، شہنشاہ" (ت س ۱۰۸۱ اور کلاؤ ۶۱۱)

۸۲۔ خان (ت) سردار، رئیس، ہر امیر رئیس کا لقب پٹھانوں کا لقب" (فیروز، ۵۴۲) پہلے یہ شاہان تاتار کا لقب تھا۔ مگر اب ہر ایک سردار رئیس کا لقب ہو گیا، ڈوم اور خانساماں کا خطاب"
(آصفیہ، ۲، ۱۷۷)

خان "پہلے یہ لقب "کاغان" کا ہم معنی تھا بعد میں خان بادشاہ سے چھوٹے حکمران کا لقب بن گیا" ترکوں کا سب سے بڑا حکمران، شہنشاہ" (کلاؤ، ۶۳) "افراسیاب کی اولاد کو دیا گیا خطاب"۔ (دت، فہرست، ۲۱۰) "بادشاہ، ایک قوم کا حکمران، ایک گھر کا حکمران" (ش س ۱۶۶) "بادشاہ سے ملحق ایک چھوٹا حکمران، عثمانی سلاطین کا نام" (ت س ۳۲۲)

۸۳۔ خچر (ت)، "وہ دو غلا جانور جو گدھے اور گھوڑی کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے (فیروز ۵۲۵)

قاطر" ترکی مطلب جو اردو میں ہے" (کلاؤ، ۶۰۴) ترکی سے منگولی میں "خچر" ہو گیا ہے۔

۸۴۔ داغ (ت، مف)، "دھبا، نشان، عیب، کلنک، جلا ہوا نشان، زخم، جراحت، رنج، صدمہ، رشک، حسد (آصفیہ، ۲، ۲۲۲) لوہے کو گرم کر کے جسم پر لگانا"۔ (فیروز، ۵۵۵ اور ک ۴۵۰)

داغ۔ "مویشی یا جانوروں پر لگایا گیا نشان، ایرانیوں میں چونکہ گھوڑوں کا غول نہیں ہوتا اس لیے یہ لفظ ترکی ہے"۔ (دت، ۳، ۱۵۳) گرم لوہے سے لگایا ہوا نشان یا دھبہ" (ش س ۱۶۸) ظاہر ہے اردو میں "زخم، درد وغیرہ" کا مطلب اسی سے لیا گیا ہے

۸۵۔ دادا (ت+ا)، "باپ کا باپ، جد، بنگالی میں

دادہ (دادا) "باپ کا باپ، ماں کا باپ" (ش س ۱۶۹)

بڑے بھائی کو دادا کہتے ہیں اور جاٹ گوجر بڑھوں کو بڑی عمر والا، بیگمات قلعہ کے نزدیک دادا حضرت بلکہ دادی جان، رابع (آصی، ۲، ۲۰۰) "نوکرانی" (اور لو، ۲۳۲)

"باپ" (دت، ۲، ۲۲۱) اور (کلاؤ ۵۱۴، دیور فر، ۳، ۱۱۷۹) "چاچا" (رادم، ۲، ۱۶۴۰)

۸۶۔ داروغہ (ت+م) "محافظ، نگران، کسی کام کا انتظام کرنے والا، کوتوال، تھانہ دار، کسی جماعت کا سردار، سپاہیوں کا افسر (آصی، ۲، ۱۰۲ اور راک ۱۸)

داروغہ "ترکستان میں ایک رتبہ کا نام ہے۔ کشتی کا کپتان، املاکدار یعنی وہ شخص جو حکومت کے نام ٹیکس اکٹھا کرتا ہے۔" (ش س ۱۶۸) ہو سکتا ہے کہ ترکی کے لفظ دوراغ۔ "پہرہ دار" سے منگولی میں آیا ہے۔

۸۷۔ دلمہ (ت)، "ایک قسم کا سالن جو قیمہ اور چیز، بیگن یا گاجروں وغیرہ کے اندر بھر کر پکاتے ہیں۔" (آصی، ۲، ۲۶۴)

دلمہ (دولمہ) "ترکاری (بیگن، مرچیں، وغیرہ) میں قیمہ اور چاول بھر کر تیار کی ہوئی ڈش" (ج ت) یہ ترکی کے مصدر دولد رمق "بھرنا" سے ماخذ اسم ہے۔

۸۸۔ ساچق (ت)، "برات سے ایک روز پہلے کی رسم جس میں دولہا کے یہاں سے دلہن کے لیے مٹھائی، نقل، مصری، میوہ کی تھالیاں، مہندی، تیل، جوڑا، عطر اور پان کے بیڑے لے کر جاتے ہیں اسی روز دلہن کو مہندی لگائی جاتی ہے۔" (آصی، ۳، ۴)

ساچق (ساچوق، ساچقلق) "برات کے دن دلہن کو بھیجے جانے والے تحفے۔" (م ات ۱۷۶) "دلہے کے گھر سے دلہن کے گھر بھیجے جانے والے تحفے، شادی کے دن سونا پیسا اور کھانے دیے جانے کی رسومات۔" (کلاؤ ۷۹۶)۔ "سوٹ اور جوڑے" (ش س ۱۰۷) ج ت میں اب استعمال نہیں ہوتا۔

۸۹۔ سراغ (ت)، "کھوج، پاؤں کا نشان، پتہ، تلاش" (فیروز ۷۲۲)

سوراغ (سرغ، سوراق) "گم شدہ چیز کو تلاش کرنا" (دت، ۱، ۳۷۴) "معلومات حاصل کرنا، تحقیقات" (ش س ۱۸۸) اور کلاؤ ۸۴۸)

۹۰۔ سرکہ (ت)، "گڑ کے شربت خواہ گنے خواہ انگور کے رس کو جو سڑا کے خمار اٹھا لیتے ہیں وہ سرکہ کہلاتا ہے (آصی، ۳، ۱۷۱)

سرکہ "ترش شربت جو انگور سے بنایا جاتا ہے۔" (کلاؤ ۸۵۰، اولو ۳۲۳، دیور فر ۲، ۱۲۴۰)

۹۱۔ سرمہ (ت) "انجن، کحل، بہت باریک (فیروز ۲۵۱)

سرمہ۔ "وہ چیز جو آنکھوں پر لگائی جائے، کحل" (کلاؤ ۸۵۲) ترکی میں "سرمک" لگانا یا پھیرنا سے اسم ہے۔

۹۲۔ سنگین (ت ـ ف) "ایک نوک دار سہ پہلو ہتیار جو اکثر پہرے کے وقت بندوق پر چڑھا لیتے ہیں یا سرنیزہ" (آصفیہ، ۳، ۱۱۲ اور ۲۳۳)

سونگو۔ "ایک نوکدار سہ پہلو ہتیار جو بندوق کے سامنے لگایا جاتا ہے۔" (کلاؤ ۸۲۹)

۹۳۔ تپانچہ (ت) "تھپڑ، کھلے ہاتھ کی ضرب" (فیروز ۳۰۸)

طبانچہ۔ "تھپڑ" (نشانی ۸۰۵) "تھپڑ" (ای ات ۲۰۰) ج ت میں نہیں ملتا۔

۹۴۔ طغرا (ت) "خط پیچیدہ، وہ خط جس میں بادشاہ کا نام القاب فرمانوں کی پیشانی پر لکھا جاتا ہے، شاہی مہر، شاہی خطاب جو اجلاس کے کاغذات یا دیگر بادشاہی خط و کتابت میں درج ہو" (آصفیہ، ۳، ۲۴۶)

تغراغ (طغرا)۔ "بادشاہ کا فرمان اور اس کی مہر" (دت، ۱، ۲۶۲م) بادشاہ کی خاص علامت جو فرمانوں (قوانین و نشانات) پر لگائی جاتی ہے۔" (سامی ۸۸۴) اور (کلاؤ ۴۰)

۹۵۔ طوی (توی) (ت) "بکرے پر بجی ہوئی ایک قسم کی بیل جو دوپٹوں وغیرہ کے کنارے لگاتے ہیں" (فیروز ۲۵۰۔ آصفیہ ۱۰، ۶۴۰ اور ۲، ۲۵۸)

طوی "ایک بڑا خیمہ، ایک بڑا گروہ جو شادی وغیرہ کے لیے جمع ہو، شادی، دلہن کا جہیز" (کلاؤ ۵۶۰) اور (ریڈ ہاؤس، ۲، ۱۲۵۲)

۹۶۔ غول (ت) "انبوہ سپاہ، بھیڑ، ٹولا جیسے "آدمیوں کا غول"، کان، لشکر قلب، وہ فوج کا حصہ جس میں بادشاہ یا سالار رہے" (آصفیہ، ۳، ۲۱۸)

قول (غول) "سپاہیوں کا گروہ، بادشاہ یا سالار کا خاص گروہ" (دت ل، ۲، ۵۹۵) قول دراصل بازو کو کہتے ہیں اس لیے "قول اردو" = فوج کا بازو۔

۹۷۔ قاب (ت) "چینی کا بڑا طباق، صحنک، بڑی رکابی خوان" (آصفیہ، ۳، ۲۵۹)

قاب۔ "چمڑے کا بنا ہوا تھیلا یا مشک، بڑی رکابی" (دت، فہرست، ۲۶۲ اور کلاؤ ۵۷۲)

۹۸۔ قابو (ت) "فرصت، موقع، داؤ، قدرت، حکم اختیار، رسائی" (آصفیہ، ۳، ۲۶۰)۔

قاپو "فرصت، گھات" (ش س ۲۱۲) اس کا مصدر ہے "کاپمک" = "اڑانا، زور سے چھین لینا، داؤ لگانا" (دت، فہرست ۲۶۲)

۹۹۔ قاپوچیات(ت) "دربان، حاجب، کلمہ تحقیر، سفلہ، کمینہ، خودغرض، حرام زادہ" (آص، ۳، ۲۶۱)

قاپوچی۔ "قاپو = دروازہ سے ماخذ لفظ، قاپوچی = دربان" (کلاوُ ۵۸۲) گھر کا وہ نوکر جو دروازہ پر گھر دیکھ بھال کرکے آنے جانے والوں پر نظر رکھتا ہے۔ "(ت ت، ۲۹۰) قاپ نے والا چور، مال لے کر بھاگنے والا۔" "قاپمک = زور سے چھین لینا" (دت، ۲، ۵۰۰ اور کلاوُ ۵۸۰)

۱۰۰۔ قاش (کاش) (ت) "پھل کی ایک پھانک، پھل کا طولانی تراشا ہوا ٹکڑا، ابرو، بھویں" (آص، ۳، ۲۶۲)

قاش "دراصل ابرو اور مجازاً کسی چیز کا کنارہ" (دت، فہرست، ۲۷۶، کلاوُ ۶۶۹) ج ت میں "پھانک" کا مطلب نہیں ملتا۔

۱۰۱۔ قاز (ت ہف) "راج ہنس، کونج" (آص، ۳، ۲۶۲)

قاز "راج ہنس" (کلاوُ ۶۷۹ اور دت فہرست ۲۸۰)

۱۰۲۔ قاق (ت) "سوکھا ہوا گوشت جسے اہل ولایت بھون کر کھاتے ہیں، مجازاً دبلا پتلا آدمی" (آص، ۳، ۲۶۵)

قاق (کاک) "خشک کی ہوئی چیز یا پھل جیسے خوبانی اور آلو بخارہ" (دت فہرست، ۲۵۱) "سورج کی وجہ سے خشک شدہ پھل" (اشی ص ۲۰۰) "خشک میوہ، خشک گوشت" (ی ت ۱۲۲)

۱۰۳۔ قالین (ت) "غالیچہ، ایک قسم کا بچھونا، فرش پشمینہ" (آص، ۳، ۲۶۵)

قالی "ایک قسم کا مہنگا فرش، قالین" (شائق ۹۳۰ اوٹو ۲۳۴ اور دیورفر، ۲، ۴۵۷)

۱۰۴۔ قچی (ت) "انگور کی پٹاری، صندوقچہ" (آص، ۳، ۲۷۲، فیروز ۸۵۱)

قتی "ایک چھوٹا ڈھکن والا ڈبہ، ایک چھوٹا ڈبہ" (کلاوُ ۵۹۶، دیورفر، ۳، ۱۵۶۹)

۱۰۵۔ قدغن (ت) "تاکید، ممانعت، قید، ہنایت روک ٹوک، لغوی معنی اہتمام بادشاہانی، خبرداری" (آص، ۳، ۲۷۴، فیروز ۸۵۲)

قدغن "تعطیل، چھٹی، ممنوع، کام سے روکنا" (اشی ص ۲۲۰) (دیورفر، ۳، ۱۵۶۹) سنگلاخ میں قادا قان اور قادرغان کی شکلیں بھی ملتی ہیں (ص ۲۶۸)

۱۰۶۔ قراول (ت م) "بندوق کا شکاری، شکار انداز، بندوقچی، وہ فوج جو لڑائی کے واسطے جگہ مقرر کرنے کو آگے جائے، پہرے دار" (آص ۲۷۹) ہراول

قراول (قراغول، قرہ قول) "محافظ، پہرہ دار سپاہی" (سامی، ۱۰۶۷، اوٹو ۲۲۴) "گھومنے والا پہرہ دار، محافظ جو چوکی دیتا ہے۔ (قرہ = بری + قول = فوج، حصہ

بھی اسی کی شکل ہونی چاہیئے۔

آگے جانے والی فوج کا حصہ۔

۱۰۷۔ قراولطا (م ہ ت) "قراولوں کا پھُرا جس سے شکار کو ذبح کرتے ہیں، شکاری کا چاکو" (آ مں، ۲، ۲۸۷)

قراولی "شکار کے لیے تعقب، شکار" (اوٹو، ۲۳۲) ج ت میں استعمال نہیں ہوتا۔

۱۰۸۔ قرق (ت) "ضبطی، روک، ممانعت، بندش" (فیروز ۸۵۵)

قورق (قورغ) "کسی چیز کو محفوظ رکھنا، چراگاہ کو سلطان کے لیے وقف کرنا اور اس کی حفاظت کرنا۔" (کلاؤ، ۶۵۵) یہ قوروماق = "حفاظت کرنا" سے اسم ہے۔

۱۰۹۔ قرمساق (ت) "وہ شخص جو اپنی بیوی کو دوسرے کے حوالہ کرے، دیوث، بھڑوا، نالائق، ذلیل" (آ مں، ۲، ۳۸۱)

قورمساق "ذلیل، دیوث وغیرہ (ش س ۲۳۴) اور رادوٹ ۳۳۵) سنگلاخ نے بھی یہی املا دی ہے جس ۲۸۶۔

۱۱۰۔ قزاق (ت) "ڈاکو، لٹیرا، رہزن، قزقستان کا باشندہ" (فیروز ۸۵۶)

قزاق "خود مختار، رہزن" (راد، ۲، ۴ ۲۶) وسط ایشیا کی وہ قوم جو مویشی پالتی ہے۔ وہ مرد جو عورت پر پورا کنٹرول رکھتا ہو (ج ت)

۱۱۱۔ قزل (ت) "سرخ، لال" (فیروز ۸۵۶) اور قزل باش: "سرخ سر، شاہ اسمعیل صفوی کی فوج کا نام"۔

قزل۔ "سرخ رنگ، خون جیسا رنگ" (کلاؤ ۶۸۳)

۱۱۲۔ قشلاق (ت) "وہ گرم مقام جہاں بادشاہ اور امیر سردیوں کا موسم گذارتے ہیں" (فیروز ۸۵۸)

قشلاق "سردیوں کا موسم گذارنے کی جگہ" (د ت فہرست ۲۲۳ اور کلاؤ ۶۷۰) قش = "سردی کا موسم" + لاق = کی جگہ موسم گزارنے۔

۱۱۳۔ قلی (ت) "غلام، مزدور، بوجھ اٹھانے والا" (فیروز ۸۶۲)

قُل "غلام" (د ت فہرست، ۲۷۵) ج ت میں "قلی" کی شکل نہیں ملتی۔

۱۱۴۔ قمچی (ت) "کوڑا، تازیانہ، بید، پتلی اور لچکدار شاخ" (فیروز ۸۶۲)

قمچی۔ "تازیانہ" (اوینور ۲۶۲ اور د ت فہرست ۲۵۰، د کلاؤ ۶۲۶)

۱۱۵۔ قنات (ت) وہ کپڑے کی دیوار جو خیمے کے چاروں طرف لگاتے ہیں، کپڑے کا بنا ہوا پردہ۔" (فیروز ۸۶۲)

قنات "ایک بڑے خیمے کا پردہ" (ق س ۲۹۶) دیگر تفصیلات کے لیے دیکھیے (رابور ۲، ۴۲۴ اور کلاؤ ۶۰۲)

۱۱۶۔ قور (ت) "ہتھیار، سلاح، عمامے کا ہاتھی کپڑے کے حاشیہ پر لگایا جانے والا فیتہ" (فیروز ۸۶۳)

قور کمر بند، پیٹی، شادی کے دن ایک دائرے کی شکل میں بیٹھنا، سلاح" (ش س ۲۳۳) "کمر بند جو مرد پہنتے ہیں خیمے کے ارد گرد کی کمر" (کلاؤ ۲۴۲) قورچی یہ سلاح دار (اک ۱۱۶، ہ ت ۱۳۰) قوربیگی = "سلاح دار مرد (عورت نہیں)

۱۱۷۔ قورمہ (قورما) (ت) "گھی میں بھنا ہوا گوشت" (فیروز ۸۶۳)

قورمہ "بھنا ہوا گوشت" (ر ت فہرست ۲۹۰) قورمق = "بھننا، روسٹ کرنا" سے اسم۔

۱۱۸۔ قوماق (ت) "ایک خاص قسم کی روٹی جو آٹے پیاز گھی اور انڈوں کی سفیدی سے بنائی جاتی ہے۔" (فیروز ۸۶۴)

قویماق "گھی کے ساتھ سرخ کی گئی روٹی جس میں تہیں ہوتی ہیں" (ش س ۲۴۲) "پنیر، انڈا اور آٹے سے بنا ہوا آملیٹ" (د س ۸، ۳۰۲۰)

۱۱۹۔ قیمہ (ت) "ریزہ ریزہ کیا ہوا گوشت، کٹا ہوا گوشت" (فیروز ۸۶۶)

قیمہ "کٹا ہوا گوشت" (ر ت فہرست ۳۲۵) قیمک = ریزہ ریزہ کرنا" سے اسم (کلاؤ ۶۷ اور دیورفر ۳، ۱۶۵۸)

۱۲۰۔ قینچی (مہت) "مقراض، کترنی، وہ آڑی ترچھی سلاخیں جو جنگلے کے طور پر مکان کے گرد لگا دیتے ہیں۔" (فیروز ۸۶۶)

قاینچی "کترنی، مقراض" اس کا مصدر ہے "قاینچی لامق = "کاٹنا" (ت ل، ۲، ۴۷۶ اور د س ۸، ۲۷۰۰) ج ت میں مشتق نہیں۔

۱۲۱۔ کابک (ت مف) "مرغوں، کبوتروں کا ڈربا جو بانس کی کھپچیوں سے بناتے ہیں، لکڑی کا ڈربا" (فیروز ۸۶۷)

کابغ "دروازہ" (ر ت فہرست ۲۶۴) اور ج ت میں قاپوق "کسی چیز کا سرپوش، کھال یا ڈھکن" اردو والا مطلب ج ت میں نہیں۔

۱۲۲۔ کرچ (ت مل) "ایک قسم کی لمبی تلوار جو اکثر فوجی افسروں کے پاس ہوتی ہے۔" (آ س ۲، ۹۳۴) آ س

قلج "تلوار" (کلاؤ ۶۱۸) "ل" بگڑ کر "ر" کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

نے اسے کوئی انگریزی لفظ سمجھا ہے۔

۱۲۳۔ کُرک (ت۔ا)، "وہ مرغی جو انڈے دینے سے رُک گئی ہو" (فیروز ۸۹۰)

قورق "انڈے سے رک کر بیٹھی ہوئی مرغی یا مرغی وغیرہ" (سامی ۱۰۷۹) پرانی ترکی میں اس لفظ کا سراغ نہیں ملا۔

۱۲۴۔ کُلچہ (ت)، "ایک قسم کی میدے کی چھوٹی خمیری روٹی جو تنور میں پکائی جاتی ہے۔ (فیروز ۹۰۸)

کُلچہ (قلچہ)، "گول مول چھوٹی سی روٹی" اور مجازاً گالوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ (ش س ۱۵۹۹) کلچو "چھوٹی اور زیتون کی روٹی" (ق س ۱۵۳۵) ایک گندم آٹے یا مکی سے بنائی ہوئی بغیر خمیر کے روٹی" (د س ۱۰۸۰۳۴)

۱۲۵۔ کلغی (ت۔ف)، "پرندوں کے خوشنما پر جو بادشاہ اپنے تاج، ٹوپی یا پگڑی پر لگاتے ہیں، مور یا پرندوں کے سر کا تاج" (فیروز ۹۰۸)

قالقق "وہ بال جو ہوا میں کھڑے ہوئے ہوں، کوئی چیز جو اوپر کی طرف کھڑی ہو" (ریڈ ۵۸۱ اور کلاؤزن ۶۱۹) اس کا مصدر ہے قالقمق: "اوپر کی طرف اٹھنا" (تفصیلات کے لیے دیکھیے اوڈ ۳۳۸)

۱۲۶۔ کوتوال (ت)، "محافظ قلعہ اور شہر، شہر کا رات کو گشت لگانے والا افسر، سرہنگ" (آصفیہ ۵۸۱،۴)

کوتوال "ایک قلعہ یا شہر کا محافظ" (ش س ۲۵۶) "محافظ یا ملٹری میں ایک رتبہ" (راد ۲، ۱۶۸۱ اور دیورفر لفظ نمبر ۱۶۵۸)

۱۲۷۔ کوچ (ت)، "روانگی، رحلت، نقل مقام" (آصفیہ ۵۸۳،۴)

کوچ "ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل ہونا" (د ت فہرست ۳۵۴ اور دیورفر ۳، ۱۶۶۰)۔

۱۲۸۔ کوچک (ت۔ف)، "چھوٹا، خرد، ننھا" (آصفیہ ۵۸۴،۳)

کُوچُک (کیچک) "چھوٹا" (کلاؤزن ۶۹۷) "چھوٹا بچہ انسان یا حیوان کا" (ش س ۲۵۷) اردو کا لفظ "کچھ" بھی اس سے ماخذ ہے۔

۱۲۹۔ کورنش (ت)، خمیدگی، جھکاؤ، جھک کر سلام کرنا، آداب بجالانا، بندگی" (آصفیہ ۵۸۶،۳)

گورنش "ایک بادشاہ کو دیکھنا یا حضور میں آنا، بادشاہ کی طرف دیکھا جانا" (بابرنامہ ۲۱۴)، گورشما = روبرو آنا (کلاؤزن ۷۴۰)

۱۳۰۔ کوکلتاش (م۔ت) بادشاہ کا دودھ شریک بھائی (فیروز ۹۲۶)

کوکلتاش "دودھ شریک بھائی" کوکل = "دایا دودھ پلانے

والی عورت ـ داش (ترکی لاحقہ) (ابوشکا ۲۷۱) ج ت میں نہیں بلکہ مشرقی ترکی اور منگولی میں زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

۱۳۱۔ کوکہ (م ہت) "اناکا بیٹا، دودھ پلانے والی کا لڑکا، دودھ شریک بھائی" (آص، ۳، ۵۹۳)

کوکہ "عورت کے پستان، دودھ شریک بھائی" (ہمایوں ۲۰ اور ش ص ۲۰۰) ج ت میں نہیں ملتا۔

۱۳۲۔ نوکر (م ہت) "چاکر، ملازم، خدمت گار" (آص، ۴، ۶۱۷)

نوکر "خدمت گار، یتیم" (ت ص ۲۸۳) "کلرک" (راڈ ۲، ۷۵۹۹) منگولی سے مشرقی ترکی میں آیا ہے۔ (کلاؤ ۷۷۳) ج ت میں نہیں ملتا۔

۱۳۳۔ وشاق (ت) "غلام، خدمتگار، سادہ رو غلام، غلام بچہ ترک" (آص، ۴، ۶۴۹)

اوُشاق "چھوٹا بچہ" (دت فہرست ۸۰۰) اور (کلاؤ ۱۰۶)

۱۳۴۔ ہراول (ت) د۔ دیکھیے "قراول"

۱۳۵۔ یابو (ت) "ٹٹو، چھوٹا گھوڑا" (فیروز ۱۲۶۶)

یابو "گھوڑا، سامان یا بوجھ اٹھانے والا گھوڑا" (ت ص ۲۸۹) "گھوڑے کا بچہ، بچھڑا" (کلاؤ ۸۷۴) بے خانہ گھوڑا (راڈ ۳، ۲۸۴)

۱۳۶۔ یاغ (ت) "گھی، روغن، تیل" (فیروز ۱۲۶۶)

یاغ "گریس، روغن، تیل" (کلاؤ ۸۹۵ اور دت ۲، ۵۹۳)

۱۳۷۔ یال (ت) "گردن، گلا، گھوڑے کی گردن کے بڑے بڑے بال، جانور کی گردن کے بال" (آص، ۴، ۸۰۰)

یال "گھوڑے کی گردن کے بال، گھوڑے کی گردن" (کلاؤ ۹۱۷ اور دت فہرست ۸۱۲) ج ت میں یلہ کا شکل ہے۔ "یال پوش" (اک ص ۱۴۳)۔

۱۳۸۔ یرغا (ت) "تیز رفتار گھوڑا، یلغار" (فیروز ۱۲۶۸)

یرغا "دوگانہ چلنے والا گھوڑا" (کلاؤ ۹۶۴ اور دت فہرست ۸۰۲)

۱۳۹۔ یراق (ت) "لڑائی کا سامان ہتھیار اسباب، سامان" (فیروز ۱۲۶۸) سازو یراق ضرب کلیم (اقبال)

یراق "ہتھیار" (دت ی، ۳، ۱۳۲) بندوق تلوار جیسے؛ "ہتھیار (ش ص ۳۰۲) ج ت میں عضو تناسل۔"

۱۴۰۔ یزک (ت) "طلایہ، ہراول، محافظان لشکر یعنی

یزک "آگے جانے والا لشکر، پیش لشکر" (دت ۲، ۸۸۲)

قراول، سواروں کی وہ جماعت جو اپنے لشکر سے آگے جاتی ہے تاکہ دشمن کی فوج سے ہشیار اور خبردار رہے۔" (آص ۴، ۸۲۴)

ور (کلاوُ ۹۸۶) ج ت میں استعمال نہیں ہوتا۔

۱۴۱۔ یسال (ت، "فوج کا پرہ" (فیروز ۱۰۰۲) اور (ا ک ص ۱۶۹)

یسال، سپاہیوں کی صف، صف میں کھڑا ہونا (دیورفر لغو نمبر ۱۷۵۰ اور ش ص ۳۰۲) ج ت میں صفت "قانونی"

۱۴۲۔ یساول (ت)، "نقیب، چوبدار، میر تزک، قاصد، پیغامبر" (آص ۴، ۸۲۰)

یساول "محافظ عساکر، حکومت کے کاموں کا نگران" (ریڈ ۲۴۵۰) "محافظ" (ج ت ۲۳۷) (دیورفر لغو نمبر ۱۸۶۲) ترکی کے لفظ "یسال" سے ماخذ۔

۱۴۳۔ یلغار (ت)، "حملہ، دھاوا، دشمن کی فوج پر دوڑ کر حملہ آور ہونا، تیز رفتار گھوڑا" (آص ۴، ۸۶۰)

یلغار "آگے جانا" (او یغور ۹۲) "ایلگیر = آگے بڑھنا" (کلاوُ ۱۴۴) سے ماخذ ہے۔ (دیورفر ۱۰۰)

۱۴۴۔ یورش (ت)، "حملہ، دھاوا، چڑھائی، دشمن پر دوڑ کے جانا، غلبہ، فساد، ہنگامہ" (آص ۴، ۸۷۷)

یورش "یغورک = تیز بھاگنا" سے اسم (کلاوُ ۹۱۴) "حملہ، طوفان" (شتائی ۱۵۷) "حملہ کرنا" (راڈ ۳، ۶۰۳)

۱۴۵۔ یوز (ت)، "چیتا، پلنگ، اسد، سو، صوبیدار"، "یوزباشی" - سو سپاہیوں کا سردار (آص ۴، ۸۸۷ اور اک ص ۲۴۸)

یوز "ایک سو" (دت فہرست ۸۲۷) "شکار کیلئے استعمال کیا جانے والا چیتا" (سنگلاخ ۳۴۲ اور شتائی ۱۵۲۷)

فارسی، عربی اور اردو میں کئی الفاظ ترکی کے لاحقے "چی یا جی" لگا کر بنائے گئے ہیں مثلاً بندوقچی، توپچی، سفرچی، سگدہ جی (چی)، باورچی۔ "چی" کا مطلب ہے کسی کام کو کرنے والا۔

نتیجہ :۔ اس مختصر مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وسط ایشیا کے ترکوں نے واقعی ہی ہندوستان میں ترکی تمدن کی گہری بنیاد ڈالی تھی، الفاظ چونکہ ایک تمدن کے نمائندے ہیں اس لیے یہ بھی وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ علمی، معاشرتی اور فنی طرز زندگی پر ترکی تمدن کے آثار بہت نمایاں ہیں حتیٰ ابھی مزید تحقیق کا سلسلہ ضروری ہے۔ پرانی اردو متون کا اور مطالعہ کیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ بہت سے پوشیدہ ترکی الفاظ مل جائیں، اس موضوع کی تحقیق کیلئے پاکستان اور ترکی علما کا تعاون درکار ہے۔

اختصارات اور کتابیات

١۔ اک:۔ آئینِ اکبری' بولقان' بنگلو روڈ' دہلی۔ ١٩٦٠ء۔

٢۔ آن:۔ فرہنگ آنند راج' محمد بادشاہ' کتاب فروشی خیام' تہران ایران۔

٣۔ ابوشقا:۔ ابوشقا الغاق' بسیم آتالائی' آنقرہ ١٩٧٠ء (مشرقی ترکی کی لغت)۔

٤۔ اوڈ:۔ اولوڈشیپس' سٹوڈیا انڈو ایرانیا' بون یونیورسٹی' ١٩٥٥ء۔

٥۔ ع ش:۔ علیشیر نوائی' اکاہ سری لیونت' ترک تاریخ قورومو' آنقرہ ١٩٦٥ء۔

٦۔ ع:۔ عربی۔ ف:۔ فارسی۔ ت:۔ ترکی۔ م:۔ منگولی (مغلی)۔ ا:۔ اردو۔

٧۔ آص:۔ فرہنگ آصفیہ' مولوی سید احمد دہلوی' نیشنل اکاڈمی' دریا گنج' دہلی ١٩٧٤ء۔

٨۔ بابور:۔ حکمت بایور' ہندوستان تاریخی' ترکش بورڈ' آنقرہ ١٩٧٠ء۔

٩۔ کلاؤ:۔ سر جی کلاؤزن' این ایتھیمولوجیکل ڈکشنری آف پری تھرٹینتھ سنچری ٹرکش' آکسفورڈ [illegible]ء۔

١٠۔ ڈیورفر:۔ پروفیسر جی ڈیورفر' ترکیشے اوند منگولیشے ایلیمینٹے ام نیو پرشیشن' ١' ١٩٦٣ء' ٢' ١٩٦٥ء'
٣' ١٩٦٧ء' ویسبادن۔

١١۔ دس:۔ دیرلمہ سوزلغو' ٹرکش بورڈ' آنقرہ ١٩٦٣ء۔

١٢۔ دت:۔ دیوان لغات الترک' محمود کاشغری' مترجم بسیم آتالائی' ٹرکش بورڈ' آنقرہ' ١٩٤٠ء۔
(تاریخ تصنیف ١٠٧٢م)۔

١٣۔ دت فہرست:۔ فہرست دیوان' لغات الترک' بسیم آتالائی' ٹرکش بورڈ' آنقرہ' ١٩٤٣ء۔

١٤۔ تای: نامق اورکون' ایسکی ترک یازتلاری (ترکی کے پرانے کتبے) ٹرکش بورڈ' استنبول ١٩٣٨ء۔

١٥۔ فیروز:۔ فیروز اللغات' مولوی فیروز الدین' فیروز سنز لمیٹڈ' لاہور' ١٩٧٥ء۔

١٦۔ ہمایوں:۔ ہمایوں نامہ' گلبدن بیگم' مترجم عبدالرب یلغار' ترک تاریخ قورومو (بورڈ) آنقرہ' ١٩٤٤ء۔

١٧۔ قاب:۔ قوتادغو بلیگ' یوسف اولوغ خاص حاجب' مرتب رشید رحمتی ارات (فہرستِ الفاظ)۔

ٹرکش کلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، استنبول۔ ۱۹۷۹ء (تاریخ تصنیف ۱۰۶۹م)۔

۱۸۔ قاس:۔ قرگزسوزلوغو (لغت)، ٹرکش بورڈ، آنقرہ ۱۹۴۵ء۔

۱۹۔ م۔ص:۔ ترکی اردو لغت، محمد صابر، سلسلۂ مطبوعات "لائبریری پروموشن بیورو" نمبر ۳ کراچی ۱۹۶۸ء۔

۲۰۔ ج۔ت:۔ جدید ترکی کی لغت، ترکش بورڈ۔ آنقرہ (کوئی بھی ایڈیشن)۔

۲۱۔ ق۔ل:۔ قدیم اردو کی لغت، ڈاکٹر جمیل جالبی، مرکزی اردو بورڈ، لاہور ۱۹۷۳ء۔

۲۲۔ راڈ: راڈلوف ویرزوخ ایئنے ورتربوخ دیر ترک ڈیالکٹے، ماٹون اینڈ کمپنی، ۱۹۶۰ء۔

۲۳۔ ریڈ:۔ ریڈ ہاؤس، ٹرکش اینڈ انگلش لیکسی کن، یاغزی یائین لاری، استنبول ۱۹۷۸ء (طبع اول ۱۸۹۰ء)

۲۴۔ شٹائن:۔ پرشین، انگلش ڈکشنری، شٹائن گاس، لبرائے دولبون، بیروت ۱۹۷۰ء (طبع اول ۱۷۹۲ء)۔

۲۵۔ سامی:۔ قاموسِ ترکی، شمس الدین سامی، درسعدت، استنبول ۱۳۱۵ ہجری۔

۲۶۔ سنگلاخ:۔ سنگلاخ، مہدی خان، مرتب کلاوزن، لوزاق اینڈ کمپنی، لندن ۱۹۶۰ء۔

۲۷۔ ش۔س:۔ لغت چغتائی و ترکی عثمانی، شیخ سلیمان آفندی، مہران مطبعہ سی، استنبول ۱۲۹۸ھ۔

۲۸۔ ت۔ہ:۔ تاریخ ہمایوں و اکبر، بایزید بیات، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ، ۱۹۴۱ء۔

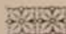
۲۹۔ ت۔ل:۔ ترک لغتی، حسین کاظم قادری، معرف وکالتی، استنبول ۱۹۲۷ء۔

۳۰۔ ایغور:۔ ایسکی اویغور ترکچہ سی لغتی (زبان اویغور کی لغت) جعفر اوغلو، ٹرکش بورڈ ۱۹۶۸ء۔

۳۱۔ ب۔ن:۔ بابرنامہ، رشید راحمتی ارات، ترک تاریخ قورومو، آنقرہ ۱۹۴۳ء۔

۳۲۔ ی۔ت:۔ ینی تاراماسوزلوغو (نئی منتخب لغت) جم دلچیں، ٹرکش بورڈ۔ ۱۹۸۳ء۔

۳۳۔ یاقوت:۔ یاقوت سوزلگی، (پرانی ترکی کی لغت) ٹرکش بورڈ آنقرہ۔



ذاکر صاحب کی شخصیت

میری نظر میں



پروفیسر محمد شبیر خاں (پیدائش ۱۹۲۲ء) ۱۹۴۸ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے علم معاشیات میں ایم اے کیا اور ۱۹۴۹ء میں یہیں شعبۂ معاشیات سے منسلک ہو گئے۔ امریکا کی تعلیمی فاؤنڈیشن کی اسکالرشپ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا گئے۔ پھر علیگڑھ میں پروفیسر، صدر شعبۂ معاشیات اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے عہدوں پر کام کیا۔ ۱۹۵۹ء میں شیکاگو یونیورسٹی اور ۱۹۶۰ء میں ہیڈل برگ یونیورسٹی (جرمنی) کے وزیٹنگ پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں ممتاز وزیٹنگ اسکالر کی حیثیت سے امریکا کی مختلف یونیورسٹیوں میں لکچر دیے۔ اسٹیٹ بینک آف انڈیا اور لائف انشورنس کارپوریشن کے سنٹرل بورڈ آف ڈائرکٹرس کے ممبر رہے۔ ۱۹۸۶ء میں ریٹائر ہو کر علی گڑھ ہی میں مقیم ہیں اور ایل این مشرا انسٹی ٹیوٹ آف اکنامک ڈیولپمنٹ پٹنہ کے اعزازی پروفیسر ہیں۔

پروفیسر محمد شبیر خاں

علیگڑھ



پروفیسر محمد شبیر خاں امریکا میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ



میں چونکہ ذاکر صاحب کا بہت عقیدت مند ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میری طرح اور لوگ بھی متعدد تعداد میں ان کے عقیدت مند ہوں گے لہٰذا ان سے درخواست کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر چند کہ ذاکر صاحب میرے لئے ایک آئیڈیل تھے اور ہیں لیکن وہ بھی ایک انسان تھے اور اگر میرے مضمون میں کسی صاحب یا صاحبہ کو ذاکر صاحب کی شخصیت میں کوئی کمزوری نظر آئے تو وہ مجھے معاف کر دیں اس بنا پر کہ ہو سکتا ہے کہ میں نے ان کو سمجھنے میں غلطی کی ہو یا ان کی اگر کوئی کمزوری ہو بھی تو اس کو بشری فطرت کا تقاضا سمجھا جائے بجائے اس کے کہ میرے اس مضمون کو جان بوجھ کر ان کے اندر کوئی کمزوری تلاش کرنے کی کوشش پر محمول کیا جائے اس لئے کہ میں ایسا اپنے محسن اور بزرگ کے متعلق کبھی کر سکتا ہوں نہ کرنے کی جرات ہے۔

مضمون کی ابتدا سے پہلے میں یہ عرض کر دوں کہ میں اس بات میں یقین کرتا ہوں کہ انسان کی شخصیت اس کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے زیادہ بہتر طور پر سمجھی جا سکتی ہے بجائے اس کے کہ اس کے بڑے بڑے کاموں پر زور دیا جائے۔ بڑی باتوں میں تو اکثر لوگ جو سطحی شخصیت کے ہوتے ہیں وہ بھی بڑے نظر آتے ہیں۔ ان چیزوں سے کسی کی بڑائی کا صحیح جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔ اس لئے یہاں میں ذاکر صاحب کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتوں پر زیادہ دھیان دوں گا۔ اگر کوئی صاحب یا صاحبہ میری اس رائے سے اختلاف رکھتے ہوں تو ان سے معذرت خواہ ہوں۔

ذاکر صاحب سے میری ملاقات بالکل عجیب طریقہ سے ہوئی ۱۹۴۷ء میں مسلم یونیورسٹی ایک بہت ہی خلفشار کے دور سے گذر رہی تھی اس لئے کہ ملک کی آزادی سے قبل یہاں پر زیادہ تر اساتذہ اور طلباء مسلم لیگ کے ساتھ تھے اور پاکستان بنوانے کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ میں ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک یونیورسٹی کا طالب علم رہا تھا جس سال میں نے معاشیات میں ایم۔ اے پاس کیا یعنی ۱۹۴۷ء اس سال تو ایک کھلبلی مچ گئی اس لئے کہ ملک کے آزاد اور خاص طور سے بٹوارہ ہوتے ہی ملک کے زیادہ حصوں میں خاص طور سے جن کا تعلق پاکستان سے یا تو ان کی قربت کی وجہ سے زیادہ تھا یا جہاں پر پاکستانی خیالات کے لوگ زیادہ تھے وہاں کے مسلمانوں سے ملک کے

زیادہ تر لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا۔ اس کا اثر علی گڑھ میں واضح طور سے دکھائی دے رہا تھا۔ اور یہاں کے اکثر لوگ پاکستان جا رہے تھے جو لوگ باقی رہے ہر چند کہ اپنے خیالات سے اور اپنے دل سے ہندوستان کو اپنا صحیح ملک سمجھتے تھے لیکن ان کے دلوں میں بھی بہت دہشت تھی اس لئے کہ ملک کے اکثر باشندے یہاں کے ہر آدمی کو ناقابل اعتماد سمجھتے تھے۔ اس زمانہ میں شعبہ معاشیات کے اکثر اساتذہ دوسرے شعبہ کے اساتذہ کے مانند پاکستان جا چکے تھے یا جا رہے تھے۔ سید حمید الدین صاحب مرحوم جن کا ہندوستان میں رہنے کا مکمل ارادہ تھا باوجود اس کے کہ ان کے خاندان کے اکثر لوگ جو دلی میں رہتے تھے ملک کا بٹوارہ ہوتے ہی پاکستان جا چکے تھے شعبہ معاشیات کی قیادت کر رہے تھے۔ وہ عارضی ریڈر اور عارضی صدر شعبہ تھے۔ میں ایم۔اے پاس کرنے کے بعد شاہجہاں پور کے اسلامیہ انٹر کالج میں (جو اب گاندھی فیض عام ڈگری کالج کہلاتا ہے) مستقل طور پر ملازم ہو گیا تھا۔ سید صاحب نے اکتوبر کی ابتدا میں مجھ کو لکھ کر بھیجا کہ میں تم کو اس لائق سمجھتا ہوں کہ تم اس شعبہ میں کام کر سکو لیکن میرے اختیار میں صرف یہ ہے کہ تمہارے لئے عارضی طور پر جونیئر لکچرر کے عہدہ پر چھ مہینہ کی سفارش کر سکتا ہوں۔ اور میری سفارش پر غالباً تمہارا تقرر بھی ہو جائے گا لیکن اس دوران میں اس عہدہ کی اخبارات میں تشہیر کی جائے گی اور چھ مہینہ کے اندر اندر سلکشن کمیٹی ہوگی اس میں تمہارا تقرر ہونا یا نہ ہونا صرف تمہاری قابلیت اور استعداد کے تحت ہوگا۔ اس کے لئے میں وعدہ نہیں کر سکتا۔ سید صاحب میرے استاد رہ چکے تھے اور میں جانتا تھا انتہائی ایماندار اور دیندار آدمی تھے۔ لہٰذا جب انہوں نے یہ بات لکھی تو میں نے اس کو اسی اسپرٹ میں سمجھا۔ اور باوجود اس کے کہ ایسا کرنے میں میرے لئے بڑے خطرہ کی گنجائش ہو سکتی تھی (اس لئے کہ مستقل تقرر کو چھوڑ کر عارضی تقرر پر اس امید پر آنا کہ وہ مستقل ہو سکتا ہے کافی خطرناک بات ہے) میں راضی ہو گیا۔ انہوں نے میری سفارش لکھ کر بھیج دی اور ان کے لکھنے پر میرا تقرر بھی ہو گیا۔

اس کے دوسرے دن ایک صاحب جن کا نام ابو سالم صاحب تھا دلی سے تشریف لائے۔ وہ اس یونیورسٹی کے پرانے طالب علم تھے اور مجھ سے چار سال پہلے معاشیات میں ایم۔اے پاس کر چکے تھے اور معاشیات کے ایک ہفتہ وار جریدہ میں کام کرتے تھے۔ قابلیت میں وہ یقیناً مجھ سے زیادہ تھے اور آج بھی ہیں۔ ذاکر صاحب کی سفارش کا ایک خط سید حمید الدین صاحب کے نام لے کر آئے اور یہ سفارش اسی عہدہ کے لئے تھی جس پر سید صاحب میرے لئے ایک دن پہلے سفارش کر چکے تھے۔ تو سید صاحب نے ان صاحب سے یہ فرمایا کہ اس جگہ کے لئے تو میں نے کل ہی ایک دوسرے صاحب کی سفارش کی ہے لیکن اغلب یہ ہے کہ ایک آدھ مہینہ کے اندر اندر ایک سینیئر لکچرر کی جگہ خالی ہو جائے گی اور اگر وہ خالی ہو گئی تو اس جگہ پر تمہارا تقرر جونیئر لکچرر کی حیثیت

سے ابتدائی تنخواہ سے کچھ زیادہ پر انشاءاللہ کرادوں گا۔ اور اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ وہ جگہ خالی بھی ہو گئی اس کے عہدہ دار بھی پاکستان چلے گئے اور سید صاحب نے اپنے وعدہ کے مطابق ان کے تقرر کی سفارش کا خط لکھ کر بھیج دیا۔ اور اس طرح ان کا تقرر بھی ہو گیا۔

اب ایک سینیر لکچرر کی اور ایک جونیر لکچرر کی جگہیں اخباروں میں مشتہر کر دی گئیں۔ اور امیدواروں کی درخواستیں آئیں۔ میری یہ کم عقلی تھی کہ میں نے دونوں کے لئے درخواستیں دے دیں۔ اور ابوسالم صاحب نے بھی احتیاطاً دونوں جگہوں کے لئے درخواستیں دیں اس لئے کہ وہ دلی کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے علی گڑھ سے واپس نہیں جانا چاہتے تھے اور اس لئے اس بات کا خطرہ مول نہ لینا چاہتے تھے کہ ان کا تقرر کسی عہدہ پر بھی نہ ہو۔

یہ حسن اتفاق تھا کہ دسمبر کے مہینے میں جس دن سلکشن کمیٹی دونوں عہدوں کے لئے ہونے والی تھی اسی دن ذاکر صاحب نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھال لیا۔ او اس طرح سلکشن کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے میری ملاقات ذاکر صاحب سے ہوئی۔ اس سے قبل نہ ذاکر صاحب نے مجھے دیکھا تھا اور نہ میں نے ذاکر صاحب کو، صرف ان کے متعلق سن رکھا تھا کہ وہ ملک میں ایک بڑی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر حلقہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ مجھے اس بات کا بھی علم نہ تھا کہ ذاکر صاحب نے اعلیٰ تعلیم "ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی" دونوں جرمنی میں برلن یونیورسٹی سے معاشیات ہی میں حاصل کی تھی۔ سلکشن کمیٹی ہوئی جس میں متعدد امیدوار باہر کے بھی تھے۔ اور اندر سے میں اور ابوسالم صاحب تھے۔ میٹنگ کے بعد معلوم ہوا کہ جونیر لکچرر کی حیثیت سے میرا اور سینیر لکچرر کے عہدہ پر ابوسالم صاحب کا تقرر ہو گیا۔ میں اپنے تقرر سے بہت خوش ہوا۔ اور دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی کہ اللہ تعالیٰ نے مستقل طور پر جونیر لکچرر کی جگہ پر تقرر کروا دیا۔

میں تو اس لائق نہ تھا لیکن اغلب یہ ہے کہ ذاکر صاحب میرے انٹرویو سے بہت خوش ہوئے اس لئے کہ انہوں نے سید مجیدالدین صاحب سے خاص طور پر فرمایا کہ وہ مجھے ان کے پاس بھیج دیں۔ دوسرے دن جب میں ذاکر صاحب سے ملا تو میری حیرت کی حد نہ رہی جب انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تمہیں اس بات کا افسوس تو نہیں ہے کہ تمہارا تقرر جونیر لکچرر کے عہدہ پر ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو بہت خوش ہوں کہ آپ جیسے قابل وائس چانسلر کی صدارت میں میرا جونیر لکچرر کی حیثیت سے مستقل تقرر ہو گیا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ انٹرویو کمیٹی کے لوگ تمہارے جوابات سے بہت خوش ہوئے۔ آئندہ محنت کرتے رہنا اور انشاءاللہ جلد ہی تمہارا تقرر سینیر لکچرر کی حیثیت سے ہو جائے گا اور تین ماہ کے بعد یعنی مارچ ۱۹۴۹ء میں ہو بھی گیا۔ اخبار جب پڑھا کرو تو اس میں یہ بھی دیکھتے رہنا کہ اگر کبھی کسی وقت باہر پڑھنے کے لئے کسی وظیفہ کی تشہیر ہوتی ہے تو مجھے بتانا میں تمہارے لئے کوشش کروں گا اس لئے کہ باہر تعلیم حاصل کرنے سے

آدمی کے دماغ میں بہت وسعت ہوتی ہے اور مزید پڑھنے لکھنے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ اس دن میری سمجھ میں آگیا کہ ڈاکٹر صاحب نوجوان لوگوں کی زیادہ سے زیادہ ہمت افزائی کرتے ہیں اس لئے کہ جب انہوں نے میرے جیسے نالائق آدمی سے ایسی باتیں کیں تو لائق لوگوں سے نہ جانے کیا کہتے ہوں گے۔ ان کی شخصیت کا میرے اوپر بہت اثر ہوا اور میں کام کرنے کا عادی تو پہلے ہی سے تھا اس دن کے بعد تو دل و جان سے کام میں لگ گیا۔

بہت جلد ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ ڈاکٹر صاحب شعبہ معاشیات میں آنریری پروفیسر کی حیثیت سے بھی تقرر کئے جا چکے تھے اس لئے کہ انہوں نے اکثر و بیشتر شعبہ میں آنا شروع کر دیا۔ ہم لوگوں سے معاشیات کے معاملات میں گفتگو کرتے اور واپس چلے جاتے۔ ایک دن جب میں کلاس لینے گیا تو میرے پیچھے پیچھے وہ بھی کلاس میں داخل ہو گئے اور طلباء کے ساتھ مل کر بیٹھ گئے۔ لکچر برابر سنتے رہے اور آس پاس کے طلباء جو لکچر سن کر نوٹس لے رہے تھے ان کو بھی غائبانہ دیکھتے رہے۔ جب لکچر ختم ہوا تو کچھ طلباء نے سوالات کئے جن کے جوابات جو میں نے دیئے وہ بھی انہوں نے سنے مگر انہوں نے ذاتی طور پر کوئی سوال نہیں کیا۔ میرے ساتھ جب کلاس سے باہر آئے تو انہوں نے دوسرے لوگوں کے سامنے میرے لکچر کی بہت تعریف کی جو یقیناً میری ہمت افزائی کے لئے کی ہوگی۔ اور ساتھ ہی ساتھ مجھ سے یہ بھی کہا کہ اپنے طلباء کو یہ بھی بتایا کرو کہ نوٹس کیسے لئے جاتے ہیں اس لئے کہ میں نے یہ بات دیکھی کہ اکثر طالب علم اصلی بات تو نوٹ نہیں کرتے اور جو مثالیں دی جاتی ہیں ان کو خاص طور سے لکھتے ہیں۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آج کے تمہارے لکچر سے مجھے یہ یقین ہوگیا کہ تم اپنے لکچر دینے کے لئے نوٹس لکھتے ہوگے اگر ایسا ہے تو تم وقتاً فوقتاً مجھے بھی دکھایا کرو تاکہ میری سمجھ میں جو آئے وہ مشورہ کے طور پر میں تم کو بتا سکوں۔ ظاہر ہے یہ ان کی انکساری تھی کہ انہوں نے یہ بات مجھ سے اس طرح کہی تھی ورنہ ان کے جیسا عالم تو مجھے بہت سی باتیں بتا سکتا تھا۔

بہر حال ان کا یہ حکم میری اور ان کی اکثر ملاقات ہونے کا باعث بن گیا۔ واضح رہے کہ یہ بات میرے خمیر میں بچپن ہی سے نہ تھی کہ میں اپنے کسی آفسر کے پیچھے پیچھے پھروں۔ لیکن یہ ملاقات میری تحصیل علم کی خاطر تھی جو میں نے اپنے لئے بہت قیمتی سمجھا۔ ہفتہ میں کم از کم ایک بار میں ان سے ملتا اور میں ان کو اپنے نوٹس دے آتا جن کو وہ بغور ملاحظہ فرماتے اور اکثر و بیشتر بہت سی چیزوں میں مشورہ دیتے رہتے تھے۔ میں نے اپنا طریقہ یہ کر رکھا تھا کہ کاپی کے ایک صفحہ پر نوٹس لکھتا تھا اور اس کے پیچھے کے صفحہ کو خالی رکھتا تھا۔ جس پر ان کی ہدایات کے مطابق ترمیم و تنسیخ کرتا تھا اور دنیا کے انگریزی زبان کے معاشیات کے بہترین جرنلز اور کتابوں میں جو نئی باتیں نکلتی تھیں ان کو پڑھتا رہتا تھا۔

ایک دن میرے ایک ساتھی جو طالب علمی کے زمانہ میں میرے ساتھ کمرے میں رہتے تھے کسی اخبار سے

ایک اشتہار کاٹ کر میرے پاس لے آئے جس میں امریکہ کی تعلیمی فاؤنڈیشن کی طرف سے وظائف کے لئے درخواستیں مانگی گئی تھیں۔ اس اشتہار میں لکھا تھا کہ جو لوگ درخواست دینا چاہیں وہ سادہ کاغذ پر لکھ کر درخواست دے سکتے ہیں لیکن ساتھ میں ان کو اپنے ہائی اسکول سے لے کر ایم۔ اے پاس کرنے تک سب سرٹیفکٹ کی کاپیاں منسلک کرنا ہوں گی۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی میرے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے سرٹیفکٹ تو ایک مرتبہ ریل گاڑی میں سفر کرتے وقت سامان کی چوری کے ساتھ چوری ہو گئے تھے۔ میں ان سرٹیفکٹ کی کاپیاں کہاں سے لا سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ وقت اب بہت کم رہ گیا ہے لہٰذا ان کو چھوڑیئے اور جلد از جلد ایک درخواست ٹائپ کروا لیجئے۔ جو سرٹیفکٹ موجود ہیں ان کی کاپیاں منسلک کر دیجئے۔ میں کل دلی جا کر خود اس درخواست کو ہاتھوں ہاتھ دے آؤں گا۔ ان کی اس محبت اور ضد کی بنا پر میں بادل ناخواستہ تیار ہو گیا۔

وہ جمعہ کا دن تھا۔ اور انہوں نے اشتہار کی وہ کاپی جمعہ کی نماز سے قبل مجھے دی تھی۔ میں نے اس کو شیروانی کی جیب میں رکھا اور ان سے وعدہ کیا کہ جمعہ کی نماز کے بعد ہی میں یہ کام شروع کر دوں گا۔ میں جمعہ کی نماز پڑھنے گیا تو واپسی میں ذاکر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے مسجد سے باہر نکل کر ان کو وہ اشتہار دکھایا۔ کہنے لگے اس میں کوئی ڈگری ملنے کا تو ذکر نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ پڑھائی تو علم حاصل کرنے کی خاطر کی جاتی ہے ڈگری ملنے کے لئے نہیں۔ فرمایا بالکل صحیح کہتے ہو۔ کار میں میرے ساتھ چلو۔ وہاں اپنی درخواست میرے پی۔ اے مرید صاحب سے ٹائپ کروا لو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ جب میں نے ذاکر صاحب سے رخصت چاہی تو بولے اپنے ساتھی سے کہہ دینا کہ جو بھی سرٹیفکٹ تمہارے پاس ہوں وہ آج ہی ان کی کاپیاں مرید صاحب کو دے دیں مگر یہ کام آج ہی ہو جانا چاہیئے۔ کل میں دلی جاؤں گا اور تمہاری درخواست خود دے کر آؤں گا۔

وہ اپنے کہنے کے مطابق دوسرے دن دلی گئے اور نہ صرف میری درخواست آفس پہنچائی بلکہ یقیناً ارباب حل و عقد سے میری سفارش بھی کی جس کا اندازہ مجھے اس بات سے لگا کہ جب مجھے انٹرویو میں بلایا گیا تو امیدواروں کا ایک جم غفیر تھا۔ میں دل ہی دل میں بہت دہشت زدہ تھا۔ لیکن جب میں انٹرویو دینے کے لئے اندر گیا اور انٹرویو لینے والوں کے سامنے بیٹھا تو میں نے اس بات کو سنا کہ فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر نے امریکہ کے کلچرل آفیسر سے جو ان کے پاس بیٹھے تھے کہا کہ یہ وہی صاحب ہیں جن کے لئے ڈاکٹر ذاکر حسین خود آئے تھے، تو انٹرویو کرنے والوں نے مجھ سے صرف دو سوال کئے۔ ایک تو یہ پوچھا کہ کیا میں اس یونیورسٹی میں ملازم ہوں جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر ہیں اور دوسرا یہ کہ میں امریکہ کی کس یونیورسٹی میں پڑھنا چاہوں گا۔ انٹرویو کے بعد میں واپس آ گیا۔ کچھ دنوں بعد مجھے

اطلاع ملی کہ مجھ کو وظیفہ دے دیا گیا ہے جس میں تعلیم ۔ رہائش، کھانے پینے کے علاوہ آنے جانے کا خرچ بھی شامل تھا۔ میں
بہت خوش ہوا اور جلدی جلدی تیاری کر کے امریکہ چلا گیا۔

امریکہ کی یونیورسٹیوں میں ہر مضمون کے ٹائم ٹیبل (جن میں مختلف کورس مختلف گھنٹوں میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں)
داخلہ کے وقت ہی مل جاتے ہیں اور ہر طالب علم ٹائم ٹیبل کو دیکھ کر اپنے کورس خود طے کر لیتا ہے (کون سے کورس ایسے
ہیں جن کو بلا ایک دوسرے کے ٹکراؤ کے پڑھا جا سکتا ہے۔ اور پہلے ہی دن سے پڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ جب
میں نے پہلے دن کلاس کیا تو مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ میں تو معاشیات میں جو کچھ جانتا تھا وہ قریب قریب نہ جاننے
کے برابر تھا پھر تو میں بڑے ولولے سے دن رات کام میں لگ گیا۔ کلاس کے علاوہ زیادہ وقت لائبریری کے
ریڈنگ روم اور شعبۂ معاشیات کی لائبریری میں صرف کرتا۔

امریکہ کی اکثر و بیشتر یونیورسٹیوں میں گریجویٹ تعلیم کے لئے ہوسٹل میں جگہ نہیں ملتی۔ مگر میری ضد پر یونیورسٹی
والوں نے مجھے ایک ہوسٹل میں جگہ دے دی تھی اور امریکہ ہی کے رہنے والے ایک طالب علم کے ساتھ ایک کمرہ میں
رہتا تھا۔ ہر چند کہ اس طالب علم کو پڑھنے لکھنے میں اتنی زیادہ دلچسپی نہ تھی لیکن وہ میرے انہماک کو دیکھ کر میں جب
بھی اور جس وقت کمرے میں پڑھنا چاہتا تھا مجھ سے انکار نہ کرتا تھا۔

جس زمانہ میں میں امریکہ میں تعلیم پا رہا تھا ذاکر صاحب اسی زمانہ میں امریکہ کی گورنمنٹ کے دعوت نامہ پر امریکہ
تشریف لائے۔ ان کو پورے ملک میں جگہ بہ جگہ اور اچھے اور خوبصورت نیز دلچسپ مقامات پر لیجانے کا پروگرام
امریکہ کی گورنمنٹ نے بنایا تھا۔ ان کی ذاتی خواہش پر ان کے لئے میری یونیورسٹی میں بھی آنے کا پروگرام بنا دیا گیا جہاں پر
مجھے کئی دن ان کے بہت قریب رہنے کا موقعہ ملا۔ ان دنوں میں کلاس کے علاوہ زیادہ تر وقت ذاکر صاحب کے
ساتھ گذارتا تھا۔ ان کے زیادہ قریب رہنے سے ان کی شخصیت اور خیالات کے متعلق مجھے کافی قریب سے دیکھنے کا
موقعہ ملا۔ اس سلسلہ میں کچھ باتیں قابل ذکر ہیں۔

امریکہ کے قیام کے دوران میں نے ایک بات ان کے اندر خاص طور سے نوٹ کی اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے
ان کو نہایت حسین قسم کے مزاج سے سرفراز کیا تھا جس کے متعلق کم از کم میرا خیال یہ ہے کہ اس مضمون کے قارئین میں
سے بہت کم کو واقفیت ہو گی اس لئے اس کی کچھ مثالیں میں خاص طور سے تحریر کر رہا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہوئی کہ اس سال ایک ہندوستانی طالب علم کو امریکہ کی گورنمنٹ نے اپنے ملک سے
نکل جانے کا آرڈر دیا تھا جس سے ہندوستانی طلبا اور دوسرے ہندوستانی جو امریکہ میں مقیم تھے ان کو بہت رنج

تھا۔ ذاکر صاحب چونکہ ہمارے ملک کے بڑے لیڈر تھے اس لئے ان کے پاس کسی بڑے اخبار کی ایک نمائندہ لڑکی اس سلسلہ میں بیان لینے آئی۔ اس کے گال پر کوئی نشان لگا ہوا تھا۔ ذاکر صاحب نے اس سے فرمایا کہ پہلے تم میرے غسل خانہ میں جاؤ۔ اپنا منہ دھوؤ اور میک اپ کر کے خوبصورت بنو۔ اس کے بعد آ کر جب تم مجھ سے سوال کرو گی تو میں جواب دوں گا۔ جب وہ لڑکی غسل خانہ میں چلی گئی تو میں نے میں ذاکر صاحب سے عرض کیا کہ میرے دل میں بھی یہ خیال آیا تھا کہ میں اس لڑکی سے یہ بات کہوں اور آپ کے دل میں بھی۔ مگر آپ نے کہہ دیا اور میں نہ کہہ سکا۔ کہنے لگے تمہارے دل میں اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھا اس لئے نہ کہہ سکے۔ اور میرے دل میں اس کے علاوہ کچھ نہ تھا، اس لئے کہہ دیا۔ مجھ کو اس پر بہت ندامت کا احساس ہوا۔ مگر انہوں نے ارشاد فرمایا کہ تم نوجوان آدمی ہو۔ اگر تمہارے دل میں کوئی اور خیال نہ آتا تو تعجب کی بات ہوتی۔

دوسرے دن کی بات ہے کہ میں اور ذاکر صاحب یونیورسٹی کا کیمپس دیکھنے نکلے۔ ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے۔ میرے درجہ کی امریکہ کی ایک طالبہ ملی۔ اس نے مسکرا کر مجھ سے ہلو کہا اور آگے بڑھ گئی۔ ذاکر صاحب نے فرمایا کہ یہ لڑکی تمہارے اوپر عاشق ہو گئی، مجھے اس وجہ سے پتہ چلا کہ وہ تم کو دیکھ کر مسکرائی اور اس کے چہرہ پر خوشی کے آثار نمایاں ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ اس ملک میں تو یہی طریقہ ہے۔ اور میں اس کو کسی دوسرے معنی میں نہیں لیتا۔ کہنے لگے تو اچھا تمہارے اوپر عاشق ہو کر مسکرائی نہیں رہی تھی تو میرے بڑھاپے کا مذاق اڑانے کے لئے ہنس رہی ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں ہے۔ وہ میرے ساتھ پڑھتی ہے۔ میری دوست ہے اور میں اس کی عادتوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ کہنے لگے تم صحیح کہتے ہو۔ لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ ہندوستانی طلباء ہر چیز کو غلط سمجھتے ہیں اور جو خطوط مغربی ممالک سے اپنے دوست احباب کو ہندوستان یا پاکستان بھیجتے ہیں، ان میں فرضی گھڑے ہوئے بڑھائے قصے لکھتے ہیں اور ایسا ظاہر کرتے ہیں کہ مغربی ممالک کی ہر لڑکی دن رات بس اسی کام میں لگی رہتی ہے کہ ان سے عشق کرے۔

اس کے بعد جو واقعہ ہوا اس نے مجھے حقیقت میں پریشان کر دیا۔ کہنے لگے میں تمہارا کمرہ ہوسٹل میں دیکھنے چلوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ میرا کمرہ چوتھی منزل پر ہے۔ ہوسٹل میں لفٹ نہیں ہے۔ آپ کے لئے اتنا اونچا چڑھنا مناسب نہیں ہوگا اس لئے کہ آپ کو ابھی دو سال پہلے ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔ کہنے لگے مجھے ڈاکٹروں نے دھیرے دھیرے چڑھنے کی اجازت دے دی ہے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آرام کر لیا کریں گے۔ میں نے عرض کیا کہ میں جلد اٹھنے کا عادی ہوں اور جلد ناشتہ کر کے کمرے سے باہر نکل آتا ہوں۔ میرے کمرے کا ساتھی دیر تک سوتا ہے اور اس لئے عموماً چابی کمرے کی اس کے پاس رہتی ہے۔ اس لئے میرے پاس چابی نہیں ہے اور کمرہ نہ کھول سکوں گا۔ کہنے لگے کہ ولایت میں تو ہر شخص کمرہ کا

چابی کاؤنٹر پر چھوڑ کر جاتا ہے۔ وہاں سے لے لیں گے۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب اس لڑکے کی عادت عجیب ہے وہ چونکہ جانتا ہے کہ میں اکثر کمرہ سے باہر اپنے شعبہ میں یا لائبریری میں رہتا ہوں اس لئے چابی وہ اپنے ساتھ ہی لے جاتا ہے۔ اس پر فرمایا کہ ایک ماسٹر کی بھی ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ ہوسٹل کے سب کمرے کھولے جا سکتے ہیں اس سے کھلوا لیں گے۔ اب تو میں سناٹے میں آ گیا اس لئے کہ جتنے بہانے میں بنا سکتا تھا بنائے مگر ان کے سامنے ایک نہ چلی۔ تو پھر میں نے لاچار ہو کر اصل بات بہ دل کڑا کہی جب در اصل میں آپ کو کمرے میں لے جانا نہیں چاہتا اس لئے کہ میرے ساتھی نے کمرے میں تین تصویریں لگا رکھی ہیں، اپنے لئے ایک آئینسٹائن کی میرے لئے ایک مہاتما گاندھی کی اور بقول اس کے ایک ننگی عورت کی تصویر ہم دونوں کے دل بہلانے کے لئے۔ میں نے کہا میں نے لاکھ بہانے بنائے لیکن ایک نہ بنا۔ اصلی حقیقت یہ ہے کہ در اصل ننگی عورت کی تصویر کے مد نظر میں آپ کو اپنے کمرے میں لے جانا نہ چاہتا تھا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب بولے تب تو میں ضرور ہی چلوں گا، کیونکہ یہی مجھے دیکھنا ہے کہ ننگی عورت کی تصویر کیسی ہے۔ ظاہر ہے ڈاکٹر صاحب بہت فراخ دل تھے۔ میرے اصلی حقیقت بتانے پر میری جتنی بہانے سازی تھی ان سب کو نظر انداز کر دیا۔

ہم لوگ ہوسٹل گئے۔ کاؤنٹر سے کمرے کی چابی لی۔ اور ڈاکٹر صاحب اور میں دھیرے دھیرے چڑھ کر کمرے پہنچے۔ اندر داخل ہو کر یہ دیکھ کر خوش ہوئے کہ کمرے کی ہر چیز قرینہ سے لگی ہوئی تھی۔ ننگی عورت کی تصویر کافی دیر تک اور غور سے ملاحظہ کی پھر کہنے لگے یہ تصویر اچھی نہیں ہے۔ ننگی عورتوں کی بہت سی تصویریں ہیں جو دنیا کے بہترین آرٹسٹ نے بنائی ہیں۔

مزید دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کو دنیا کے بہترین آرٹسٹ کی تصاویر جمع کرنے کا ایک مشغلہ تھا۔ اور اس کے تحت ان کے پاس مشہور آرٹسٹ کی تصاویر کا ایک بڑا ذخیرہ تھا لیکن ظاہر ہے کہ ایسی تصاویر جن کو دیکھ کر عام لوگ اچھی طرح اور صحیح طور پر جائزہ نہ لے سکیں، ان کو ڈاکٹر صاحب کو چھپا کر رکھنا پڑتا تھا۔ علی گڑھ واپسی پر نہ میری کبھی ہمت پڑی کہ میں ڈاکٹر صاحب سے تصویریں دیکھنے کی استدعا کرتا اور نہ ہی غالباً ان کو یاد رہا کہ وہ دکھاتے۔ اس لئے یہ بات وہیں ختم ہو گئی۔

ایک معرکۃ الآرا بات اس دوران میں یہ ہوئی کہ ان کو میری یونیورسٹی میں رہنے کے بعد ایسٹ لانسنگ جانا تھا، جہاں پر مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی تھی اور جہاں تعلیم کے متعلق نئے نئے تجربات ہو رہے تھے۔ وہاں جہاز یا ٹرین سے جانے کا راستہ بہت ٹیڑھا تھا اور ڈاکٹر صاحب اگر ان طریقوں میں سے کسی سے سفر کرتے تو راستے میں کئی بار جہاز یا ٹرین بدلنا پڑتی تو ڈاکٹر صاحب اس خیال سے پریشان تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ وہ جگہ تو بہت قریب ہے۔ بس سے وہاں

یہاں کی بہت اچھی ہے۔ بسیں ایرکنڈیشن ہوتی ہیں ان میں باتھ روم بھی ہوتا ہے۔ یہاں سے کل دو گھنٹے بس میں لگیں گے اور میں خود آپ کو یہاں سے وہاں پہنچا کر لوٹ آؤں گا۔ اس پر وہ فوراً راضی ہو گئے۔ میں ایک ٹیکسی میں بیٹھا کر ان کو بس اسٹینڈ لے گیا۔ وہاں پر ایک بس ایسٹ لانسنگ جانے کے لئے بالکل تیار تھی۔ اتفاق سے اسٹینڈ پر ایک امریکہ کا نوجوان اسی ملک کی ایک لڑکی کو پیار کر رہا تھا۔ کہنے لگے پہلے اس کو دیکھیں۔ اس میں بہت مزہ آئے گا۔ میں نے عرض کیا کہ اس کے دیکھنے میں بس چھوٹ جائے گی۔ تو کہنے لگے اس کے بعد بھی تو کوئی بس جاتی ہوگی وہ مل جائے گی۔ میں خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھ سے کہنے لگے کہ کیا تم کو دیکھنے میں کوئی پریشانی لگ رہی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا جواب دوں۔ تو خود ہی کہنے لگے۔ دیکھو میں تم کو ہدایت کرتا ہوں کہ جیسے جیسے عمر زیادہ ہونے لگے تو اپنے سے کم عمر خاص طور سے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے جذبات اور خیالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اور ان کی عزت کرو۔ ہر بات میں ان کا معیار تم سے مختلف ہوگا۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ خیالات بھی بدلتے جاتے ہیں۔ اگر تم نے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے جذبات سمجھنے کی کوشش نہ کی تو ہر نوجوان تم کو بڑھاپے میں سٹھیایا ہوا سمجھے گا اور تم ہر نوجوان آدمی اور نوجوان لڑکی کو خراب چال چلن کا سمجھو گے اس سے دونوں طرف کے لوگوں کو تکلیف ہوگی۔ دنیا میں ویسے ہی مسائل کیا کم ہیں کہ تم اپنے بڑھاپے میں ایک گنجلک قسم کا مسئلہ اپنے لئے مزید بنا لو اور دل ہی دل میں کڑھتے رہو۔

بہر حال ہم لوگ دوسری بس سے ایسٹ لانسنگ پہنچے۔ وہاں بس اسٹینڈ سے ٹیکسی لی۔ اور ان کی رہائش کے مقام پر جن کا ان کے پروگرام میں اندراج تھا پہنچے۔ وہاں جا کر انہوں نے اور میں نے دونوں نے منہ ہاتھ دھوئے۔ اور اورسنزہ کا عرق لیا۔ جب میں نے واپسی کی اجازت مانگی تو کہنے لگے اب میں تمہیں بس اسٹینڈ تک پہنچا دوں گا۔ میں نے بہت درخواست کی کہ اس کی ضرورت نہیں۔ کہنے لگے تھوڑی چہل قدمی ہو جائے گی۔ بس اسٹینڈ تو قریب ہی معلوم ہوتا ہے۔ میرے بار بار منع کرنے کے باوجود بھی وہ میرے ساتھ چل دیئے۔ آگے چل کر وہ سڑک دو سڑکوں میں تقسیم ہو گئی تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا کہ وہ ایک آدمی جا رہا ہے اس سے معلوم کر لوں کہ ان میں سے کون سا راستہ بس کے اڈے کو لے جائے گا۔ کہنے لگے جب دو آدمی چل رہے ہوں تو بھٹکنے میں بہت مزہ آتا ہے۔ اگر غلط چلے بھی گئے تو یہیں واپس آ کر پھر دوسری سڑک پر چلے چلیں گے۔ ہر چند کہ وہ بہت شفقت کرتے تھے جو ان کی بڑائی تھی مگر میری اتنی ہمت کہاں کہ ان کے کسی ارشاد کے بعد ان سے جرح کروں۔ میں اور وہ آگے بڑھے۔ اتنے میں ایک نوجوان خوبصورت لڑکی ادھر سے گذرتی ہوئی نظر آئی۔ فرمایا جلدی اس کے پاس جاؤ اور صحیح راستہ معلوم کرو۔ میں نے بڑی ہمت کر کے عرض کیا کہ ابھی ابھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ دو آدمی ساتھ ساتھ چل رہے ہوں تو بھٹکنے میں مزہ آتا ہے اور کسی سے راستہ نہ پوچھو۔ اس پر

کہنے لگے تو کیا تمہارا اس لڑکی کے پاس جا کر اس کو روک کر پوچھنا بچکانا نہیں کہلائے گا؟

باتیں تو زیادہ سی ہوگئیں اور قارئین سے ان کی طوالت کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔ لیکن یہ سب لمبی داستان اس لئے تحریر کیں کہ ذاکر صاحب کی زندگی کا وہ حسین پہلو جس سے پہلے میں واقف نہ تھا اور نہ شاید ہو سکتا اگر امریکہ میں چند دن ان کا ساتھ نہ رہتا، آپ حضرات کے سامنے بھی پیش کر دوں۔

ذاکر صاحب نے ایک دن میری یونیورسٹی کے قیام کے دوران میں مجھ سے پوچھا کہ کیا یہاں فوٹوگرافر کا کوئی اسٹوڈیو نہیں ہے۔ میں نے کہا وہ تو کئی ہیں۔ لیکن غالباً بہتر ہوگا کہ پہلے ٹیلی فون کر کے وقت کا تعین کر لیا جائے اس کے بعد چلیں۔ کہنے لگے ٹھیک ہے۔ ٹیلی فون کیا تو وقت جلدی مل گیا۔ ذاکر صاحب کہنے لگے کہ تھوڑی دیر آرام کر لوں اس کے بعد چلیں گے۔ کہتے ہی وہ سو گئے۔ اب میں بڑے سناٹے میں کہ یا اللہ اگر وہ وقت سے پہلے نہ جاگے تو میں کیا کروں گا۔ کمال یہ ہوا کہ وقت سے پانچ منٹ پہلے وہ فوراً جاگ کر اٹھ گئے اور بولے چلو۔ ہم لوگ اسٹوڈیو گئے۔ جب فوٹو لینے کا سوال آیا تو میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ بولے میں کیسے بے وقوف ہوں یا میرے فوٹو نہیں ہیں میں تو تمہارے ساتھ اپنا ایک فوٹو کھنچوانا چاہتا ہوں تاکہ تمہارے پاس بھی رہے اور میرے پاس بھی۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ فوٹوگرافر نے مختلف زاویوں سے چار فوٹوگراف لئے۔ جو سب سے اچھا تھا اس کی تین بڑی کاپیاں بنا کر ذاکر صاحب کے وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے ہی دے دیں۔ دو کاپیاں میں نے ذاکر صاحب کو دے دیں۔ اور ایک اپنے پاس رکھ لی۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ ہم دونوں کا وہ فوٹو[1] بہت ہی خوبصورت ہے۔ اس میں ذاکر صاحب نے سوٹ پہنا ہوا ہے۔ جو منجملہ اور فوٹو کے میرے ڈرائنگ روم کی زینت ہے۔ وہ فوٹوگراف ذاکر صاحب کے گھر والوں کو بہت پسند آیا۔ تو بعد میں جب میں شکاگو یونیورسٹی پروفیسر ہو کر گیا تو میں نے فوٹوگرافر کو خط لکھا کہ وہ ذاکر صاحب ہی کے فوٹو کو نکال کر اس کی تین کاپیاں بڑی بنا کر میرے پاس بھیج دے۔ اس نے جلد از جلد میرے پاس بھیج دیئے اور میں نے اس کے خرچ کی ادائیگی کر دی۔ جب شکاگو سے واپس آیا تو وہ فوٹوگراف ان کو پیش کئے۔ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اپنے خاندان والوں کو تقسیم کئے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب وہ فوٹو لیا گیا تھا تو ذاکر صاحب کی عمر ۵۳-۵۴ سال کی تھی۔ لیکن اس فوٹوگراف میں ان کی عمر بہت کم نظر آتی تھی۔ اور ذاکر صاحب کے انتقال کے بعد جب مختلف اخباروں اور رسائل نے ان کے مختلف فوٹوگراف شائع کئے تو اس فوٹوگراف کے نیچے لکھا "ذاکر صاحب کا جرمن کے دوران تعلیم کا فوٹو" حالانکہ وہ فوٹو میرے ساتھ والے فوٹوگراف کا ایک حصہ تھا جس کو اگر کوئی غور سے دیکھے تو ایک طرف میرے کندھے کا ایک حصہ بھی اس میں نظر آتا ہے۔

امریکہ میں میری تعلیم کے دوران میں ایک شب میرے ایک استاد پروفیسر کینتھ بولڈنگ نے جو نہ صرف امریکہ

---

[1] اس فوٹوگراف کا عکس صفحہ ۲۶ پر ملاحظہ ہو۔

کے بلکہ علم معاشیات میں یا دنیا کے بڑے ماہرین میں شمار ہوتے تھے، ڈاکر صاحب کو کھانے پر مدعو کیا۔ اور چونکہ ان کو علم تھا کہ میں اسی یونیورسٹی کا طالب علم رہ چکا تھا اور استاد کی حیثیت سے کام کر رہا تھا جہاں پر ڈاکر صاحب وائس چانسلر تھے تو انہوں نے ازراہِ کرم مجھ کو بھی ان کے ساتھ بلایا۔ کھانے پر غالباً اپنی مزید شفقت کے تحت جس کا میں حقدار نہ تھا ڈاکر صاحب سے انہوں نے میری بے حد تعریف کی جس سے ڈاکر صاحب کو یقیناً میرے متعلق اچھا خیال رہنے لگا ہوگا۔ یہ بات اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ جب میں امریکہ سے تعلیم حاصل کرکے واپس آیا، اور میرے پاس رہنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی تو ڈاکر صاحب نے پرووسٹوں کا جب نیا تقرر کیا تو ان کی محفل میں کہا کہ آپ لوگ جن اصحاب کو چاہیں اپنے ہال میں ہوسٹلوں کا وارڈن رکھیں۔ لیکن ایک صاحب کی میں سفارش کرتا ہوں جن کو ایسی جگہ رکھا جائے جس میں ان کی رہائش کا انتظام بھی ہو سکے۔ ڈاکٹر نورالحسن صاحب نے جو اس وقت تک پروفیسر نہ تھے لیکن عنقریب ہونے والے تھے، بلغیر نام سنے ہی کہہ دیا کہ میں راضی ہوں۔ دوسرے پرووسٹوں کو شاید یہ خیال ہوا ہو گا کہ وائس چانسلر اپنا ایک آدمی رکھنا چاہتے ہیں جو خبر رسانی کرتا رہے اس لئے انہوں نے تامل کیا جب ڈاکر صاحب نے میرا نام لیا تو اس پر ڈاکٹر نورالحسن صاحب نے فرمایا کہ وہ تو بہت نیک اور شریف آدمی ہیں اور ابھی ابھی امریکہ سے واپس آئے ہیں اس لئے ان کے رکھنے سے تو ہم کو نئے نئے خیال ملیں گے اور وہ تو ہمارے لئے بہت مددگار ثابت ہوں گے۔ ان کے اس بیان میں کتنی حقیقت پسندی تھی اور کتنی وائس چانسلر کی خوشنودی مدِ نظر تھی اس کو تو صرف نورالحسن صاحب جانتے ہوں گے بلکہ ڈاکٹر نورالحسن صاحب کے ساتھ کام کرنے سے پتہ چلا کہ وہ ایماندار آدمی تھے اور غالباً انہوں نے یہ بات نیک نیتی ہی سے کہی ہوگی۔ بہرکیف جب ڈاکٹر نورالحسن صاحب نے مجھ سے میرس ہوسٹل میں وارڈن ہونے کے لئے کہا تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے ازراہِ مہربانی میری رہائش کا انتظام کر دیا لیکن جس وقت مجھے یونیورسٹی کا مکان مل جائے گا اسی وقت میں مستعفی ہو جاؤں گا، اس پر وہ راضی ہو گئے۔ انہوں نے مجھے اپنے ہال کے کامن روم کا انچارج بھی بنا دیا۔ جس کو اس زمانہ میں یونیورسٹی کا بہترین کامن روم سمجھا جاتا تھا۔

(۲) میرے امریکہ سے واپس آتے ہی سید مجدالدین صاحب جو اس بات سے بہت تنگ ہو چکے تھے کہ ڈاکر صاحب اکثر محفلوں میں ان کی برائیاں کرتے رہتے تھے، اپنے عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔ ڈاکر صاحب سے کہہ دیا کہ اب چونکہ ایک نوجوان آدمی آپ کو اچھا مل گیا ہے آپ اس سے کام لیجئے اور میرا استعفیٰ فوراً منظور کیجئے۔ ڈاکر صاحب نے ان کو کچھ عرصہ روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانے۔ تو ڈاکر صاحب نے ان کا استعفیٰ منظور کر لیا اور وہ بادلِ ناخواستہ پاکستان چلے گئے جہاں وہ اپنی طبیعت سے ہرگز نہ جانا چاہتے تھے۔ چونکہ وہ میرے محسن تھے اور میں ان کو بہت

چاہتا تھا اسلئے ان کے جانے سے مجھے بہت رنج ہوا۔

یہ بات ۵۸-۱۹۵۷ء کی تھی۔ اس سال انڈین اکنامکس ایسوسی ایشن کی کانفرنس ٹراونڈرم میں ہوئی تھی جس میں میں نے بھی شرکت کی اور ڈاکٹر علی محمد خسرو جو انگلستان سے تعلیم حاصل کرکے واپس آئے تھے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں کام کرتے تھے انہوں نے بھی۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ پروفیسر وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راو جو اس زمانہ میں معاشیات کے جید عالم سمجھے جاتے تھے (اور آج بھی ملک میں تنہا نیشنل پروفیسر ہیں) اس وقت دہلی اسکول آف اکنامکس کے ڈائرکٹر تھے۔ انہوں نے میرے مقالہ کو بہت پسند کیا اور اس کی کٹی کاپیاں مجھ سے لے کر دہلی آئے اور اپنے ساتھیوں کو بھی دکھائیں۔ انہوں نے مجھے اس بات کی دعوت دی کہ میں دہلی اسکول آف اکنامکس میں کسی اچھے عہدہ پر کام کرنے کے لئے آمادہ ہو جاؤں جس کے لئے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن اس وجہ سے انکار کر دیا کہ میں ذاکر صاحب سے وعدہ کر چکا تھا کہ میں تاحیات مسلم یونیورسٹی کی خدمت کرتا رہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر علی محمد خسرو کا مقالہ بھی بہت پسند کیا ہوگا۔ اور شاید ان کو بھی اس قسم کی دعوت دی ہوگی جس کا مجھے صحیح علم نہیں ہے۔ مگر میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ڈاکٹر علی محمد خسرو کا مقالہ اور اس کے پیش کرنے کا طریقہ دونوں بہت پسند آئے۔ اور بعد میں فرصت کے وقت ان سے میں نے کہا کہ علیگڑھ میں ایک ریڈر اور شعبہ کے چیرمین کی جگہ خالی ہے جب مشتہر ہو تو آپ درخواست دیں اور اگر آپ ہم لوگوں کی قیادت کریں گے تو آپ کی بہت مہربانی ہوگی اور شعبہ کی شہرت بھی ہوگی۔

ادھر ذاکر صاحب کی سنئے کہ ایک مرتبہ ولایت کے کسی مہمان کو لے کر دن کا۔ ایم یال کے کامن روم کو دکھانے کے لئے تشریف لائے۔ جس کا میں انچارج تھا۔ میں کامن روم میں ان کے استقبال کے لئے تیار رہتا۔ ذاکر صاحب چپکے سے مجھے ایک طرف لے گئے اور فرمایا کہ شعبہ میں ریڈر کی ایک جگہ خالی ہے۔ اس کے اشتہار کا ایک مسودہ بنا کر کل میرے پاس لے آنا۔ میں دوسرے دن ان کے پاس مسودہ بنا کر لے گیا۔ ان کے پاس زبیری صاحب جو اس زمانہ میں رجسٹرار تھے بیٹھے تھے۔ مجھے ذاکر صاحب نے اندر بلالیا۔ میں نے ان کی خدمت میں مسودہ پیش کیا۔ انہوں نے اپنا کالا عینک جس کو وہ پہنے رہتے تھے اتار کر پڑھنے والا عینک لگا کر دیکھا۔ اور پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولے کہ کیا تم مجھ کو بے وقوف سمجھتے ہو۔ میں گھبرا گیا اور عرض کیا کہ اگر کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معافی کا خواستگار ہوں۔ انہوں نے مسودہ زبیری صاحب کی طرف بڑھا کر کہا کہ آپ یونیورسٹی کے رجسٹرار ہیں اگر میں آپ سے مسودہ بنانے کے لئے کہتا تو کیا آپ اس سے مختلف بناتے۔ انہوں نے جواب دیا "نہیں حضور میں تو یہی بناتا"۔ تو ذاکر صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ پھر میں نے اس کام کے کرنے کو تم سے کیوں کہا۔ میری سمجھ میں نہ آیا۔ ویسے ہی سہما ہوا تھا۔ فرمایا وہ چیزیں لکھ کر لاؤ جن پر تم پورے اترتے ہو۔

مجھے تمہیں ریڈر بنانا ہے۔ میں نے بہت معذرت کے بعد عرض کیا کہ لیکن میں تو ڈاکٹر علی محمد خسرو کو جو عثمانیہ یونیورسٹی میں ملازمت کرتے ہیں ان کو یہاں آنے کی دعوت دے کر آ رہا ہوں۔ کہنے لگے تمہیں ان باتوں کا اختیار کس نے دیا ہے۔ اور کیا ضروری ہے کہ وہ آئیں تو ان کا تقرر بھی ہو جائے۔ درخواست دینے والے تو بہت سے ہوتے ہیں جو سب سے اچھا ہوتا ہے اس کو لیا جاتا ہے۔ اب آپ یقین کیجئے کہ میرے دل میں آیا کہ میں ان سے کہوں کہ پھر اشتہار ایسا ہونا چاہیئے جیسا کہ جس کا مسودہ بنائے لیکن میری اخلاقی کمزوری تھی کہ میری ذاکر صاحب کے سامنے یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آپ اس کو جس طرح چاہیں تعبیر کریں، لیکن میں یہ یقین آپ کو دلا سکتا ہوں کہ اس میں میرا ذاتی لالچ شامل نہ تھا اس لئے کہ میں اپنی کمزوریوں اور نااہلی سے ہمیشہ واقف رہا ہوں اور آج بھی ہوں۔

بہرحال اس جگہ کا اشتہار ہو گیا۔ اس میں میرے علاوہ خسرو صاحب، ڈاکٹر منیجی صاحب جو میرے ساتھ شعبہ میں کام کرتے تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک فاضل ڈاکٹر نصیر الدین صاحب بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ اور کون لوگ تھے مجھے یاد نہیں۔ اس لئے کہ انٹرویو میں یہی چار آدمی آئے۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرا تقرر ہو گیا تو میں ذاکر صاحب کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے یقین ہے کہ خسرو صاحب مجھ سے کہیں بہتر تھے، آپ نے ان کا تقرر کیوں نہ کیا۔ کہنے لگے وہ بھی بہت اچھے تھے لیکن تمہارے برابر اچھے نہ تھے اس لئے میں نے ان کو نہیں رکھا۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ اگر شعبہ میں ریڈر کی دوسری جگہ خالی ہوتی تو یقیناً ان کو رکھ لیتا اس لئے کہ اچھے آدمی کا ملنا مشکل ہوتا ہے۔

بحیثیت ریڈر میری تقرری کے بعد ذاکر صاحب نے فرمایا کہ جس کو تم اچھا سمجھو اور یہ یقین کر لو کہ یہ ترقی کر سکتا ہے اس کی کسی بھی طرح سے مدد کرو اور تقرر کرو۔ اب میں شعبہ کو بڑھانے کی ذمہ داری تمہارے سپرد کرتا ہوں۔

(۳) قارئین میں سے اکثر کو معلوم ہوگا کہ ذاکر صاحب قائم گنج کے ایک مشہور پٹھان خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور پہلے اپنا نام ذاکر حسین خاں لکھتے تھے۔ ان کے سب خاندان والے آج بھی اپنے نام کے آگے خاں لکھتے ہیں۔ لیکن جس زمانہ میں وہ شیخ الجامعہ تھے اس زمانہ میں کسی وقت انہوں نے اپنے نام سے خاں لکھنا بند کر دیا تھا۔ جس کی وجہ وہ یہ بتاتے تھے کہ خاں تو وہ لکھے جو جاہل ہو اور اکثر و بیشتر لڑنے مرنے پر آمادہ رہے۔ اپنے دل میں سے پرانی دشمنی کو نہ نکالے۔ کہتے تھے کہ میں چونکہ پڑھا لکھا اور شریف انسان ہوں تو اپنے نام کے ساتھ خاں کیوں لکھوں۔ اور خاں نہ لکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کی چھوٹی بیٹی کے پیام کا معاملہ درپیش ہوا تو ان کے کہنے کے مطابق اس بات کی تحقیق سسرال والوں کی طرف سے کی گئی کہ ذاکر صاحب پٹھان ہیں بھی یا یوں ہی دھوکے چلا رہے ہیں۔ لیکن میں نے اپنے مشاہدہ

میں نے یہ دیکھا کہ ان کے خان نہ لکھنے کے باوجود ان کے اندر پٹھانوں کی وہ سب خصوصیات تھیں جن کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک بڑے آدمی ہونے کے وجہ سے اس کا اظہار کم ہونے دیتے تھے۔ اس کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ میں اس وقت صرف چار مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

اول تو یہ ہے کہ اپنی طالب علمی کے زمانہ میں جب کہ وہ یونیورسٹی کے وائس پریسیڈنٹ تھے (واضح رہے کہ اس زمانہ میں پریسیڈنٹ یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوا کرتا تھا) تو سید حمید الدین صاحب سینئر کیبنٹ تھے جو وائس پریسیڈنٹ کی عدم موجودگی میں صدارت کر سکتے تھے کسی معاملہ میں ذاکر صاحب کا سید صاحب سے تصادم ہو گیا۔ وہ اس کو کبھی بھول نہ سکے۔ انھیں اکثر و بیشتر وہ سید صاحب کی بُرائی بہت سخت الفاظ میں کرتے رہتے تھے، اور معاشیات کے کسی بھی جلسہ میں حتیٰ کہ جب معاشیات کی آل انڈیا اکنامکس کانفرنس ہوئی اس میں بھی علی الاعلان کہا کہ شعبہ معاشیات کے صدر نالائق ہیں، اور مجھے کسی اچھے صدر کی تلاش ہے۔ یونیورسٹی کے ہر کنووکیشن کے موقع پر یہ بات ضرور دہراتے تھے بھی نہیں یونیورسٹی کے دوسرے شعبہ جات میں انہوں نے سید صاحب سے کم لیاقت کے لوگوں کو پروفیسر بھی بنایا لیکن ذاکر صاحب کی شرافت کا ایک پہلو یہ تھا کہ ایک مرتبہ جب میں ان سے ملنے گیا تو میرے سامنے وہ کچھ لوگوں کی محفل میں سید صاحب کی برائی سخت الفاظ میں کر رہے تھے میں وہاں سے اٹھ کے چل دیا تو کہا تم ملنے آئے تھے، کوئی بات کرنا ہوگی، اب واپس کیوں جا رہے ہو، میں نے عرض کیا کہ میں سید صاحب کی دل سے عزت اور قدر کرتا ہوں اور ان کے خلاف کوئی بات کسی سے بھی نہیں سن سکتا، چاہے وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہی کیوں نہ ہوں، تو انہوں نے میری بات کا برا نہ مانا اور کہا کہ اگر ایسا ہے تو میں تمہاری موجودگی میں کبھی ان کی برائی نہ کروں گا۔ سچ یہ ہے کہ بڑا آدمی بڑا ہی ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید میرے اس عمل اور میرے اس طرح کہنے سے وہ ہمیشہ کے لئے خفا ہو جاتا۔

دوسری مثال یہ ہے کہ جب میں امریکہ میں تعلیم پا رہا تھا اور ذاکر صاحب نے میری یونیورسٹی میں کچھ دنوں قیام کیا تو ان کے پاس امریکہ کی گورنمنٹ سے وقتاً فوقتاً اخراجات کے لئے چیک آتے تھے۔ ایک دن اس چیک سے روپیہ لینے کے لئے وہ میرے ساتھ اول وقت میں ایک بینک میں گئے، بینک کے اکثر کاؤنٹر خالی تھے۔ ایک کاؤنٹر پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس سے جب ذاکر صاحب نے چیک کے بدلے روپیہ طلب کیا تو اس نے ان سے پاسپورٹ دکھانے کو کہا۔ اتفاق سے اس وقت ان کے پاس پاسپورٹ نہ تھا، اسے وہ اپنے کمرے میں چھوڑ گئے تھے۔ وہ پاسپورٹ لینے واپس آئے اور پاسپورٹ لے کر جب دوبارہ بینک پہنچے تو اس لڑکی کے کاؤنٹر پر بڑی بھیڑ تھی اور لوگوں کی ایک لمبی لائن لگی تھی۔ دوسرے کاؤنٹر میں ہر قدرے کم آدمی تھے اور ایک پر تو بہت کم تھے۔ میں نے ذاکر صاحب سے عرض کیا کہ صاحب

آپ کو دل کا دورہ ہو چکا ہے، زیادہ دیر تک کاؤنٹر کے سامنے لائن میں کھڑا رہنا مناسب نہیں۔ پتہ نہیں کتنی دیر میں نمبر آئے۔ دوسرے کاؤنٹر سے روپے لے لیں تو بہتر ہوگا۔ انہوں نے کافی غصہ کے انداز میں کہا کہ اب اگر میں روپیہ لوں گا تو اسی لڑکی سے یا سپورٹ دکھا کر لوں گا۔ چاہے مجھے پورے دن ہی کیوں نہ کھڑا رہنا پڑے۔

تیسری مثال یہ ہے کہ جب میں امریکہ سے تعلیم حاصل کرکے واپس آیا تو ذاکر صاحب نے مجھ سے کہا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اصول معاشیات کے نئے خیالات کو سادہ طور پر اس طرح لکھا جائے کہ اس پر قدیم و جدید خیالات کا موثر واضح طور پر نظر آئے۔ اس سے طالب علموں کو معاشیات میں جو ترقی ہوئی ہے اس کے متعلق صحیح طور پر معلومات ہو جائے گی۔ میں نے عرض کیا کہ یہ بالکل ممکن ہے۔ اور میں یہ کام انشاء اللہ جلد ہی انجام دے دوں گا۔ لیکن آپ کو تکلیف اتنی دوں گا کہ آپ اس کو دیکھتے جائیں اور اس میں آپ جو ترمیم و تنسیخ کا مشورہ دیں، وہ میں کر دوں گا۔ وہ اس پر راضی ہو گئے۔ میں نے یہ کام بفضلہ جلد ہی انجام دے دیا۔ انہوں نے میرا لکھا ہوا بہت پسند کیا اور کہنے لگے کہ بجائے اس کے کہ اس کو کتاب کی شکل میں شائع کیا جائے اس کو سائیکلو اسٹائل کرنا چاہیئے۔ اور یہ کام میں اپنی نگرانی میں کروا دوں گا۔ اس کے بعد دو ایک سال طلباء میں اس کو مفت تقسیم کرکے اس قسم کی تعلیم دی جائے۔ اس کام کو بھی انہوں نے بہت تیزی سے کروا دیا اور مجھ سے کہا کہ فوراً اس کو پڑھانا شروع کر دو۔ اب ظاہر ہے کہ یہ کتاب یا مسودہ اس سے بہت مختلف تھا جو اس سال کے سلیبس میں لکھا ہوا تھا۔ بہر حال میں نے یہ کتاب طلباء میں تقسیم کی اور ان کو اسی طرح پڑھانا شروع کر دیا۔ اس پر طالب علموں نے خفگی کا اظہار کیا۔ اور سب کے سب میرے خلاف ایک جلوس لے کر ذاکر صاحب کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ ہم تو وہی پڑھیں گے جو سلیبس میں لکھا ہے اس سے علیحدہ ہم کچھ نہیں پڑھ سکتے۔ ذاکر صاحب نے ان لوگوں سے سوال کیا کہ کیا اس وقت سب طلباء آئے ہیں یا کوئی باقی بچا ہے۔ طلباء اور طالبات نے بتایا کہ ایم۔ اے پریویس اور فائنل کے سب طالب علم ہیں، تو ذاکر صاحب نے ان سے بہت غصہ میں کہا کہ اچھا میں آج ہی تم سب کو یونیورسٹی سے نکالنے کا حکم دیتا ہوں، تم لوگ بستر باندھو اور گھر جاؤ۔ اگر دو چار سال ایم۔ اے میں معاشیات کا کوئی طالب علم نہیں ہوگا تو کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا۔ جب مجھے اس کا علم ہوا تو میں ذاکر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ ذاکر صاحب ان کا مطالبہ تو بالکل صحیح ہے۔ پھر آپ نے ایسا حکم کیوں دیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ اگر کوئی کام میری مرضی کے مطابق نہ ہو تو میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اور اب تو میں کہتا ہوں کہ اگر ان طلباء کو یہاں پڑھنا ہے تو یہ مضمون تم ہی پڑھاؤ گے اور میں خود ان کا ممتحن ہوں گا اور اس کتاب کے علاوہ کوئی سوال نہیں ہوگا، چاہے اس کا سلیبس سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو اسی کے مطابق طالب علموں کو امتحان دینا ہوگا۔ میں سن کر خاموش واپس آگیا۔

طلبا سے یہ بات بتائی، اس کے بعد سب کے سب بدرجہ مجبوری اسی کتاب کے مطابق پڑھنے پر تیار ہو گئے۔

اور آخری مثال یہ ہے کہ ایک دن شعبہ کے ساتھیوں نے مجھ سے بار بار کہا کہ کل رات کو آپ ہم سب لوگوں کی دعوت کریں۔ میں ان سے معذرت کرتا رہا۔ اتنے میں ہماری ایک مزید ساتھی (ڈاکٹر مسعودہ خانم) آگئی۔ پہلے تو وہ میری شاگرد رہ چکی تھی۔ اس کے بعد امریکہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے شعبہ میں عارضی لکچرر ہو گئی تھی۔ اس لڑکی کی انتہائی اچھی خصلت تھی اور دیکھنے میں بھی خوبصورت تھی جب اس کو معلوم ہوا کہ سب لوگوں کے اصرار پر بھی میں دعوت دینے پر تیار نہیں ہو رہا ہوں تو اس نے کہا کہ شبیر صاحب اب میرے کہنے پر آپ دعوت کریں۔ تو میں نے کہا اچھا مسعودہ چونکہ تم کہتی ہو تو دعوت ضرور کروں گا۔ اتنے میں ذاکر صاحب شعبہ میں آگئے۔ وہ تو آنریری پروفیسر تھے اور اکثر وہیں آتے رہتے تھے۔ تو ایک صاحب جو ذرا کھل کر بات کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے پوری داستان ذاکر صاحب کو سنائی اور کہا کہ دیکھئے آپ شبیر صاحب کو اتنا جانتے ہیں اور ان کی حالت یہ ہے کہ ہم سب کی درخواست کو تو انہوں نے ٹھکرا دیا۔ اور ایک خوبصورت لڑکی کے کہنے پر فوراً تیار ہو گئے۔ ذاکر صاحب بولے کہ اگر شبیر صاحب لڑکی اور وہ بھی خوبصورت لڑکی کے کہنے پر تیار نہ ہوتے تو ان کے برابر میں کسی اور آدمی کو نالائق نہ سمجھتا۔ جب لڑکی دعوت کا مطالبہ کرے تو دعوت ضرور ہی ہونا چاہئے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے کہ کیا اس دعوت میں مجھ کو بھی بلایا جائے گا؟ میں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شعبہ کے سب لوگوں کی دعوت ہو اور اس میں آپ شامل نہ ہوں۔ بولے کھانا ٹھیک آٹھ بجے شب میں ہو۔ اور اس میں اچھا مرغ اور اچھی تلی ہوئی مچھلی ضرور ہونا چاہئے۔ چونکہ مجھ کو ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔ ڈاکٹروں نے ہدایت کی ہے کہ کھانا ٹھیک وقت پر ہونا چاہئے اور میں شام کا کھانا آٹھ بجے کھاتا ہوں۔ میں نے کہا یہ تو مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ کیونکہ آپ میرے یہاں اس سے پہلے بھی کئی دفعہ کھانا کھا چکے ہیں۔ بولے پھر بھی یاد دلانا ضروری ہے۔ سردی کا مہینہ تھا جس میں اندھیرا جلدی ہو جاتا تھا۔ اب یہ اتفاق کی بات ہے کہ ادھر میں دعوت کی تیاری کر رہا تھا اور ادھر مسعودہ قریب ساڑھے سات بجے میرے پاس روتی ہوئی آئی۔ وہ اتنا رو رہی تھی کہ کوئی بات کرنا مشکل تھی۔ بمشکل تمام میرے تسلی دینے اور اصرار کرنے پر اس نے مجھے بتایا کہ میرے ایک سگے چچا ہیں جو رنگون میں رہتے ہیں، آئے ہیں۔ اور چونکہ میرے باپ کا انتقال ہو گیا ہے اس لئے وہ مجھ سے جائداد سے متعلق بہت لڑ رہے ہیں۔ بہت بری بری باتیں کر رہے ہیں اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر تو اس وقت کھانا کھائے تو یہ سمجھ لے کہ تو نے سور کا گوشت کھایا ہے۔ اور اس وجہ سے میں آپ کی دعوت میں جو آپ نے میرے کہنے پر کی ہے نہ آسکوں گی۔ وہ چونکہ نیک اور مسلمان لڑکی تھی اور روزہ نماز کی پابند تھی اس لئے ایسی بات سن کر بھی کیا کر سکتی تھی۔ میں نے اسے دلاسہ دیا اور میں نے اس سے کہا کہ بیٹی تم اس بات کی بالکل پرواہ نہ کرو، تم کھانے میں شرکت نہ کرسکو گی تو میں بڑا

ہرگز نہ مانوں گا۔ ذاکر صاحب وقت کے بہت پابند تھے اور شعبہ کے سب لوگ ان کی عادت کو جانتے تھے اس لئے سب کے سب مسعودہ کے علاوہ آٹھ سے کافی دیر پہلے آگئے اور ذاکر صاحب ٹھیک آٹھ بجنے میں پانچ منٹ پہلے تشریف لائے۔ میں نے آٹھ بجے ذاکر صاحب سے درخواست کی کہ آپ کو چونکہ وقت کی پابندی کھانا کھانے میں لازم ہے اس لئے میں نے کھانا میز پر لگوا دیا ہے تاکہ آپ لوگ وقت پر کھانا کھا سکیں۔ بولے یہ دعوت تو مسعودہ کے لئے کی گئی ہے۔ ہم لوگ تو طفیلی کی حیثیت سے بلائے گئے ہیں لہٰذا مسعودہ کے آنے سے پہلے کھانا شروع نہیں کیا جا سکتا۔ اب آپ لوگ اس کو میری بے وقوفی اور نادانی سے تعبیر کریں یا یہ سوچیں کہ یہ میرا فرض تھا کسی کا راز راز ہی رہنا چاہئے۔ میں نے یہ بات کہنا مناسب نہ سمجھا کہ مسعودہ کسی وجہ سے میرے پاس آکر معذرت کر گئی ہے۔ اب وقت گذرتا گیا۔ میرے لئے ایک منٹ ایک گھنٹہ کے برابر ہو رہا تھا۔ اور بار بار ذاکر صاحب سے درخواست کرتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب دیر ہوئی جا رہی ہے آپ کی تندرستی کے مد نظر یہ تاخیر مناسب نہیں اور اب اگر آپ اجازت دیں تو کھانا گرم کر کے لگوا دیا جائے۔ مگر ذاکر صاحب تھے کہ بضد تھے کہ میں ہرگز کھانا نہ کھاؤں گا جب تک مسعودہ نہ آئے گی۔ دوسرے لوگ اگر کھانا کھانا چاہیں تو کھانا کھالیں۔ اب یہ کس کی ہمت تھی کہ کھانا کھا لیتا۔ میرے تو پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اور ایسا لگتا تھا کہ کاٹو تو بدن میں خون کا ایک قطرہ نہ نکلے گا۔ مگر ذاکر صاحب تھے کہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اب یہ میری قسمت دیکھئے کہ کوئی قریب دس بجنے دس بجے مسعودہ مسکراتی ہوئی آئی اور سب کو بیٹھا دیکھ کر بولی کہ معافی چاہتی ہوں کہ آنے میں اتنی دیر ہوگئی۔ میں نے تو سوچا تھا آپ لوگ کھانا کھا کر چلے گئے ہوں گے اور میں شبیر صاحب کے یہاں بچا کھچا کھانا کھا لوں گی۔ مگر آپ لوگ تو کھانا کھانے کے بجائے اتنی دیر تک باتیں کر رہے ہیں جب کہ سردی کی راتوں میں تو یہ بہت دیر کا وقت ہے۔ سب لوگوں نے بیک وقت کہا کہ ہم لوگ آپ کے انتظار میں بیٹھے ہیں اس لئے کہ ذاکر صاحب نے یہ بات ٹھان لی ہے کہ بغیر مسعودہ کے کھانا نہیں کھایا جائے گا۔ مسعودہ سناٹے میں رہ گئی۔ لیکن ذاکر صاحب نے کہا کہ اصل مہمان کے بغیر کھانا کیسے کھایا جا سکتا تھا چاہے پوری رات انتظار میں گذر جاتی۔ پھر سب لوگوں نے خوشی خوشی کھانا کھایا۔ اور کھانے کے بعد بھی ذاکر صاحب آدھ گھنٹہ کے قریب بیٹھ کر خوش گپیاں کر کے واپس گئے۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے ان کی صحت کے لئے دعا کی اور خدا کا شکر ہے کہ میری دعا اس نے قبول کی اور ذاکر صاحب کی صحت اچھی رہی۔

اب آپ لوگ ان کی اس بات اور ضد کو شرافت سے تعبیر کریں یا بچوں جیسی ضد سے۔ میرے خیال سے تو یہ دونوں باتیں ملی جلی ہیں۔

(۴) ذاکر صاحب ایک بہت بڑی ہستی تھے اور پورے ہندوستان میں بہت سے لوگ صرف ان کے مداحوں

میں ہی بلکہ ان کو اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر ان کو اپنا آئیڈیل مانتا ہوں۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر چند کہ وہ بہت بڑی شخصیت کے حامل تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ انسان بھی تھے۔ انہوں نے مجھ سے کئی بار کہا کہ تمہارا دشمن زندگی میں یہ چاہے گا کہ تم کو تکلیف پہنچائے اور اپنے کسی قول یا فعل سے وہ تم کو تکلیف میں دیکھنا چاہے گا۔ لیکن اگر وہ تم کو تکلیف پہنچانا چاہے تو تم اس کو خوش کرنے کی کوشش کیوں کرو۔ تم کو اپنے سے نیچے لوگوں کی یا دشمنوں کی خراب اور گندی حرکتوں اور باتوں سے تکلیف نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ وہ ان کی خوشی کا باعث ہوتی ہیں۔ اگر تم ان کی برائی کرنے کے باوجود خود خوش نظر آؤ گے تو اس کو تکلیف ہوگی اور میرے خیال سے تمہارا رد عمل یہی ہونا چاہئے۔ مگر میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ ایسے لوگ جو ذاکر صاحب سے دشمنی رکھتے تھے ان کے غلط کہنے یا لکھنے سے ذاکر صاحب کو خود تکلیف ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر انہوں نے ایک بار مجھے خود ایک خط پڑھ کر سنایا جو اپنے کسی دوست کو نیاگرا فال کے دیکھنے کے بعد اس کی خوبصورتی کے بارے میں لکھا تھا۔ نیاگرا فال اتفاق سے میں بھی دیکھ چکا ہوں۔ بہت ہی خوبصورت اور پر فضا جگہ ہے اور پہاڑ سے جس زور و شور سے پانی گرتا ہے اس کی خوبصورتی بیان سے باہر ہے۔ اگر اس کو کناڈا کے حصہ کی طرف سے دیکھا جائے تو اور بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ ذاکر صاحب نے بھی اس کو امریکہ اور کناڈا دونوں طرف سے دیکھا تھا۔ ذاکر صاحب غضب کے لکھنے والے تھے۔ نیاگرا فال کی خوبصورتی اور پر فضا ہونے کے بارے میں جب انہوں نے لکھا تو وہم و گمان میں بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کوئی شخص اس خوبصورتی کی سادہ اس کی عکاسی کر سکتا ہے۔ مگر اس کے بعد فوراً ہی لکھا کہ اگر اس کو عبدالماجد دریابادی کو دیکھنے کو ملتا تو وہ اپنے کسی مضمون میں بیان کرتے کہ جس زور شور سے پانی پہاڑ سے گر رہا تھا، اس زور شور سے قیامت کے بعد جہنم کی آگ ذاکر حسین کے اوپر گرے گی۔ میں نے ذاکر صاحب سے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب اس کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ بولے ان صاحب کو یہ بات بہت ناگوار گذری ہے کہ راج سبھا میں میری نامزدگی ہوئی ہے لہٰذا اس لئے کہ میرے ساتھ اور جن لوگوں کی نامزدگی ہوئی ہے اس میں پرتھوی راج کپور بھی ہیں جو بہت بڑے فلمی آرٹسٹ ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اب ہندوستان کے مسلمانوں کو خوشی کے چراغ جلانا چاہئے اور مٹھائی بانٹنا چاہئے کہ ان کے لیڈر ذاکر حسین کو نچنیوں اور گویوں کی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔ میں نے ذاکر صاحب سے عرض کیا کہ آپ ایسے لوگوں کے خیالات سے کیوں متاثر ہوتے ہیں۔ اس پر فرمایا کہ تم نے غالب کے مصرع کو سنا نہیں۔ ع۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں۔
تو ظاہر ہے چونکہ خود انسان تھے لہٰذا جو بات وہ مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے اس پر خود بھی عمل نہ کر سکتے تھے۔
لیکن وہ ملک کے تمام علماء دین کو نیچا نہ سمجھتے تھے۔ مثلاً مجھ کو اس کا علم ہے کہ وہ حسین احمد مدنی صاحب کے بہت مداح

تھے۔ اور اسی طرح وہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی بھی بہت قدر کرتے تھے۔

(۵) ذاکر صاحب کتابیں پڑھنے کے بہت شوقین تھے۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ دوسرے مضامین میں کتنی دلچسپی رکھتے تھے لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ علم معاشیات کی جو بھی کتابیں آتی تھیں اور بڑے مصنفین کی لکھی ہوئی ہوتی تھیں، نہ صرف اس زمانہ میں جب کہ علی گڑھ میں وائس چانسلر تھے بلکہ جس زمانہ میں گورنر، وائس پریسیڈنٹ اور پریسیڈنٹ تھے اکثر و بیشتر کتابوں کی فہرست میرے پاس بھیجتے تھے اور لکھتے تھے کہ ان کتابوں میں سے جو بھی یونیورسٹی کی لائبریری یا شعبہ کی لائبریری میں مل سکیں ہیں ان کے پاس بھجوا دوں۔ میں اکثر کتابیں ان کے پاس بھجواتا تھا وہ یقیناً ان کتابوں کو پڑھتے تھے۔ اس لئے کہ جب بھی ان سے ملاقات کا موقعہ ملتا تھا تو ان خیالات کے متعلق جو ان کتابوں میں لکھے ہوئے ہوتے تھے گفتگو کیا کرتے تھے۔ اب یہ کہنا میرے لئے فضول ہے کہ وہ انتہائی ذہین آدمی تھے اس کو غالباً ہر شخص جانتا ہے۔ بعض اوقات ایسی چیزیں جو ریاضی میں لکھی ہوتی تھیں ان کو بھی وہ اپنی ذہنی قابلیت کی بنا پر سمجھ لیتے تھے۔ اور اکثر کہا کرتے تھے کہ ہر مضمون کے لئے زبان بدلتی رہتی ہے اور اگر اس مضمون کو صحیح طور پر سمجھنا ہے تو اس کی زبان پر عبور کرنا لازم ہے۔ اب سے قریب تیس چالیس سال پہلے معاشیات کے خیالات اکثر و بیشتر انگریزی اور دوسری زبانوں میں لکھے جاتے تھے علم معاشیات کے جو بھی طالب علم ہونا چاہتے ہیں ان کو ان زبانوں پر عبور حاصل کرنا لازم تھا۔ اب اس مضمون میں اکثر چیزیں علم ریاضی سے متعلق ہوتی ہیں۔ لہٰذا اب اگر کوئی علم معاشیات میں مہارت حاصل کرنا چاہے تو اس کا فرض ہے کہ ریاضی کی تعلیم حاصل کرے۔ انکی اس بات سے متاثر ہو کر جب میں پروفیسر معاشیات اور مستقل صدر شعبہ مقرر ہوا تو میں نے اپنے ہر ایک ساتھی کے ساتھ اپنے کو بھی شامل کر کے یہ لازم کر دیا تھا کہ ریاضی کی تعلیم حاصل کرے چنانچہ ہم لوگ سہ پہر کو ایک ریاضی کے استاد کو معاوضہ دے کر ان سے ہفتہ میں تین دن دو دو گھنٹہ ریاضی پڑھا کرتے تھے اور جو بھی سوالات دیئے جاتے تھے ان کو حل کر کے دکھا کرتے تھے۔ چونکہ شعبہ میں اس کام کے لئے کوئی بجٹ نہ تھا اس لئے ہم لوگ آپس میں مل کر روپیہ جمع کر کے ایک معقول رقم لفافہ میں رکھ کر اپنے استاد کو دیا کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کے متعلق یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جب وہ منگائی ہوئی کتابیں واپس بھیجتے تھے تو ان کے ساتھ اور بھی کتابیں جو لوگ اس ملک کے اور باہر کے ممالک انکو بھیجا کرتے تھے ہمارے یہاں بھیج دیا کرتے تھے۔ اور خط میں لکھتے تھے کہ چونکہ میں نے آپ کے یہاں کی کتابوں سے نفع اٹھایا ہے تو اس کے عوض سود بھیجنا لازم ہے۔ اس لئے مزید کتابیں سود کے طور پر بھیج رہا ہوں امید ہے کہ ان سے دوسرے لوگ بھی فائدہ اٹھا سکیں گے۔

(۶) ذاکر صاحب اس خیال کے حامی تھے کہ انسان کو انسان کی طرح کام کرنا چاہیئے، مشین کی طرح نہیں۔ مشین کا کام یہ ہوتا ہے جو بھی اس کا کام ہوتا، اس کو اسی طرح کئے جاتی ہے۔ لیکن انسان کے اصولوں میں لچک ہونا چاہیئے۔ اور اگر کام

مناسب ہے اور انسان کو اس کے مناسب ہونے کا یقین ہے تو اس کام کو کرنے کے لئے کوئی بھی طریقہ اختیار کرنا پڑے۔ اس کے کرنے میں عار نہیں ہونا چاہیے۔ ان کے کام کرنے کا جو طریقہ تھا اس کی دو مثالیں میں قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ایک تو یہ کہ میرے ایک طالب علم تھے جن کے متعلق مجھے یقین تھا کہ ان کے اندر کامن سینس کی تو تھوڑی کمی تھی، لیکن پڑھنے لکھنے میں بہت ہوشیار تھے۔ اور محنت کرنے کا جذبہ ان کے اندر بہت تھا۔ ان کی بدقسمتی سے ان کا ایم۔ اے میں فرسٹ کلاس نہ آ سکا۔ جب ایک جگہ لکچرر کی شعبہ میں خالی ہوئی تو میں نے ذاکر صاحب سے عرض کیا کہ میرے خیال میں یہ طالب علم بہت اچھے رہیں گے۔ اور یقیناً ترقی کریں گے۔ اس کا تقرر میں کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا فوراً کر لو اس میں تامل کی کیا بات ہے۔ جگہ کا اشتہار کر دیا گیا۔ اب جو درخواستیں آئیں ان میں منجملہ اور درخواستوں کے ایک صاحب ڈاکٹر بنرجی کی بھی درخواست تھی جنہوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی کیا تھا۔ اس کے بعد یورپ کے کسی ملک میں پڑھ چکے تھے۔ اور درخواست دیتے وقت دلی اسکول آف اکنامکس میں جو راؤ کا ادارہ تھا۔ عارضی طور پر لکچرر تھے۔

ذاکر صاحب میرے اوپر بہت کرم فرماتے تھے۔ اکثر میرے گھر آکر میرے پاس بیٹھتے جو مجھے وارڈن بننے کے ایک سال کے اندر مل گیا تھا۔ اپنی کار جس سے وہ آتے واپس کروا دیتے تھے تاکہ اطمینان سے باتیں کر سکیں۔ اور کسی کو پتہ نہ چل جائے کہ وہ میرے یہاں ہیں۔ اگر دوپہر یا شام کے کھانے کا وقت بیچ میں آ گیا تو جو بھی دال دلیا میرے گھر میں پکا ہوتا اس کو میرے ساتھ کھا لیتے تھے۔ تو اسی قسم کی ایک ملاقات میں میں نے ذاکر صاحب سے عرض کیا کہ جس جگہ پر مجھے اپنے طالب علم کا تقرر کرنا تھا اس کے لئے ڈاکٹر بنرجی جیسے امیدوار کی درخواست بھی آگئی ہے۔ کہنے لگے یہ تو بہت آسان ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کو ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ جو دلی اسکول کے ڈائرکٹر ہیں بہت چاہتے ہیں۔ اور تمہاری عزت کرتے ہیں۔ ایک دن فرصت پا کر دلی چلے جاؤ اور ڈاکٹر راؤ سے ملو۔ وہ یقیناً تم کو اپنے دوسرے ساتھیوں سے ملوا دیں گے۔ تو وہاں زیادہ تر لوگ جب چائے پی رہے ہوں تو یوں ہی ضمنی طور پر کہہ دینا کہ ہمارے یہاں جو لکچرر کی جگہ خالی ہے اور جس کا اشتہار ہو چکا ہے اس پر ایک بہت ہی لائق آدمی پہلے سے کام کر رہے ہیں لہٰذا کسی اور کے لینے کا تو سوال ہی نہیں۔ ڈاکٹر بنرجی تک یہ خبر کسی طرح پہنچ جائے گی اور وہ خود ہی انٹرویو میں نہیں آئیں گے۔ میں نے ایسا ہی کیا اور اپنے شعبہ کے ایک اور ساتھی کو لے کر دلی اسکول گیا۔ ڈاکٹر راؤ مجھے دیکھتے ہی بڑی محبت سے ملے۔ اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے پاس لے گئے جو کامن روم میں بیٹھے تھے۔ چائے منگوائی گئی۔ سب سے میرا تعارف کرایا اور ڈاکٹر راؤ نے میرے متعلق کہا کہ یہ وہی صاحب ہیں جن کے مقالہ کی کاپیاں میں ٹرونڈہم سے لایا تھا اور آپ لوگوں کو دکھلا کر بتایا تھا کہ کام اس معیار کا ہونا چاہیے۔ میں نے ان کو دلی اسکول میں آکر ملازمت کرنے کی دعوت بھی

دی۔ لیکن ان کی علی گڑھ سے دلچسپی اتنی ہے کہ وہ چھوڑنا ہی نہیں چاہتے۔ ڈاکٹر راؤ بڑے دبدبے کے آدمی تھے۔ ان کے سامنے ان کے کسی ساتھی کو بات کرنے کی ہمت ہی نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے چائے پینے میں باتوں باتوں میں وہی بات اس طریقہ سے کہہ دی جیسے مجھ سے ذاکر صاحب نے کہی تھی۔ تھوڑی دیر اور بیٹھا، معاشیات کے بعض مسائل پر بات چیت ہوئی۔ اس کے بعد میں اور میرے ساتھی علی گڑھ واپس آ گئے۔

اب جس دن انٹرویو ہوا تو میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر بنرجی تو اس بات کے سننے کے باوجود بھی آ گئے۔ ذاکر صاحب سے میں نے چپکے سے یہ بات عرض کر دی۔ اب ذاکر صاحب کی شخصیت ایسی تھی کہ ان کے متعلق کسی معاملہ میں کسی کو کوئی غلط فہمی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ انٹرویو سے پہلے مجھ سے کہا کہ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔ شاید انٹرویو کے بعد بھول جاؤں۔ ذرا دوسرے کمرے میں آ جاؤ تو بات کر لوں۔ میں ان کے ساتھ گیا تو کہنے لگے کہ اس کا انٹرویو تو یقینی اچھا ہوگا۔ تم اس سے کوئی سوال نہ کرنا۔ بس آخر میں صرف ایک سوال یہ کرنا کہ آپ تو بہت لائق آدمی ہیں۔ کیا آپ گریڈ کی ابتدائی تنخواہ پر آنے کے لئے تیار ہیں۔ یا تنخواہ میں کچھ اضافہ چاہتے ہیں۔ وہ یقیناً اضافہ کا مطالبہ کریں گے۔ اس کے بعد میں دیکھ لوں گا۔

میں نے ذاکر صاحب کے حکم کے مطابق سلکشن کمیٹی میں ڈاکٹر بنرجی سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اور آخر میں وہی سوال کیا جس کی ہدایت ذاکر صاحب نے کی تھی۔ بنرجی صاحب میرا سوال سن کر غالباً مجھ سے بہت خوش ہوئے۔ اور سات آٹھ مزید اضافوں کا تقاضہ کر بیٹھے۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم تھا کہ یہ کس وجہ سے کہا گیا تھا۔ اس کے بعد انٹرویو دوسرے لوگوں کے چلتے رہے۔ آخر میں ذاکر صاحب نے انٹرویو ختم ہونے کے بعد بغیر کسی سے کچھ پوچھے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر بنرجی سب سے لائق نظر آتے ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ انہوں نے مزید اضافوں کا مطالبہ کیا ہے جسکی ایکزیکٹو کاؤنسل نہیں مانے گی لہٰذا ان کو لینا بیکار ہے۔ ان کے بعد بہترین آدمی ہماری یونیورسٹی کے طالب علم ہیں جو پہلے سے عارضی کام کر رہے ہیں۔ لہٰذا ان کا تقرر کر دیا جائے۔ سب لوگوں نے یہی تسلیم کیا اور ان کا تقرر ہو گیا۔ مجھے اپنے طالب علم اور ساتھی سے جو امیدیں وابستہ تھیں نہ صرف انہوں نے پوری کیں بلکہ اس سے زیادہ کیا۔ جب وہ ہالینڈ تعلیم کے لئے گئے اور انہوں نے پروفیسر ٹن برگن کے ساتھ ریسرچ کیا جن کو بعد میں پہلا معاشیات کا نوبل پرائز ملا تو ان کو میرے ساتھی کا کام اتنا زیادہ پسند آیا کہ اس کو اپنے انسٹی ٹیوٹ کے بہترین کاموں میں شامل کیا اور اپنے یہاں چھپوایا۔ اس کے بعد انہوں نے دنیا کے کئی ایک بہترین معاشیات کے جرائد میں مضامین لکھے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ بڑے آدمی بن کر ہمارے یہاں کام نہ کر سکے اور آج کل امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔

دوسری مثال ذاکر صاحب کے کام کرنے کے طریقہ کی یہ ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ان سے عرض کیا کہ میرے

ایک ساتھی جو عارضی طور پر کام بھی کر رہے ہیں، برابر اول درجہ میں کامیاب ہوتے رہے ہیں، بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں اس لئے میں ان کا مستقل تقرر کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن ان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ انٹرویو کمیٹی کے سامنے بہت پریشان ہو جاتے ہیں۔ اور غالباً کسی بھی سوال کا جواب نہ دے سکیں گے۔ کہنے لگے اگر تم ان کو اچھا سمجھتے ہو تو ضرور تقرر کرو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ کام خاصہ مشکل ہے اسلئے کہ وہ انٹرویو اچھا نہ کر پائیں گے۔ تو کہنے لگے۔ ایسا کرو کہ ایکسپرٹ کسی بڈھے ریڈر کو رکھو اور اس کو یہ بھی ادو کہ وائس چانسلر صاحب نے آپ کو انٹرویو کرنے کے لئے تھوڑے ہی بلایا ہے۔ ان کو تو شعبہ کے لئے کسی اچھے آدمی کو پروفیسر بنانے کی تلاش ہے۔ اور وہ یہ دیکھنا چاہیں گے کہ آپ کو یہاں پر جو لوگ عارضی کام کر رہے ہیں ان سے کتنی ہمدردی ہے۔ پھر سوالات کی ایک فہرست اپنے ساتھی سے بات چیت کر کے بنوالو اور ان کے جوابات کے لئے ان کو ہدایت کر دو کہ اچھی طرح تیار کر لیں۔ ان سوالات کی کئی کاپیاں ٹائپ کرواؤ اور مجھے، ایکسپرٹ کو اپنے ساتھی کو سب کو دے دو اور خود بھی رکھو۔ تم لوگوں کے لئے بہتر ہوگا اور کوئی مشکل کام بھی نہیں کہ سب سوالات یاد کر لو۔ تمہارے ساتھی سے وہی سوالات کئے جائیں گے۔ تب تو ان کا انٹرویو اچھا ہو ہی جائے گا۔ چنانچہ بڈھا ایکسپرٹ جھانسے میں آگیا۔ اس نے سوالات یاد کر لئے، میں نے بھی یاد کر لئے۔ ذاکر صاحب نے ٹائپ کیا ہوا کاغذ انٹرویو کے وقت اپنے سامنے رکھ لیا اور ان میں سے پڑھ پڑھ کر سوالات کر رہے تھے۔ ظاہر ہے ہم لوگ زبانی یاد کر چکے تھے اس لئے اپنی ساتھی سے وہی سوالات کر رہے تھے اور وہ خوب اچھی طرح سے جوابات دے رہے تھے۔ پھر ذاکر صاحب نے ایکایک انٹرویو کمیٹی کے سب لوگوں کے سامنے کہہ دیا کہ آپ لوگوں کو شاید یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ میری اعلیٰ تعلیم معاشیات ہی میں ہوئی ہے اور میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی بھی معاشیات ہی میں کیا تھا لیکن اب اس کو بہت دن ہو گئے اور معاشیات کو چھوڑ کر علمیات میں پڑ گیا۔ اس لئے یادداشت کے لئے کچھ سوالات بناکر ٹائپ کروا کے رکھ لئے ہیں۔ ان کی شخصیت اتنی بھاری بھرکم تھی کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ غلط بات کہہ رہے ہیں۔ اور اس طرح میرے ساتھی کا انٹرویو اچھا ہو گیا اور ان کا تقرر مستقل ہو گیا۔ آگے چل کر انہوں نے وظیفہ حاصل کر کے امریکہ کی ایک بہت اچھی یونیورسٹی سے ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ اپنے گھر کے حالات کی بناء پر جو بہت سازگار نہ تھے، کوئی مزید کام نہ کر سکے۔

شاید آپ نے اب یہ سمجھ لیا ہوگا کہ ذاکر صاحب کا خیال یہ تھا کہ کام کرنے کا مقصد اچھا ہونا چاہیئے، اس کے لئے طریقہ کوئی بھی اپنانا پڑے۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کی بڑی شخصیت کے تحت ان کے متعلق کسی کو غلط فہمی کا امکان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب بھی کوئی قابل نوجوان مرد یا عورت ملے اس کا کسی طرح شعبہ میں

تقرر کرو اور ہاتھ سے جانے نہ دو۔ اسی جذبہ کے تحت انہوں نے مسعودہ کا تقرر کیا تھا، جس کا ذکر میں پیشتر کر چکا ہوں اور اسی جذبے کے تحت انہوں نے ایک دوسری خاتون جن کا نام سیدہ کشور علی نواز تھا (جنہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا اور شروع سے آخر تک فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوتی رہی تھیں) جب ان کی درخواست ذاکر صاحب کے پاس آئی تو مجھے بلا کر تاکید کی کہ فوراً تقرر کر لو۔ جس وقت ذاکر صاحب نے مجھے ہدایت کی کہ ان کا تقرر کرنا ضروری ہے اس وقت شعبہ میں صرف عارضی جگہ تھی۔ میں نے ذاکر صاحب کو بتایا تو کہنے لگے کہ بعد میں ایک دو جگہیں اور بڑھا دیں گے۔ یونیورسٹی میں روپیہ کی کمی نہیں ہوتی اچھے آدمی کی کمی ہوتی ہے۔

ان صاحبہ کو ذاکر صاحب کی ہدایت کے بعد میں نے بہت احتیاط سے ایک خط لکھ کر بھیجا کہ آپ کی درخواست جو وائس چانسلر صاحب کے پاس آئی ہے اس کے متعلق میں لکھ رہا ہوں کہ فی الوقت شعبہ میں عارضی جگہ ہے۔ بعد میں مستقل بھی ہو سکتی ہے لیکن یقینی نہیں ہے۔ اگر آپ عارضی جگہ پر کام کرنے کے لئے تیار ہیں اور اپنی رہائش کا علی گڑھ میں خود انتظام کر سکتی ہیں تو مجھے اطلاع دیں۔ آپ کی اطلاع پانے کے بعد میں وائس چانسلر صاحب کے پاس آپ کے تقرر کی سفارش کے متعلق لکھ کر بھیجوں گا۔ اس پر ان کا تار ملا کہ مجھے شرائط منظور ہیں اور میں آ رہی ہوں۔ جس وقت وہ علی گڑھ پہونچیں اس وقت یونیورسٹی کے اکثر شعبہ جات بند ہو چکے تھے۔ اس لئے کہ یونیورسٹی کے کلاس پورے سال تک سائنس اور انجینئرنگ کے علاوہ ۸ بجے صبح سے ۱۲ بجے سہ پہر تک چلتے تھے (اس وقت یونیورسٹی میں میڈیکل کالج نہ تھا) یہ صاحبہ کوئی ڈھائی پونے تین بجے پہنچیں۔ چونکہ شعبہ معاشیات بند ہو چکا تھا۔ اس لئے تلاش کرتی ہوئی میرے گھر آئیں۔ جب انہوں نے دروازہ پر دستک دی اور میں نے باہر آ کر دروازہ کھولا تو میں دھک سے رہ گیا۔ اس لئے کہ ان کے اندر میری نظر میں ایسی جاذبیت تھی جس سے متاثر ہوئے بغیر میں نہ رہ سکا۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں ایسی یونیورسٹی میں تھا کہ اس بات کا اظہار بھی نہ کر سکتا تھا۔ میں نے ان خاتون کے لئے چائے بنوائی چائے پیتے وقت انہوں نے کہا کہ ان کے عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک استاد پروفیسر جعفر حسن صاحب ہیں جو وہاں پر سماجیات میں پروفیسر ہیں۔ انہوں نے مجھے ایک خط اپنے بھائی پروفیسر ہادی حسن صاحب جو یہاں فارسی میں پروفیسر ہیں، کے نام دیا تھا اور مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ اپنے گھر میں میری رہائش کا انتظام ضرور کر دیں گے۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اب اگر آپ اس سلسلہ میں میری کچھ مدد کر سکتے ہیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں نے بہت مخلصانہ طریقہ سے اس بات کی کوشش کی کہ میں ان کی رہائش کے بارے میں کوئی انتظام کر سکوں ہر چند کہ میں نے اس کام کی تمام تر ذمہ داری کے لئے ان کو پہلے سے لکھ دیا تھا۔ بہرکیف ان کے پاس جو سامان تھا اس کو ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر ان کو پرنسپل گرلس کالج، پرنسپل گرلس اسکول اور

مینجر گرلس اسکول (جو اس زمانہ میں عبدالرحمٰن صاحب شیروانی تھے اور جو آج کل یونیورسٹی کے پرو چانسلر ہیں) کے یہاں لے گیا۔ ان لوگوں کی بڑی خوشامد کی۔ لیکن کوئی بھی اس سلسلہ میں ان کی مدد کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس وقت تک شام ہو چکی تھی۔ ان کو لے کر گھر واپس آیا۔ سفر کی تکان اور یہاں کے حالات سے وہ سخت پریشان تھیں۔ میری والدہ مرحومہ سے انہوں نے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو آج رات کو آپ کے پاس ٹھہر جاؤں، کل اپنا کوئی انتظام کر لوں گی۔ کسی غیر شادی شدہ لڑکی کی رہائش کا انتظام کوئی آسان کام نہ تھا۔ میرے مکان میں چونکہ بہت سے چھوٹے بڑے کمرے تھے، ایک چھوٹے کمرے میں میری والدہ نے ان کو رکھ دیا۔ اس شرط پر کہ ان کے کھانے پینے کے اخراجات ان کو دینا ہوں گے۔ وہ فوراً راضی ہو گئیں۔

ان خاتون میں ایک خاص بات یہ تھی کہ اپنی علمی قابلیت کے علاوہ اپنی بات چیت میں بہت تیز واقع ہوئی تھیں اور اکثر اوقات بڑے سے بڑے آدمی سے سختی سے بات کرنے میں ان کو تامل نہ ہوتا تھا۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے آپ کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام بہت سنا ہے۔ وہ خود عالم اور بڑے علم دوست ہیں۔ ان سے ملنا چاہوں گی۔ میں نے ذاکر صاحب کے پی۔ اے سے ان کے لئے وقت کا تعین کرایا۔ کہنے لگیں مجھے وہاں پہنچا دو۔ میں ان کو لے کر ذاکر صاحب کے پاس گیا۔ ذاکر صاحب نے مجھے بھی بٹھا لیا۔ ان کو غلط فہمی تھی کہ وہ خاتون ان کے ایک دوست علی نواز جنگ کی بیٹی تھیں۔ کہنے لگے کہ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور اچھا ہوا کہ تمہارا تقرر یہاں بر معلم کی حیثیت سے یونیورسٹی میں ہو گیا اس لئے کہ تم میرے دوست کی بیٹی ہو۔ انہوں نے ذاکر صاحب کو جواب دیا کہ مجھے آپ سے مل کر بہت افسوس ہوا۔ میرا خیال تھا کہ آپ بڑے آدمی ہیں۔ اور میری جو تھوڑی بہت علمی قابلیت ہے، اس کی قدر کریں گے۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ کے خیالات اس قدر گرے ہوئے ہیں اور آپ اس بات سے خوش ہیں کہ میں آپ کے ایک دوست کی بیٹی ہوں۔ میں آپ کی معلومات کے لئے بتا دوں کہ میرے والد مرحوم کا علی نواز جنگ صاحب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب باتیں وہ صاحبہ ایک ہی سانس میں کہہ گئیں۔ ذاکر صاحب بڑے آدمی تھے، بات کو برداشت کر گئے اور کہا کہ دیکھو بیٹی! اگر تمہارے اندر علمی قابلیت نہ ہوتی تو تمہارا تقرر یہاں ہوتا ہی نہیں۔ لیکن مجھے مزید خوشی اس خیال سے تھی کہ تم میرے ایک دوست کی بیٹی ہو۔ اگر تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ میں خوش ہوں کہ ایک اچھی قابل خاتون کا اس یونیورسٹی میں تقرر ہو گیا۔ انہوں نے چائے پلائی، اور بہت محبت اور شفقت سے بات کرتے رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ذاکر صاحب کی بڑائی کی ایک بڑی دلیل تھی۔ ورنہ کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے منہ پر ایسی باتیں سن سکیں۔

اب یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ چونکہ ڈاکٹر علی محمد خسرو جو ان صاحبہ کے استاد تھے، ان کا تقرر ریڈر کی حیثیت سے میرے مقابل میں نہ ہوا تھا۔ چونکہ اپنے استاد سے ان کو بہت لگاؤ تھا لہٰذا جب ان کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ میرے مقابلہ ہی میں

ان کے استاد کا تقرر نہیں ہوا تھا تو وہ مجھ سے نفرت کرنے لگیں۔ اب ایک عجیب مقابلہ تھا، ایک طرف محبت کے جذبات اور دوسری طرف نفرت کے۔ لیکن اظہار کوئی کسی سے نہ کرتا تھا اور نہ غالباً ان حالات میں کر سکتا تھا۔

میں اس زمانہ میں عارضی طور سے معاشیات کے چیرمین کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اور میرے پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی جو کینسر جیسے موذی مرض میں یہاں پڑنے کے کچھ مہینہ کے اندر اندر مبتلا ہو گئے تھے، زیورک میں علاج کے لئے گئے ہوئے تھے۔ جب وہ واپس آئے تو بفضلہ ٹھیک تو ہو گئے تھے لیکن وہ اچھی طرح بول نہ سکتے تھے اور ان کا دماغ بالکل کام نہ کرتا تھا۔ ایک دن شعبہ کے ایک طالب علم نے جو معاشیات میں ریسرچ کر رہا تھا اور وظیفہ بھی پا رہا تھا، انھوں نے دریافت کیا کہ میں نے سنا ہے کہ تم پاکستان جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ طالب علم نے ہاں میں جواب دیا تو انہوں نے بہت غصہ میں کہا کہ تم مسلمانوں کو کتے اور بلیوں کی طرح پاکستان جانا ہو گا۔ اتفاق سے مس کشور علی نواز وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے بہت سخت لہجہ میں پروفیسر صاحب کو جواب دیا کہ تم ہندو لوگ کتے اور بلیوں کی طرح حیدرآباد کی ریاست میں ملازمت کرنے جاتے تھے یہ تو انسان کی روزی روٹی کا سوال ہے۔ اگر آپ اس طالب علم کو ملازمت ہندوستان میں دینے کا یقین نہیں دلا سکتے تو اللہ کی دنیا تو بہت بڑی ہے اس کو جہاں موقع ملے گا جائے گا۔ پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی کو بھلا اتنی بات کہاں گوارا تھی۔ موقع ملتے ہی انہوں نے ان صاحبہ کو شعبہ سے نکال کر باہر کر دیا۔

یونیورسٹی کے عہدہ سے برطرف ہونے کے بعد ان صاحبہ نے دلی اسکول آف اکنامکس، دلی کالج اور جامعہ ملیہ میں لکچرر کی جگہوں کے لئے درخواست دی۔ سب سے پہلے انٹرویو دلی اسکول آف اکنامکس میں ہوا۔ وہاں ڈاکٹر وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ ڈائرکٹر تھے۔ وہاں طریقہ یہ تھا کہ سب امیدواروں کو آخر وقت تک بیٹھنے کے لئے کہا جاتا تھا اور جس کا انتخاب ہوتا تھا اس کو بلا کر کہہ دیا جاتا تھا۔ تو آخر میں ان خاتون کو بلا کر ڈاکٹر راؤ نے کہا کہ نوجوان دوشیزہ میں اس بات سے خوش ہوں کہ تمہارا تقرر ہو گیا اس وجہ سے کہ تم مسلمان ہو اور ملک کی ایک اقلیت سے تعلق رکھتی ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں ایسی نوکری پر لعنت بھیجتی ہوں۔ میں مسلمان ہونے کے ناطے آپ سے بھیک مانگنے نہیں آئی۔ یہ کہنے کے بعد انہوں نے ملازمت کو قبول نہ کیا۔ دوسرا انٹرویو دلی کالج میں ہوا جہاں ڈاکٹر راؤ دلی یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات کے صدر ہونے کی حیثیت سے اور پروفیسر مجیب شیخ الجامعہ کالج مینجنگ کمیٹی کے صدر ہونے کی حیثیت سے موجود تھے۔ ڈاکٹر راؤ نے وہاں بھی معاملہ اٹھایا کہ چونکہ ان خاتون کا تقرر دلی اسکول آف اکنامکس میں ہو چکا ہے۔ اس لئے ان کو یہاں رکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں کسی نہ کسی طرح ان کو اپنے یہاں کام کرنے پر راضی کر لوں گا۔ لیکن یہ صاحبہ تھیں کہ اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھیں اور انہوں نے دلی اسکول جانے سے صاف انکار کر دیا۔ تیسرا انٹرویو

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہوا چونکہ پروفیسر مجیب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین (؟) ان خاتون کی تعریف کرنے کے بعد ان کی قابلیت سے متاثر ہو چکے تھے لہٰذا انہوں نے اسی وقت ان کا تقرر کر لیا اور اپنے گھر پر رکھ کر ان کو جامعہ ملیہ میں لکچرر کے عہدہ پر کام کرنے کے لئے زبردستی آمادہ کر کے ان سے کام شروع کروا دیا۔ بعد میں ان کے رہنے کا انتظام لڑکیوں کے ہوسٹل میں کر دیا گیا۔

اب عجیب اتفاق ہے کہ جس سال یہ صاحبہ جامعہ ملیہ میں کام کر رہی تھیں اسی سال ہندوستان کے اکثر حصوں میں ایشین فلو پھیلا جس کا باقاعدہ علاج ہونے پر بخار تو تین چار دن کے بعد ختم ہو جاتا تھا لیکن وہ مریض کو ادھ مرا کر دیتا تھا۔ میں بھی بدقسمتی سے اس مرض میں گرفتار ہو گیا اور ٹھیک ہونے کے باوجود میری حالت اتنی خراب ہو گئی کہ نہ تو چل پھر سکتا تھا نہ پڑھنے اور پڑھانے کا کام کر سکتا تھا اور نہ ہی کوئی ذرا زور کی آواز سن سکتا تھا۔ جب ان محترمہ کو میرے متعلق معلوم ہوا تو انسانی ہمدردی کے ناطے انہوں نے جامعہ ملیہ میں ایک صاحب جن کا نام ابوالعطا (؟) تھا اور جو آرٹ کے استاد تھے اور جن کا گھر بڑا پرسکون تھا ان کے گھر پر میرے لئے دو ہفتہ سکون سے آرام کرنے کا انتظام کر دیا۔ کبھی کبھی میری خیریت معلوم کرنے آتی تھیں اور تھوڑی دیر میرے بستر کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر بیت ہمدردی سے بات کر کے چلی جاتی تھیں۔

آپ حضرات اس چیز سے بخوبی واقف ہوں گے کہ محبت کی کوئی خاص زبان نہیں ہوتی ہے۔ وہ ایک بین الاقوامی زبان ہے جو صرف دیکھ کر ہی سمجھی جا سکتی ہے۔ میں نے اپنے احساسات کا کبھی ان سے ذکر نہ کیا تھا اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کی تھی کہ اس کا علم ان کو نہ ہونے پائے، لیکن یہ تو ایسی چیز ہے کہ چھپانے سے چھپتی نہیں۔ ایک دن ان صاحبہ نے مجھ سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں نے ہمت کر کے بمشکل جواب دیا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ کہنے لگیں کہ یہ بات تو ہرگز نہیں۔ مجھے تو آپ سے نفرت ہے اس لئے کہ میرے اتنے قابل استاد کے مقابلہ میں آپ کا ناجائز طور پر تقرر کیا گیا۔ میں نے کہا کہ نفرت بھی محبت کی ایک شکل ہوتی ہے اس لئے کہ وہ انسان کا انسان سے تعلق ظاہر کرتی ہے۔ اگر تم مجھ سے بے اعتنائی برتتی تو میں یقین کرتا کہ تم کو مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ اس پر مسکرا کر کہنے لگیں کہ یہ آپ کا عجیب فلسفہ ہے۔ مجھے آپ سے ہمدردی ضرور ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ بہرحال بات تو بہت مزے دار ہے۔ میں اپنی والدہ سے اجازت لے کر بتاؤں گی۔ جب انہوں نے میرے متعلق اپنی والدہ کو لکھا تو انہوں نے غالباً یہ خیال کر کے کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں شادی کی اجازت دے دی۔ میری ان سے شادی ہو گئی۔ جس کے رقعے اپنے دوست احباب اور بزرگوں کے پاس بھیجے گئے۔ ذاکر صاحب اس وقت بہار کے گورنر تھے۔ ان کے پاس سے فوراً ان کے نام کا دیا ہوا مبارک باد کا تار آیا۔

اس بات کو تقریباً تیس سال ہو گئے۔ آج تک مجھے معلوم نہیں ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہیں یا ہمدردی

یا کچھ بھی نہیں ، بہرحال ان کا سلوک مجھ سے ہمیشہ خوشگوار رہا ۔ اور میں نے کبھی یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی کہ ان کو مجھ سے کوئی لگاؤ ہے یا نہیں اس لئے کہ جب میں امریکہ میں طالب علم تھا تو وہاں کے سائیکالوجی کے بہت مشہور پروفیسر نے مجھ سے کہا تھا کہ جب تک تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ تم کسی سے محبت کرتے ہو تو تمہیں یہ بات معلوم کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ بھی محبت کرتا ہے یا نہیں ۔ یہ بات مجھ کو اتنی پسند آئی تھی کہ آج تک اس اصول پر عمل کرتا ہوں ۔

آپ تعجب کرتے ہوں گے کہ میری اس محبت کی داستان سے ذاکر صاحب کی شخصیت کا کیا تعلق ہے لیکن اس چیز کا اظہار آپ کو اسی مضمون میں آگے چل کر ہو جائے گا ۔

فی الوقت تو میں اپنے پروفیسر (پروفیسر) ڈی ۔ پی ۔ مکرجی کے متعلق آپ لوگوں کو مختصراً بتا دوں ۔ ذاکر صاحب کی یہ بے حد خواہش تھی کہ کسی بہت قابل اور معمر آدمی کا شعبہ معاشیات میں پروفیسر کی حیثیت سے تقرر کیا جائے ۔ انہوں نے متعدد لوگوں سے جن میں کلکتہ کے پروفیسر گھوش ، مدھیہ پردیش کے ایل ۔ سی ۔ جین ۔ دلی کے پروفیسر گیان چند اور ڈاکٹر وی ۔ اے ۔ این گنگولی مہاراشٹرا کے پروفیسر ڈی ۔ آر ۔ شنا ؤ ، بنگلور کے پروفیسر ڈی سوزا اور ڈاکٹر پال ۔ ایم سویزی سے بات چیت کی ۔ ہر مرتبہ قریب قریب معاملہ طے پا جاتا تھا لیکن آخر میں کسی نہ کسی وجہ سے ختم ہو جاتا تھا ۔ پروفیسر ڈی ۔ آر ۔ شنا ؤ کا معاملہ تو اس حد تک بڑھا کہ وہ علی گڑھ آئے ۔ ذاکر صاحب ، پروفیسر شنا ؤ اور میں نے مل کر کھانا کھایا ۔ ان کے لئے جس مکان کو انہوں نے پسند کیا اس کی مرمت خود شروع ہو گئی ۔ مزید یہ کہ شعبہ کے لوگوں سے مل کر یہ پروگرام بھی طے ہو گیا کہ کون کیا کام کرے گا ۔ اور اپنے اور دوسرے لوگوں کے پڑھانے کے مضامین کی بنیاد پر ٹائم ٹیبل بھی بن گیا ۔ لیکن احمد آباد جا کر انکار لکھ کر بھیج دیا ۔ میں بہت پریشان ہوا اور ذاکر صاحب سے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب اب تو ہر طرف سے ناامیدی ہی ناامیدی نظر آتی ہے ۔ اور میری خواہش ہے کہ شعبہ کی قیادت کے لئے کوئی مشہور ماہر معاشیات آ جائے ۔ غالباً میرا دل رکھنے کے لئے ذاکر صاحب نے جواب دیا کہ تم کس سے کم ہو ۔ اگر تم عمر میں ذرا زیادہ ہوتے ۔ ابھی ڈاڑھی رکھ کر چھ مہینوں میں بڑھا لو تاکہ عمر میں ذرا زیادہ لگنے لگو تو میں تم کو پروفیسر بنا دوں گا ۔ میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب میں اپنی حیثیت اچھی طرح جانتا ہوں اور میں یقین و وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس پوزیشن کے قابل نہیں ہوں ۔

آپ لوگوں میں سے اکثر کو اس بات کا علم ہوگا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کم از کم ملک کی آزادی کے بعد سے ، ایک کمیونسٹوں کا گروپ رہا ہے جو بہت مستحکم ہوا اور مضبوط ہے ۔ وہ لوگ اس فکر میں تھے کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈی ۔ پی ۔ مکرجی صاحب ، جو مارکسی خیالات کے تھے ، کو یہاں پر پروفیسر بنا کر بلایا جائے ۔ ملحوظ خاطر رہے کہ ذاکر صاحب کو کمیونسٹوں سے کوئی نفرت نہ تھی ۔ وہ اس خیال کے حامی تھے کہ یونیورسٹی ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں مختلف

خیال اور مختلف آیڈیالوجی کے لوگ ہوتے ہیں جن کے مختلف النوع خیالات اور علمی تصادم سے نئے نئے نظریات قائم ہوتے ہیں۔ اتفاق کی بات، پروفیسر جوشی یہاں کے کمیونسٹ گروپ کے کہنے پر یونیورسٹی میں ایک لکچر دینے کے لئے بلایا گیا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ اس کی صدارت ذاکر صاحب نے خود کی۔ اور جلسہ اسٹریچی ہال میں جو اس وقت یونیورسٹی میں سب سے بڑا ہال تھا منعقد کیا گیا۔ پروفیسر مکرجی نے جس موضوع پر لکچر دیا وہ تھا کہ: کیا معاشیات اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی یا ناکام؟ انہوں نے غالباً (جس کے متعلق میں یقین سے نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ میری قابلیت اتنی نہ تھی) کچھ غلط حوالے اپنے لکچر میں دیئے۔ بولتے وہ غضب کے تھے۔ ایک سماں بندھ گیا۔ سب حاضرین جلسہ نے ان کی تعریف میں بار بار تالیاں بجائیں۔ لیکن ذاکر صاحب تھے کہ ان کی طرف سے بیزار ہو گئے۔ تقریر صبح کے وقت ہوئی تھی۔ تقریر کے بعد جب ذاکر صاحب جانے لگے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ میں پروفیسر مکرجی صاحب کو سہ پہر میں اکنامکس سوسائٹی میں تقریر کے لئے دعوت دے رہا ہوں۔ آپ اس میں تشریف لائیے۔ بہت جھلا کر کہا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ میرے پاس اس سے زیادہ وقت ضائع کرنے کو ہے جتنا کر چکا؟ اور وہ سہ پہر میں تشریف نہ لائے۔

جب میں ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو ذاکر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب پروفیسر مکرجی بھاری بھرکم آدمی ہیں۔ ملک کے ماہرین معاشیات میں سے ایک سمجھے جاتے ہیں اور لکچر بہت اچھا دیتے ہیں۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ ان کو بلا ہی لیں۔ کہنے لگے اس شخص کو معاشیات بالکل نہیں آتی وہ تو سماجیات جانتا ہے اور وہ بھی کچی پکی۔ لیکن تم بضد ہو تو میں دعوت نامہ ان کے پاس بھیج دوں گا۔ حالانکہ میری ذاتی طور پر طبیعت نہیں چاہتی۔ میں نے کہا کہ بے حد متشکر ہوں کہ آپ نے میری درخواست قبول کر لی۔ ایک ہفتہ کے بعد انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ وہ معاملہ بھی ختم ہو گیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا پروفیسر مکرجی نے معذرت کر لی۔ فرمایا نہیں۔ مگر میں نے ان کو تین سال کے لئے بلایا تھا۔ انہوں نے جواب میں لکھا ہے کہ میری عمر اس وقت ۵۸ سال کی ہے۔ دو سال تو میں اپنی یونیورسٹی میں ملازمت کر سکتا ہوں۔ اب صرف ایک سال کے لئے میں اپنا سب سامان اور خاندان کو منتقل کر دوں تو اس کے تو کوئی معنی نہیں۔ انہوں نے لکھا ہے اگر آپ میرا تقرر پانچ سال کے لئے کریں تو میں آنے کے لئے تیار ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ ذاکر صاحب جس آدمی کا تین سال کے لئے تقرر کیا جا سکتا ہے اس کا تقرر پانچ سال کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ آپ اللہ کا نام لے کر ان کو پانچ سال کے لئے بلا لیجئے۔ بولے تم بہت ضدی آدمی ہو۔ تم کو معلوم نہیں ہے کہ میری وائس چانسلری کے اس یونیورسٹی میں صرف چار سال باقی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تین سال کے بعد پروفیسر مکرجی چلے جائیں اور اس کے بعد ایک سال کے اندر اندر میں تمہارا تقرر پروفیسر کی حیثیت سے کر کے جاؤں۔ میں نے بہت معافی کے ساتھ عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب! میرے لئے اس سے زیادہ خوش قسمتی

کی اور کوئی بات نہیں ہے کہ آپ میرے متعلق ایسا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن یہ کام تو صرف اللہ تعالیٰ کے کرنے کا ہے۔ اگر اس کو منظور ہوگا تو میں آپ کے جانے کے بعد بھی پروفیسر ہو سکتا ہوں۔ اور اگر اسے منظور نہ ہوگا تو میں آپ کے ہوتے ہوئے بھی نہ ہو پاؤں گا۔ کہنے لگے یہ تو ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن یونیورسٹی کی ایسی خدمت کا جذبہ کم از کم علی گڑھ میں تو مجھے دیکھنے میں نہیں آیا۔ میں ان کو پانچ سال کی دعوت دے دوں گا گو میں پھر بھی کہتا ہوں کہ میرا دل اس کو نہیں کہتا ہے۔ لیکن اس بات کی تاکید میں تم کو کرتا ہوں کہ شعبہ کی قیادت تم ہی کو کرنا ہوگی۔ اور وہ شعبہ کو ہرگز نہیں بڑھا سکتے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ جیسا حکم دیں گے میں تعمیل کروں گا۔ مگر شعبہ کی شہرت کے لئے ان کو بلا لیجئے۔ غرض ذاکر صاحب نے پانچ سال کی دعوت پروفیسر مکرجی کو دے دی۔ انہوں نے خوشی سے منظور کر لی۔ ہم لوگوں نے ان کے تشریف لانے پر ان کے مرتبہ کے مطابق استقبال کیا۔

اس زمانہ میں یہاں پر یہ رواج تھا کہ پروفیسر کو اپنے تقرر کے بعد ایک افتتاحی خطبہ عام مجمع میں دینا ہوتا تھا۔ پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکرجی نے ایک خطبہ یونین ہال میں دیا جس کی صدارت ذاکر صاحب نے کی۔ خطبہ کا موضوع کینس، شمپیٹر اور مارکس کے خیالات کا مقابلہ تھا اور اپنی آئیڈیالوجی کے مطابق اور یقیناً صحیح سمجھتے ہوئے انہوں نے کارل مارکس کی بہت تعریف کی۔ اور بتایا کہ ان کے اصول ہی ہندوستان کے مسائل کو حل کرنے میں استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ ذاکر صاحب کو وہ خطبہ بہت پسند آیا۔ لکھا ہوا خطبہ تھا۔ اس کی ایک کاپی پروفیسر مکرجی سے مانگ کر اپنی ذاتی لائبریری میں رکھنے کے لئے لے گئے۔ اس وقت سے وہ ان کی بہت عزت کرنے لگے۔

لیکن شعبہ معاشیات کی بدقسمتی یہ ہے کہ آنے کے زیادہ سے زیادہ چھ مہینہ کے اندر اندر ان کی کینسر جیسی مہلک بیماری کا علم ہوا اور وہ بھی گلے میں تھا۔ اس کے آپریشن کے لئے ان کو سوئٹزرلینڈ لے جایا گیا۔ اس کے بعد سے ہر چند کہ وہ صحت یاب واپس آئے لیکن ان کی زندگی بالکل معذوری کی زندگی ہو گئی۔ مگر کیا ہستی تھی ذاکر صاحب کی کہ جب اکیڈمک کاؤنسل میں بہت سے لوگوں نے ان کی اس یونیورسٹی میں ملازمت کی بہت پر زور الفاظ میں مخالفت کی۔ اور کہا کہ چونکہ پروفیسر مکرجی اب بالکل معذور ہو گئے ہیں لہٰذا یونیورسٹی کے قواعد کے مطابق ان کے اوپر ڈاکٹروں کا ایک بورڈ معائنہ کے لئے بیٹھایا جائے۔ جس کی تجویز یقیناً یہ ہوگی کہ ان کو یونیورسٹی سے نکال دیا جائے۔ ذاکر صاحب سب کی تقاریر خاموشی سے سنتے رہے۔ آخر میں بولے کیا سب کہہ چکے جو کہنا تھا یا کسی کو کہنے کے لئے باقی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ سب کہہ چکے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔ ذاکر صاحب بولے تو اب آپ لوگ میرا فیصلہ سن لیجئے۔ ابھی تو پروفیسر مکرجی اس قابل ہیں کہ کار میں بیٹھ کر منٹوں کے لئے ہی سہی شعبہ میں آ سکتے ہیں۔ اگر وہ بستر مرگ پر لیٹ جائیں اور اپنے علی گڑھ میں قیام کے سارے عرصہ میں وہ coma میں پڑے رہیں تب بھی میں ان کو رکھوں گا اور تنخواہ دوں گا۔ ذاکر صاحب نے ان کو عزت کے ساتھ

پانچ سال رکھا اور اپنی علی گڑھ سے واپسی کے وقت اپنے دوست کرنل بی. ایچ. زیدی سے جو اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر آئے تھے کہہ گئے کہ آپ براہ مہربانی میری عزت رکھیں اور پروفیسر مکرجی کو علی گڑھ سے قبل از وقت ریٹائر نہ کریں۔

ایگزیکٹو کونسل کے بعد مجھ سے بلا کر پورا قصہ جو وہاں ہوا سنایا اور کہا کہ میں نے تم کو بلایا تھا۔ اب ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ان کے قیام سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اب تو ہر حالت میں شعبہ کی قیادت تمہیں کو کرنا ہے۔ پروفیسر مکرجی سے کاغذات پر دستخط کرواتے رہنا۔ اور شعبہ معاشیات کو شعبہ عاشیات کی طرح ہی بڑھانے کی کوشش کرنا۔ اب یہ خدمت میں تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب آپ نے ایگزیکٹو کونسل میں بہت اچھا کیا اور میں تو آپ سے پہلے ہی وعدہ کر چکا ہوں کہ میں شعبہ کی خدمت کے لئے ہر وقت تیار ہوں گا۔ اس سے مجھے کوئی غرض نہیں کہ میں کبھی پروفیسر ہوں یا نہ ہوں۔ جب کیمبرج اور آکسفورڈ جیسی مشہور یونیورسٹیوں میں لوگ اپنی پوزیشن کی نہیں، اپنے کام کی پرواہ کرتے ہیں تو میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں یہ کام کیوں نہیں ہو سکتا جبکہ اس درسگاہ کے بانی نے اس یونیورسٹی کا خاکہ ان ہی یونیورسٹیوں کے نقشہ پر تیار کیا تھا۔

آج جب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ کیا شخصیت تھی ذاکر صاحب کی کہ نوجوان لوگوں کی ضرورت سے زیادہ ہمت افزائی کرتے تھے۔ اور اگر ان کے دل میں کسی کی قابلیت کا یقین ہو جائے تو اس کی آخر وقت تک عزت کرتے تھے۔

اب میں آپ لوگوں کو یہ بتا دوں کہ پروفیسر مکرجی کے خطبہ کے اندر مجھے کچھ کمزوری کا احساس ہوا تھا لیکن یہ صحیح طور پر علم نہ تھا کہ یہ کمزوری کہاں ہے۔ میں نے بڑے عدہ محنت پڑھنے لکھنے، نوٹس بنانے اور کتاب لکھنے میں کی۔ کتاب کا موضوع شمپٹر کے اصول ترقی تھا۔ اس میں تحقیق اس بات کی کی گئی تھی کہ شمپٹر کے خیالات کو کن لوگوں نے متاثر کیا اور اس میں مارکس، کینس اور ان لوگوں کے جو کینس کے خیالات کے حامی تھے اور جنہوں نے ان کے اصولوں کی بنا پر اصول ترقی کی بنیاد رکھی تھی، کے خیالات کا گہرے طور پر جائزہ اور موازنہ کیا گیا تھا۔ کتاب کے آخر میں دو تتمے تھے۔ ایک موجودہ اصول ترقی کینس کے خیالات کے مطابق۔ اور دوسرا مارکس کے اصول ترقی پر۔ یہ سب کام میں نے بہت جلد ہی ختم کر لیا۔ اور جب کتاب کا آخری مسودہ تیار ہو گیا تو میں اس کی ایک ٹائپ کاپی ذاکر صاحب کے پاس لے گیا اور ان سے یہ کتاب کو ان کے نام انتساب کرنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے فرمایا کہ اس کتاب کا مسودہ چھوڑ جاؤ۔ اس کو میں دیکھوں گا۔ کچھ دن کے بعد بلایا۔ اور کہا کہ مجھے تمہاری کتاب اچھی لگی۔ کاش کہ کوئی ایسی ہی کتاب ورنرژومبارٹ پر بھی لکھتا! ورنرژومبارٹ جرمنی میں ان کے استاد رہے تھے اور ذاکر صاحب ان سے بہت متاثر تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ ان کا کام تو صرف دو چھوٹی کتابوں کے علاوہ (جن کا ترجمہ انگریزی میں ہو گیا ہے) سب کا سب جرمن زبان میں ہے۔

اس لئے میں شاید اس کام کو آپ کی خواہش کے مطابق انجام نہ دے سکوں گا۔ اس لئے کہ مجھ کو جرمن زبان بالکل نہیں آتی۔ اور اگر میں نے اب اس بات کی کوشش کی کہ جرمن زبان کو سیکھوں اور اس کے بعد ونڈر و بنارٹ پر کام کروں تو مجھے شبہ ہے کہ اس کام کو اس معیار پر بھی نہ کر سکوں گا جس معیار کی موجودہ کتاب ہے۔ کہنے لگے نہیں یہ کتاب تو بہت اچھی ہے۔ اور تم میرے نام انتساب کر دو تو مجھے خوشی ہوگی۔ لیکن تاکید کی کہ اس کی انگریزی زبان کسی سے درست کروالو اگر میری انگریزی اچھی ہوتی تو میں یہ کام خود انجام دیتا۔ دراصل زبان کو درست کروانا اس لئے ضروری ہے کہ مجھے یقین ہے کہ ہمارے ملک میں اصول معاشیات جاننے والے بہت کم ہیں۔ ان کی سمجھ میں کتاب کا موضوع تو صحیح طور پر نہ آسکے گا۔ اور چونکہ کوئی کسی کی تعریف نہیں چاہتا تو جا بجا جہاں جہاں انگریزی زبان کی غلطیاں ہوں گی ان کا تذکرہ کر کے خوش ہوگا۔ اور زیادہ سے زیادہ انگریزی کی غلطیاں نکالے گا۔ مزید فرمایا کہ آج کل کے سائنس کے دور میں کس کے پاس اتنا وقت ہے جو تمہارے لمبے لمبے تتمہ کتاب کے بعد پڑھے گا۔ اگر مناسب سمجھو تو کارل مارکس پر جو تتمہ ہے اس کو اس کتاب میں شامل کر دینا جو میرے احباب میری ستر سال کی سالگرہ پر پیش کرنے والے ہیں۔ میں نے وہ تتمہ ان صاحب کو دے دیا جو اس کتاب کے چھپوانے کے اور ان کے مضامین اکٹھے کرنے کے مہتمم تھے، لیکن افسوس اس کو انہوں نے ضائع کر دیا ۔ میرے پاس اس کی دوسری کاپی نہ تھی لہٰذا مجھ کو اس کتاب میں شامل کرنے کے لئے دوسرا مضمون لکھنا پڑا۔ اس کا افسوس تو نہیں ہوا۔ لیکن افسوس اس بات کا کہ ذاکر صاحب نے اس مضمون کو اس کتاب میں شامل کرنے کی خواہش خود کی تھی وہ اس میں شامل نہ ہو سکا۔

اب یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب یہ کتاب شائع ہوئی اور اس کو دنیا کے بہترین رسائل میں ریویو کے لئے اور بڑے بڑے ماہرین معاشیات کے پاس ان کی رائے کے لئے بھیجا گیا تو اس کی ہر رسالہ میں بے حد تعریف ہوئی۔ اور ماہرین میں سے زیادہ تر نے بھی بہت تعریف کی جس کے قابل وہ یقینی نہ تھی۔ لیکن اس کو کوئی کیا کرے کہ اگر لوگ تعریف پر آمادہ ہو جائیں تو اس کے پل باندھ دیتے ہیں۔ اور اگر اس کی برائی پر آمادہ ہوں تو اس کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ انگریزی کی ایک مثل ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کامیابی کی برابر کوئی کامیابی نہیں ہوتی اور ناکامی کے برابر کوئی ناکامی نہیں ہوتی۔ غالباً میری کتاب کا بھی یہی حشر ہوا۔ چونکہ وہ کامیاب ہوئی تو بڑی کامیاب بن گئی۔

میں اس کتاب کو ختم کرنے کے بعد فوراً دوسری کتاب اور اس کے بعد تیسری کتاب لکھنے میں مشغول ہو گیا۔
دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں مثلاً امریکہ کی یونیورسٹی آف شکاگو اور جرمنی کی ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کے لئے آفر آئے لیکن جب پہلی کتاب کی تعریف چاروں طرف سے دنیا کے ہر ملک کی زبان میں آنے لگی تو میں نے صرف ذاکر صاحب کی خوشنودی کے لئے جس میں میری تعلی کا کوئی پہلو نہ تھا ان کی نقل اور ان کے ترجموں کی نقل جو مختلف

سفارت خانوں سے کروائی تھی بھیجی۔ ان کو غالباً یہ غلط فہمی ہوئی کہ میں اس کتاب کی تعریف سے اتنا خوش ہوں کہ اس کا تذکرہ ان سے اور غالباً ان کے خیال سے ہر ایک سے کرنا چاہتا ہوں تو ان کا جواب آیا کہ تمہاری کتاب تو یقیناً بہت اچھی ہے لیکن اب تم اس کو بھول جاؤ اور کوئی دوسرا کام کرو۔ حالانکہ ان کو اس بات کا علم نہ تھا کہ میں ان کی ہدایت آنے سے پہلے ہی دوسرے کاموں میں لگ گیا تھا۔ ذاکر صاحب کی میں سمجھتا ہوں یہ بہت بڑی خوبی تھی کہ وہ اس نوجوان کو قبل اس کے کہ وہ غلط کاموں میں مبتلا ہو جائے یا کسی غلط فہمی کا شکار ہو جائے متنبہ کر دیتے تھے تاکہ وہ ہمیشہ صحیح راستہ پر رہے۔



ذاکر صاحب جب تک یونیورسٹی میں وائس چانسلر رہے میرے اوپر بہت کرم فرماتے رہے۔ اور یقین ہے کہ دوسروں کے اوپر بھی اسی طرح کرم فرماتے رہے ہوں گے۔ اور غالباً ہر شخص جس کو ان سے کوئی تعلق ہوا یہی احساس رہا کہ وہ اس کو سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ اب کس کو کتنا چاہتے تھے اس کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کو تھا یا ان کو معلوم ہوگا۔ وہ انتہائی منکسر آدمی تھے۔ جب بھی کوئی ان سے ملنے جاتا بہت خوشگوار باتیں کرتے۔ اور اس کو چھوڑنے ہمیشہ ڈرائنگ روم کے دروازہ سے باہر آتے۔ چونکہ ان کو ہارٹ اٹیک یہاں آنے کے دو ایک سال کے اندر ہی ہو گیا تھا اس لئے اپنا آفس گھر پر ہی کیا کرتے تھے۔ اساتذہ کی عزت تو کرتے ہی تھے۔ لیکن کلرک اور چپراسیوں کی عزت بھی اسی طرح کرتے تھے۔ میں نے ان کو اپنے خیالات میں بہت وسیع القلب پایا۔ وہ اپنے سے چھوٹوں کو صحیح بات بتانے میں ذرا تامل نہ کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر شعبہ معاشیات کے لوگوں کو علی گڑھ سے باہر آگرہ وغیرہ تفریح کے لئے لے جاتے تھے۔ شعبہ معاشیات سے ان کا گہرا تعلق اس لئے بھی تھا کہ وہ معاشیات کے آنریری پروفیسر بھی تھے۔ جب وہ باہر تفریح کے لئے جاتے تو ان کے ڈاکٹر بھی ان کے ساتھ ہوتے۔ اس زمانہ میں مجھے انڈے کھانے کا بہت شوق تھا۔ ذاکر صاحب کھانے کا سب سامان اپنے ساتھ لے جاتے۔ ایک دن ہم لوگ ان کے ساتھ کا لے جایا ہوا سامان کھا پی رہے تھے تو میں نے ایک انڈا لینے کے بعد دوسرا لینا چاہا۔ بولے نہیں۔ ابھی نہیں پہلے دوسرے لوگوں کو لے لینے دو اگر اس کے بعد بھی بچیں تو لے لینا۔ وہ سامان تو اتنا لے جاتے تھے کہ نہ بچنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا لیکن ان کی عادت تھی کہ اپنے سے چھوٹوں کو صحیح بات ضرور بتاتے تھے۔

ایک مرتبہ جب ہم لوگ ذاکر صاحب کے ساتھ آگرہ سے واپس آئے تو علم ہوا کہ امریکہ کے کوئی پروفیسر آئے ہیں جو اس وقت پاکستان میں مقیم تھے۔ وہاں سے انہوں نے ہندوستان کی گورنمنٹ کو لکھا کہ مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے دعوت نامہ آیا ہے لہٰذا میں ہندوستان آنا چاہتا ہوں۔ اور یونیورسٹی کو لکھا کہ مجھے ہندوستان کی گورنمنٹ نے

بلایا ہے۔ اس لئے یونیورسٹی بھی آنا جاتا ہوں۔ جب ہم لوگ واپس آئے تو معلوم ہوا کہ وہ یہاں آ چکے ہیں۔ ذاکر صاحب نے مجھ سے ارشاد کیا کہ میں ان کی دیکھ بھال کروں۔ اللہ جانے کون صاحب ہیں جو خود بخود مہمان بن کر آ گئے ہیں۔ لیکن مہمان کی خاطر تو ہر حالت میں ضروری ہے۔ میں ان صاحب کی خاطر مدارات میں لگ گیا۔ جب ان کے لئے شام کے کھانے کا انتظام کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ بغیر پہلے شراب پیئے کھانا کیسے کھایا جا سکتا ہے۔ مجھ سے ذاکر صاحب نے کہا کہ تم ان صاحب کو اپنے گھر لے جا کر شراب پلا کر لے آؤ۔ اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ ذاکر صاحب میں تو شراب پیتا ہی نہیں ہوں تو ان کو کہاں سے پلاؤں گا۔ کہنے لگے اتنے دنوں باہر رہے اور شراب نہیں پی۔ دنیا میں سب ہی کام کرنا چاہیے۔ خیر اگر تم شراب نہیں پیتے تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن دوسروں کو پلانے کے لئے اپنے پاس رکھا کرو۔ اس لئے کہ مہمان کی خاطر کے لئے یہ بھی کبھی کبھی ضروری ہو جاتا ہے۔

یہ بات تو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ذاکر صاحب کی زندگی کا حسین پہلو یہ تھا کہ ان کے اندر بہت صاف ستھرا مزاح تھا۔ ایک مرتبہ میں ایک بڑے اچھے پڑھنے والے لیکن بہت دبلے پتلے لڑکے کو لے کر ان کے پاس گیا اور عرض کیا کہ اگر آپ اس طالب علم کی جو پڑھنے لکھنے میں بہت اچھا رہا ہے، ملازمت دلانے میں مدد کر دیں تو بہت اچھا ہوگا، اس لئے کہ غریب خاندان سے ہے اور اپنے گھر والوں کی مدد کرتا رہے گا۔ لڑکے کی طرف مخاطب ہو کر بولے کہ تم تو اتنے دبلے پتلے ہو، تم کو ملازمت کون دے دے گا۔ اب اس وقت تو جلدی سے تم موٹے نہیں ہو سکتے۔ تو شیروانی ڈھیلی بنوا کر پہنو اور اس کے اندر پیڈنگ کروا کہ موٹے دکھائی دو۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ ذاکر صاحب کو یونیورسٹی کے لڑکوں سے والہانہ محبت تھی۔ ایک مرتبہ نواب لیاقت علی خاں جو پاکستان کے وزیر اعظم تھے، ان کے انتقال پر لڑکوں نے سائرن سات مرتبہ بجا دیا جو اپنے ملک کے سب سے معزز لیڈر کے انتقال پر بجایا جا سکتا تھا۔ اس پر ملک میں تیز چہ میگوئیاں ہوئیں۔ اخباروں نے بہت برا بھلا لکھا۔ ذاکر صاحب نے یونین ہال میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ اس میں بعینہ انہیں الفاظ میں کہا کہ "ان مجروروں کو کیا اختیار ہے کہ ہمارے بچوں کی نگرانی کریں۔ ہم ان سے خود بات کریں گے" اور طلباء اور طالبات کو بہت محبت سے سمجھایا کہ ایسا کام ہرگز نہ کریں جس سے یونیورسٹی کی کوئی بدنامی ہو۔ بچوں اور بچیوں کی سمجھ میں آ گیا اور اس کے بعد کبھی انہوں نے ایسی حرکت نہیں کی۔

شعبہ معاشیات کی حد تک مجھ کو واقفیت تھی کہ ذاکر صاحب جب تک علی گڑھ میں رہے ایم۔ اے فائنل کے زبانی امتحان میں آ کر ضرور بیٹھتے تھے۔ چاہے وہ دو تین دن چلے۔ مگر میری سمجھ میں یہ بات مدت تک نہیں آئی کہ وہ

والس چانسلر جیسے عدیم الفرصت عہدہ پر کام کرنے کے باوجود اتنا وقت کیسے اور کیوں نکال لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں نے یہ خیال کر کے کہ پروفیسر عاقل جامعہ ملیہ اسلامیہ میں معاشیات کے پروفیسر ہیں اور ذاکر صاحب کے پرانے ساتھیوں میں سے ہیں ان کو ایک پرچہ کا ممتحن بنایا۔ انہوں نے زیادہ تر طلبا کو تھرڈ کلاس اور کچھ کو سیکنڈ کلاس نمبر دیئے۔ کسی کو بھی فرسٹ کلاس نمبر نہ ملے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی اس لئے کہ مجھے یقین تھا کہ شعبہ کے طلبا میں کئی بہت پڑھنے والے اور قابل طالب علم تھے۔ میں نے ایک دن ذاکر صاحب سے اس بات کا ذکر کیا اور اپنے تعجب کا اظہار کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ اگر تم ایسے لوگوں کو ممتحن بناؤ گے جو زندگی میں کبھی کسی یونیورسٹی میں ممتحن نہ رہے ہوں تو یہی نتیجہ نکلے گا۔ میں نے عرض کیا کہ پروفیسر عاقل تو بہت قابل اور ایماندار آدمی ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ سب باتیں فضول ہیں ممتحن پرانے لوگوں کو جو یونیورسٹیوں میں مدت سے پڑھاتے ہوں اور متعدد جگہ ممتحن ہوں ان کو بنایا کرو۔ میں نے عرض کیا کہ میں آپ کی بات کو سمجھ نہ سکا کہ ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کہنے لگے دیکھو جو لوگ پرانے ہوتے ہیں۔ اور مختلف جگہوں پر ممتحن رہتے ہیں۔ ان کو بچوں کی علمی حالت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہر یونیورسٹی میں کم و بیش ایک ہی قسم کے طالب علم ہوتے ہیں۔ وہ ان کی قابلیت سے بھی واقف ہوتے ہیں اور ان کی کمزوریوں سے بھی۔ اس لئے وہ نمبر اچھے دیتے ہیں۔ اب دیکھو میں عدیم الفرصت ہونے کے باوجود شعبہ معاشیات کے زبانی امتحان میں ہر سال بیٹھتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے امتحان کا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا اور اگر کسی طالب علم کو میں یہ سمجھتا ہوں کہ آئندہ ترقی کر سکتا ہے تو میں اس کو زیادہ نمبر دلوانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور عموماً سب لوگوں کو اچھے نمبر ملتے ہیں تاکہ ان کے کسی پرچے میں کم نمبر ہوں تو اس کی کمی اس طرح پوری ہو سکے۔ تب میرے اوپر راز کھلا کہ ذاکر صاحب اس باقاعدگی کے ساتھ شعبہ معاشیات کے زبانی امتحان میں کیوں آیا کرتے تھے۔

ذاکر صاحب نہایت نیک دل اور ملنسار انسان تھے۔ اور کبھی کسی شخص کو جو محبت سے اور کوئی امید لے کر آتا واپس نہ کرتے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے، وہ جب یونیورسٹی کے وائس چانسلری کے عہدہ سے سبکدوش ہو چکے تھے اور بہار کی ریاست میں گورنر کی حیثیت سے مامور تھے، علی گڑھ آئے۔ ہر چند کہ ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر یوسف حسین خاں موجود تھے، جو عثمانیہ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبہ تاریخ رہ چکے تھے اور اس یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر کے عہدہ پر مامور تھے وہ کرنل بی۔ ایچ زیدی، جو ان کے دوست تھے اور مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، کے پاس ٹھہرے۔ کرنل زیدی سے انہوں نے کہا کہ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ناشتہ پر دو مہمانوں کو بلانا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے کرنل زیدی کیسے منع کرتے۔ ذاکر صاحب نے مجھ کو اور میری بیوی کشور کو مدعو کیا اس لئے کہ ان کا خیال تھا کہ اس وقت کے علاوہ ان کو ہم لوگوں سے ملنے کا وقت نہ مل سکے گا۔ جب ہم لوگ پہنچے تو زیدی صاحب بولے کہ ان لوگوں سے تو میرا بھی

تعلق ہے پھر آپ نے ان کا نام مجھے کیوں نہ بتایا۔ کہنے لگے یہ ہمارے خاص ملنے والے ہیں اور ان لوگوں سے ہیں خاص طور سے ملنا چاہتا تھا۔ جب ہم لوگ ناشتہ کرکے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے تو ایک صاحب جو ذاکر صاحب کے زمانہ سے اس وقت تک یونیورسٹی میں چپراسی کی حیثیت سے کام کرتے تھے، ذاکر صاحب سے ملنے کے لئے آئے۔ ذاکر صاحب ان سے بہت تپاک سے ملے۔ ان کو گلے لگایا، اور ان کے آنے کی وجہ دریافت کی۔ وہ بولے آپ کی صحت ٹھیک نہیں رہتی ہے اس کے لئے دوا لے کر آیا ہوں۔ اور جیب سے نکال کر ایک پڑیا ان کے سامنے پیش کی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو نقصان بھی نہ ہوگا۔ ذاکر صاحب بولے۔ ایسی دوا کس کام کی جو نہ فائدہ کرے نہ نقصان۔ کم از کم اس کو ایک کام تو کرنا چاہئے۔ اس کے بعد بغیر ان کا جواب سنے ہوئے زیدی صاحب سے کہہ کر چپراسی سے ایک گلاس میں پانی منگوایا اور ان کے سامنے ہی وہ دوا کھائی اور ان کا بہت شکریہ ادا کیا۔ جب وہ چلے گئے تو کہنے لگے یہ دوا میرے لئے زہر بھی ہو سکتی ہے مگر مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ جب میرے لئے اس محبت کے ساتھ کوئی دوا لائے تو مجھے کھانا لازم ہے اس کا کوئی بھی اثر کیوں نہ ہو۔ میں نے دل میں سوچا کہ یا اللہ یہ کتنی بڑی شخصیت ہے جس کو دوسرے کا دل رکھنے کے لئے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں۔

جس زمانہ میں وہ یونیورسٹی میں وائس چانسلر تھے اور میں کلرک کی حیثیت سے کام کر رہا تھا انہوں نے یونیورسٹی میں کئی بار تقاریر کرنے کے لئے دلی اسکول آف اکنامکس کے پروفیسر ملک بن گنگولی اور پروفیسر وی۔ کے۔ آر۔ وی۔ راؤ کو بلایا۔ اور ہر تقریر میں خود بھی آئے۔ حالانکہ دل کے مریض تھے۔ ظاہر ہے کہ شعبے کے سب اساتذہ اور طلبا بھی ان کی تقاریر میں شامل ہوتے تھے۔ ایک دن انہوں نے دیکھا کہ میں تقریر میں نہ تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ میرے پیٹ میں بہت شدید درد ہے اس لئے نہ آسکا۔ میں اس زمانہ میں عثمانیہ ہوسٹل کے وارڈن کے کمرے سے ملحق ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتا تھا۔ تقریر ختم ہونے کے بعد ذاکر صاحب یونیورسٹی اسپتال سے چیف میڈیکل آفیسر کو لے کر میرے پاس اوپر چڑھ کر آگئے۔ جن لوگوں نے عثمانیہ ہوسٹل کو دیکھا ہے انہیں علم ہوگا کہ اس میں سیڑھیاں بہت اونچی اونچی ہیں۔ لیکن ذاکر صاحب نے اس کی پرواہ نہ کی اور چیف میڈیکل آفیسر سے کہا کہ شبیر صاحب کا خاص طور سے خیال رکھا جائے۔ جب یونیورسٹی کے وائس چانسلر اتنی دلچسپی لیں تو ظاہر ہے کہ چیف میڈیکل آفیسر تو علاج میں جان تک لگا دے گا۔ تمام ڈاکٹر، کمپاؤنڈر، نرسیں میری دیکھ بھال پر مامور ہو گئے۔ اور خود ذاکر صاحب بھی وقتاً فوقتاً میرے پاس آتے اور خیریت معلوم کرتے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا میں کسی بہت مہلک مرض میں مبتلا ہوں حالانکہ بات صرف بدہضمی کی رہی ہوگی۔

اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک مرتبہ میں گرمی کی چھٹیوں کے دوران علی گڑھ آیا اور اپنے ایک ساتھی جو صاحب باغ

کے ایک وارڈن کے کمرے میں رہتے تھے ان کے ساتھ مقیم ہوا۔ ذاکر صاحب سے ملنے کا وقت مانگا جو بہت آسانی سے مل گیا۔ جس وقت اور جس دن مجھے ان سے ملنا تھا اس دن مجھے بہت تیز بخار آ گیا اور ایسا لگتا تھا کہ بدن میں آگ لگی ہوئی ہے۔ میرے ساتھی نے کہا کہ اگر آپ اجازت دے دیں تو جو وقت آپ کے لئے متعین ہے اس وقت میں ذاکر صاحب سے مل لوں۔ میں نے کہا اس سے بہتر کوئی بات نہ ہوگی اس لئے کہ آپ جب ملیں تو ذاکر صاحب سے میری طرف سے معذرت بھی کر دیجئے گا۔ ذاکر صاحب نے ان صاحب سے جب میرے نہ پہنچنے کی وجہ دریافت کی تو پتہ چلا کہ مجھے بہت تیز بخار ہے۔ وہ صاحب ذاکر صاحب سے مل کر چلے آئے۔ ذاکر صاحب دوسرے لوگوں سے جنہیں ملاقات کے لئے وقت دیا جا چکا تھا ——— مل کر چیف میڈیکل آفیسر کو میرے پاس لے کر آ گئے۔ ان سے میرا بہت احتیاط سے علاج کرنے کے بارے میں کہا۔ پھر تو پورے اسپتال کا اسٹاف جٹ گیا اور ہفتہ عشرہ کے بعد میری طبیعت ٹھیک ہو گئی۔

ذاکر صاحب کے اندر میں نے ایک بات خاص طور پر ملاحظہ کی کہ ان کا خیال بہت مستحکم تھا کہ ایک یونیورسٹی کے اندر ہر خیال اور آئیڈیالوجی کے لوگوں کو ہونا چاہئے۔ جب ذاکر صاحب بہار میں گورنر تھے اس وقت یونیورسٹی میں کرنل بی۔ ایچ زیدی وائس چانسلر کے عہدہ پر فائز تھے جو ذاکر صاحب کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ اور پروفیسر یوسف حسین خاں صاحب جو ان کے چھوٹے بھائی تھے یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر تھے۔ اس زمانہ میں عجیب وغریب حالات پیش آئے۔ کمیونسٹوں اور ان کے مخالفین میں بہت سخت پارٹی بندی ہو گئی۔ ہر چند کہ کمیونسٹوں کی تعداد کم تھی لیکن وہ بہت ہوشیار اور ایک دوسرے سے جڑے رہنے والے لوگ تھے۔ ان کی سرکردگی زیدی صاحب کر رہے تھے۔ اور اینٹی کمیونسٹوں کی تعداد زیادہ تھی جن میں آپس میں اختلافات بھی تھے لیکن کمیونسٹوں کی مخالفت میں وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ ان کے لیڈر ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب تھے۔ حالات اس درجہ خراب ہوئے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔ اب آپ اس کو میری بے وقوفی سمجھیں یا محض اتفاق کہ میں پروفیسر یوسف حسین خاں صاحب کی پارٹی میں شامل تھا۔ چونکہ میری عمر کم تھی بے حد پرجوش تھا اور میرے اندر بہت انہماک تھا اسلئے مجھ کو میری پارٹی والے کمیونسٹوں کے خلاف تقریر کرنے کے لئے ہر کمیٹی اور کاونسل میں چڑھا دیا کرتے تھے۔ زیادہ تر لوگ اس پارٹی میں چپ چاپ بیٹھنے والے تھے۔ اور سب لوگوں نے طے یہ کر رکھا تھا کہ اگر تقریریں زیادہ کرتے رہے تو دن کے دن گذر جائیں گے اور کوئی فیصلہ کن بات نہ ہو سکے گی۔ اس لئے میری دھواں دھار تقریر کے بعد سب لوگ یہ کہہ دیں کہ باتیں دونوں طرف کی سن لی گئیں اور اب فیصلہ ووٹنگ کر کے کر لیا جائے۔ اور ظاہر ہے کہ چونکہ اس طرف کے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی لہٰذا معاملات ہم لوگوں کی خواہش کے مطابق طے ہو جایا کرتے تھے۔ حالات

اس قدر خراب ہوئے کہ ایک دن وائس چانسلر صاحب نے پرووائس چانسلر صاحب کو نوٹس دے دیا کہ وہ دو دن کے اندر اندر یونیورسٹی سے نکل جائیں۔ اور دوسری طرف پرووائس چانسلر صاحب کے ساتھیوں نے ایگزیکٹو کونسل کے زیادہ تر ممبران سے دستخط کروا کے یہ نوٹس دے دیا کہ کاؤنسل کی ایک ہنگامی میٹنگ کی جائے جس میں وائس چانسلر صاحب کے خلاف عدم اعتماد کا فیصلہ لے لیا جائے۔ حالات اس نوعیت کو پہنچ چکے تھے کہ دونوں طرف کے لوگ پریشان تھے اور دن رات سر جوڑ کر تدابیر اور منصوبے بنانے میں لگے رہتے تھے۔ شاید کوئی ایک آدھ ہی ایسا بچا ہو جس کو پڑھنے پڑھانے میں دلچسپی رہی ہو۔ اب یوسف حسین خاں صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ چوں کہ ذاکر صاحب تم سے بہت محبت کرتے ہیں اس لئے ان کو یہاں کے متعلق تفصیلی حالات سے آگاہ کر دو۔ اور ان سے درخواست کرو کہ چوں کہ یہاں پر کمیونسٹوں نے بڑا اودھم مچا رکھا ہے اور وائس چانسلر صاحب ان کی سرکردگی کر رہے ہیں تو وہ دخل اندازی کریں۔ میں نے کوئی دس بارہ صفحوں پر مشتمل یہاں کے حالات اور درحقیقت میرے اس وقت کے خیال سے کمیونسٹوں کے باعث جو ہی رہے کے بارے میں بھلا برا لکھا ذاکر صاحب کو لکھ کر ان کی خدمت میں بھیج دیا۔ ذاکر صاحب کی عادت تھی اگر ان کے پاس خط اردو میں جائے تو اردو میں جواب دیتے تھے اور اگر انگریزی میں جائے تو انگریزی میں۔ ہر چند کہ اردو کے تمام خطوط کو انہیں خود اپنے ہاتھ سے لکھنا پڑتا تھا اور اس سے ان کو خاصی پریشانی ہوتی ہوگی۔ چونکہ میرا خط اردو میں لکھا ہوا تھا ان کا بہت ہی جلد اردو میں لکھا ہوا جواب آگیا جو کہ بہت مختصر تھا۔ اس میں لکھا تھا "شبیر جلد دعائیں۔ تمہارا خط ملا۔ حالات سے واقفیت ہوئی۔ کاش کہ تم اپنی توجہ اپنے شعبہ کی طرف منعطف کرتے۔ اگر تم اس کو بنا سکو تو تمہارے جیسے ملک میں بہت ہی کم آدمی ہیں گے۔ فقط مخلص ذاکر حسین"۔ چونکہ میں جانتا تھا کہ ذاکر صاحب بہت مخلص تھے میں ہمیشہ ان کی بات کو صحیح انداز میں سمجھتا تھا۔ میں ان کا خط دیکھ کر سناٹے میں رہ گیا۔ مجھے کسی قسم کی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ اور خیال کیا کہ میں نے بڑی غلطی کی جو یہاں کی پولٹکس میں اس قدر انہماک سے حصہ لیا۔

ایک بات ضمناً یہ بھی بتا دوں، ذاکر صاحب کی میرے اوپر شفقت کا احساس پٹنہ اور لوگوں کے پٹنہ کے ایک پروفیسر ہیں۔ آر۔ مصرا کو بھی تھا جنہوں نے لندن اسکول آف اکنامکس سے پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی۔ لٹ دونوں ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ آدمی بہت نیک اور مخلص تھے۔ لیکن ان کو پالٹکس میں داخل ہونے کی اور بہار کی کسی یونیورسٹی میں وائس چانسلر بننے کی بڑی خواہش تھی۔ وہ مجھے اکثر مختلف کاموں سے پٹنہ بلاتے اور اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ میں ذاکر صاحب سے مل کر ضرور جاؤں۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ اگر میں ذاکر صاحب سے ملوں گا تو وہ مجھے کھانے پر ضرور بلائیں گے اور اخلاقی طور پر میرے ساتھ میرے میزبان پروفیسر مصرا کو بھی بلائیں گے۔ تو دوسرے دن وہاں کے لوکل اخباروں میں

ان کو نام لکھے گا کہ انہوں نے گورنر کے ساتھ کھانا کھایا اور اس طرح ان کو ذاکر صاحب سے ملنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح سے وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ چونکہ وہ شریف آدمی بھی تھے۔ اس لئے مجھے کوئی اعتراض بھی نہ تھا کہ میری وجہ سے ان کی کوئی نیک خواہش پوری ہو جائے۔ ہر چند کہ میں خود ذاتی طور پر اس خیال کا حامی تھا کہ کسی پروفیسر کو وائس چانسلر بننے کی خواہش کوئی بہت اچھی چیز نہیں ہے۔ میرے خیال میں تو پروفیسر کی ایک شان ہی دوسری ہے جس کی میں بہت قدر کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ پروفیسر مہرا نے مجھے اور اتفاق سے کئی دوسرے پروفیسروں کو بلایا تھا۔ کسی کو پی۔ ایچ۔ ڈی کا امتحان لینے کے لئے، کسی کو سلکشن کمیٹی میں اکسپرٹ کی حیثیت سے حصہ لینے کے لئے اور کسی کو بورڈ آف اسٹڈیز میں شامل ہونے کے لئے۔ بہر اتفاق سے اس وقت بھی ذاکر صاحب سے ملنے کے لئے راج بھون میں چلا گیا۔ تو ذاکر صاحب بولے کہ آج شب کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ اب کی مرتبہ تو میرے ساتھ پروفیسروں کا ایک قافلہ ہے۔ اس لئے غالباً میرا آنا مناسب نہ ہوگا۔ بولے سب کو بلا لیا جائے گا۔ انہوں نے اپنے سکریٹری کو اشارہ کیا اور ان کو حکم دیا کہ سب کے نام نوٹ کر لو تاکہ سب لوگوں کو دعوت نامے بھجوا دیئے جائیں۔ سکریٹری نے مجھے علیحدہ لے جا کر ہر شخص کا نام اور اس کی پوزیشن کے بارے میں پوچھا اور ظاہر ہے کہ میں نے اپنا نام سب سے آخر میں لکھوایا اور کہا میری پوزیشن سب سے کم ہے۔ ڈنر بالکل فارمل تھا۔ جس میں سب لوگوں کے آگے ان کے چھپے ہوئے نام لگے تھے اور چھپے ہوئے مینو لگے تھے۔ ذاکر صاحب میزبان کی حیثیت سے میز کی ایک طرف تھے۔ اور میں سب لوگوں کے آخر میں۔ پروفیسر مہرا کے یہاں جو لوگ اس بار آئے تھے، میرے علاوہ سب کی کمزوری یہ تھی کہ سب کے سب شراب پیتے تھے۔ اور پروفیسر مہرا میزبان کی حیثیت سے اس کا ان لوگوں کے لئے خاص طور سے اہتمام کرتے تھے۔ اس دن میں نے ان لوگوں سے خاص طور سے درخواست کی کہ وہ ایسے موقعہ پر یہ کام نہ کریں۔ اس لئے ان کو گورنر صاحب کے یہاں کھانے پر جانے سے پہلے شراب پینا مناسب نہیں لیکن انہوں نے میری ایک بات نہ سنی۔ اور سب کے سب بولے کہ ہمارے اوپر تو شراب پینے کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ گورنر صاحب کے سامنے ذرہ برابر پتہ نہ چلے گا کہ ہم لوگ شراب پئے ہوئے ہیں۔ میرے لئے سوائے درخواست کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا اور وہ سب کے سب اپنی ضد پر اڑے تھے کہ اتنے دنوں کے بعد تو سب لوگ جمع ہوئے ہیں اگر آج بھی نہ پئیں گے تو کب پئیں گے۔ میں سب لوگوں کے سامنے لاچار ہو گیا۔ اور انجام یہ ہوا کہ جب ہم لوگ راج بھون پہنچے تو ہر شخص شراب کے نشہ میں دھت تھا۔ سب کے سب زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ اور واہی تباہی بک رہے تھے۔ اور میں تھا کہ ذاکر صاحب کے سامنے ندامت

سے سر چار رہا تھا۔ کھانے کے بعد ذاکر صاحب بولے اب کافی ڈرائنگ روم میں پئیں گے۔ ظاہر ہے کہ ڈرائنگ روم میں کوئی پروٹوکال نہیں تھا۔ ذاکر صاحب نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا اور کہنے لگے کہ کیا یہ سب تمہارے دوست ہیں۔ میں نے گھبرا کر کہا کہ جی ہاں تعلقات تو سب ہی سے ہیں۔ پھر فوراً میرے دماغ میں ایک لہر آئی۔ اور میں نے ہمت کر کے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ ہی نے فرمایا تھا کہ ہر انسان میں کمزوریاں ضرور ہوتی ہیں۔ بس دوست بناتے وقت یہ دیکھ لینا چاہیے کہ کمزوریاں کم سے کم ہوں اور اچھائیاں زیادہ سے زیادہ ہوں۔ بہت شفقت سے فرمایا کہ ان کے ہوش آنے کے بعد انہیں سمجھا دینا کہ ایسے موقع پر ایسی حرکت نہ کیا کریں۔ میں نے کہا ضرور کہوں گا۔ اور سوچا کہ آج تو بس خیر ہی ہوگئی، ورنہ اس دن ذاکر صاحب میرے اوپر نہ جانے کتنا ناراض ہو سکتے تھے۔

ایک مرتبہ میں اور کشور دونوں پٹنہ گئے۔ پروفیسر مصرا نے بے حد اس کی کوشش کی کہ ہم لوگوں کو ذاکر صاحب سے ملنے کا وقت مل جائے۔ لیکن اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ ذاکر صاحب اس دن پٹنہ میں تھے ہی نہیں۔ وہ رانچی گئے ہوئے تھے۔ پروفیسر مصرا کے بہت اصرار پر ان کے ملٹری سکریٹری اس بات پر راضی ہو گئے کہ دوسرے دن جو نکہ ذاکر صاحب علی الصبح ناشتے سے پہلے اپنے جہاز سے واپس آ رہے تھے اگر میں اور میری بیوی جہاز کے اڈے پر پہنچ جائیں تو وہ ہمیں ایسی جگہ کھڑا کر دیں گے جہاں سے گورنر صاحب ہم لوگوں کو دیکھ سکیں۔ اگر گورنر صاحب بات کرنا چاہیں تو وہ کر لیں گے۔ ورنہ ان سے ملوانا ان کے لئے ناممکن ہے۔ پروفیسر مصرا نے ہم لوگوں کو زبردستی روک لیا اور دوسرے دن اپنے بیٹے کے ساتھ اپنی کار میں ہوائی جہاز کے اڈے پر پہنچا دیا۔ ملٹری سکریٹری نے اپنے وعدہ کے مطابق ہم لوگوں کو ایسی جگہ کھڑا کر دیا جہاں آ کر ذاکر صاحب کا ہوائی جہاز رکنے والا تھا۔ جیسے ہی جہاز سے اترے ہم لوگوں کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ بولے یہاں کس طرح پہونچے۔ میں نے عرض کیا کہ پروفیسر مصرا کی کار میں آئے ہیں۔ کہنے لگے ان کی کار واپس بھجوا دو اور تم لوگ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر میرے یہاں چلو۔ وہاں چل کر تمہارا سامان اپنے یہاں منگوا لیں گے۔ راج بھون جا کر انہوں نے ہمارے ساتھ ناشتہ کیا۔ پھر برابر باتیں کرتے رہے۔ گفتگو ان کی بہت دلچسپ ہوتی تھی بس یہ کہہ لیجئے کہ اگر کوئی دس منٹ ان کے پاس بیٹھ لے تو دل باغ باغ ہو جائے۔ ان کو باغبانی کا خاص طور پر گلابوں کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنے باغیچہ کی دیکھ بھال وہ خود کرتے تھے اور اپنی نگرانی میں مالیوں سے کام کرواتے تھے لے گئے۔ ہم لوگوں کا سامان پروفیسر مصرا صاحب کے یہاں سے منگوا لیا گیا تھا۔ باغ میں ایک ایک گلاب کے پودے اور ان کے پھولوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ میں یہ کہنے میں کبھی تامل نہیں کرتا ہوں کہ میں تو گاؤں میں رہنے والا گنوار ہوں اور میرے گھر کاشتکاری کا کام ہوتا تھا۔ مجھے اتنی اچھی گفتگو کرنا نہیں آتی ہے۔ لیکن کشور کی پرورش شہر کے اچھے ماحول میں ہوئی اس لئے انہیں باتیں کرنے کا اچھا سلیقہ تھا۔ ایک پھول پر اگر معلوم

ہوا کہ ذاکر صاحب نے اس کا نام قلوپطرہ رکھا تھا۔ کشور بولیں کہ یہ نام اس پھول پر زیب نہیں دیتا، کوئی دوسرا نام اس کے لئے تجویز کریں۔ اب اللہ بہتر جانتا ہے کہ ذاکر صاحب نے ان کا دل رکھنے کے لئے یا ان کی بات سے متاثر ہو کر ان سے اتفاق کر لیا۔ میں جیسے ایک طرف ذاکر صاحب گئے تو ان سے چپکے سے پوچھا کہ اگر میں کشور کا نام قلوپطرہ رکھوں تو کیسا رہے گا۔ کہنے لگے کچھ بھی رکھ دو ٹھیک ہے۔ بس بات میں بناوٹ نہیں ہونی چاہئے۔ میں نے عرض کیا جیسے تو محبت میں ہم انھیں کشی کہتا تھا۔ کہنے لگے تو اسی نام کو برابر جاری رکھو اس لئے کہ اس میں بھی ایک شان ہے۔ اور تمہاری مستقل مزاجی کی ایک دلیل۔

اس دن باتیں کرتے کرتے دوپہر کے کھانے کا وقت آگیا۔ کھانے کے بعد لفٹ سے نیچے آکر ہم لوگوں کو رخصت کیا۔ اور ڈرائیور کو ہدایت کی کہ اگر ایئر انڈیا کی بس جس میں ہم لوگ علی گڑھ واپس آنے والے تھے چھوٹ جائے۔ تو پھر ان لوگوں کو یہیں واپس لے آنا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ وہ ہم لوگوں کے ساتھ باتوں میں اتنے مشغول رہے کہ دوپہر کے کھانے تک گھر کے اندر بھی نہیں گئے۔

ہم تو اس لائق نہ تھے لیکن ذاکر صاحب کی یہ مہربانی تھی کہ گورنر سے نائب صدر اور اس کے بعد صدر ہوئے لیکن ہم لوگوں کو کبھی ان سے ملنے کے لئے وقت مانگنے کا خط نہ لکھنا پڑا۔ جب کچھ دن گذر جاتے تھے تو خود ہی خط لکھتے تھے کہ تم لوگوں سے ملے ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں۔ فلاں دن اور فلاں وقت آکر کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ۔ صرف فرق یہ تھا کہ اگر دوپہر کے کھانے پر بلاتے تو کھانے سے ایک گھنٹہ پہلے کا وقت دیتے۔ اور جس دن شام کے کھانے پر بلاتے تو کھانے کے بعد کا ایک گھنٹہ خالی رکھتے۔ اس لئے کہ ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق دوپہر کے کھانے کے فوراً بعد ان کو آرام کرنا پڑتا تھا اس لئے چاہتے تھے کہ پہلے باتیں کریں اور بعد میں کھانا کھائیں۔ اور اگر شام کے کھانے پر بلاتے تھے تو کھانے کے کافی دیر بعد تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ جب ہم لوگوں سے ان کی ملاقات ہوتی تھی تو ہمیشہ یہ سوال کرتے تھے کہ یونیورسٹی کے کیا حال چال ہیں۔ ایک مرتبہ کی ملاقات میں میں نے ان سے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب کیا آپ کو خیال ہے کہ میں نے ایک مرتبہ یونیورسٹی کے متعلق تفصیل سے لکھ کر آپ کو بھیجا تھا اور آپ کا بہت مختصر جواب میرے پاس آیا کہ کاش کہ تم اپنی توجہ شعبہ کی طرف کرو۔ کہنے لگے کیا تم کو میرا یہ مشورہ برا لگا۔ میں نے کہا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ جو کچھ بھی مجھ سے کہیں گے میرے بھلے کے لئے کہیں گے۔ تو فرمایا پھر تم نے اس بات کا ذکر کیوں کیا۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے اس وجہ سے کہا کہ اب میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اپنے شعبہ کو بنانا بھی بہت مشکل کام ہے۔ اگر میں صرف خود کو بنا سکوں تب بھی میرے جیسے بہت سے بن جائیں گے۔ اس پر انھوں نے افسوس کے ساتھ کہا کہ تم صحیح کہتے ہو۔ ہمارے ملک کی اور خاص طور سے مسلمان قوم کی یہ بدقسمتی ہے کہ یہاں ہر دو آدمی بھی کوئی کام مل کر نہیں کر سکتے۔ بھلا پورے شعبہ کے لوگ تعمیری کام میں کیسے

ساتھ دے سکتے ہیں۔ اس کے بعد دوسری باتیں ہوتی رہیں۔ ان باتوں میں میرے اور کشور کے کام کے متعلق ذکر نکل آیا تو میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب ہم لوگ اور تو سب معاملات میں ہم خیال ہیں لیکن اصول معاشیات اور معاشیاتی مسائل کے متعلق ہم لوگوں کی رائے میں بہت اختلاف رہتا ہے۔ اس پر بولے کہ یہ تو بہت ہی اچھا ہے۔ اس لئے کہ ان باتوں میں اختلاف رائے ہونا ہی تو تمام ترقی کی بنیاد ہے۔

اب مجھ کو یہ بات یاد نہیں کہ اس مرتبہ کی ملاقات میں یا کسی اور ملاقات میں انہوں نے پوچھا کہ آج کل تم کیا کر رہے ہو۔ یہ پوچھا تو قریب قریب ہمیشہ کرتے تھے اور میں اس کا جواب دے دیا کرتا تھا جس سے وہ مطمئن ہو جاتے اور خوشی کا اظہار کرتے۔ اس مرتبہ میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب اب کی مرتبہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی اسکیم کے تحت ایک کام پر مجھے متعین کیا گیا ہے اس کو میں کر رہا ہوں اور اس کا معقول معاوضہ یو۔جی۔سی کی طرف سے مجھے ملے گا۔ اس بات کو سن کر وہ خاموش ہو گئے۔ اتنے عرصے سے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرتے ہوئے اور ان کو جانتے ہوئے مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ جو بات ان کو ناگوار گذرتی تھی اس پر وہ خاموش ہو جایا کرتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب کیا یہ بات آپ کو ناگوار گذری۔ کہنے لگے ہاں ناگوار تو گذری لیکن اگر میں تم کو اس کا سبب بتاؤں گا تو وہ تم کو زیادہ ناگوار گذرے گا۔ میں نے کہا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ جو کچھ بات بھی آپ میرے متعلق کہیں گے میرے لئے مفید ہوگی۔ اور اس پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہنے لگے تو سنو۔ جو کام تم کر رہے ہو وہ طوائفوں کا کام ہے کہ ان کو روپیہ دیا جائے۔ اور ان سے ان کی مرضی کے خلاف یا مطابق کام لیا جائے۔ یہ کام پروفیسر کی شان کے خلاف ہے۔ پروفیسر کا کام تو یہ ہونا چاہیئے کہ جس کام کو کرنے کے لئے اس کے دماغ میں ہیجان ہو اور وہ جس کام کے کرنے کی جستجو کرے اس کو وہی کام کرنا چاہیئے۔ کسی پروفیسر کو بھی کوئی کام روپیہ کی خاطر نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ ڈاکٹر صاحب کی قدریں کتنی اعلیٰ ہیں اور میں کتنا غلط کام کر رہا ہوں۔ میں نے ان سے معافی مانگی۔ واپسی پر میں کام میں جان توڑ کر لگ گیا اور جلد از جلد اس کو ختم کیا۔ اس کو ٹائپ وغیرہ کروایا اور جلد بنوایا۔ اس کے فوراً بعد اس کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے پاس بھیج دیا۔ اور میں نے ان لوگوں کو لکھا کہ یہ کام میں نے مکمل تو اس لئے کیا کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میں کام کرنے کا اہل نہیں ہوں لیکن نہ تو میں اس کا کوئی معاوضہ لوں گا اور نہ اس پر کیا گیا خرچ اور نہ ہی اس کام کو میں اپنا کام سمجھوں گا۔

ڈاکٹر صاحب چھوٹی چھوٹی باتیں اتنی خوشنودی سے سمجھاتے تھے کہ ان کی ہر بات دل میں پیوست ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب میری طبیعت یہ چاہتی ہے کہ ایک رنگین اور چمکدار شیروانی اچکن جیسی میں اپنے لئے بنواؤں اور پہنوں۔ کہنے لگے کیا مضائقہ ہے۔ ایسا جو کام کرنے کی خواہش ہو کرو۔ لباس تو اپنی مرضی کا بنوانا چاہیئے۔ کسی اور کی مرضی

سے کیا غرض ہے۔ اگر کسی اور کو تم پر اس کی وجہ سے ہنسنے کا حق ہے۔ تو تم کو اس پر بے اعتنائی کرنے کا حق ہے۔ لیکن ایک بات عجیب ہے کہ کوئی شخص اپنی عمر سے خوش نہیں ہوتا۔ بچے جوان ہونا چاہتے ہیں۔ کم از کم لگنا چاہتے ہیں۔ جوان بچے لگنا چاہتے ہیں۔ اور بوڑھے جوان لگنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ حالانکہ عمر کے ہر حصے کی اپنی ایک شان ہوتی ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی انسان اس شان کے مطابق رہنا کیوں نہیں چاہتا۔ پھر اس سلسلے میں فرمایا کہ اس قسم کا تضاد انسان کے دماغ میں ہمیشہ رہتا ہے۔ مثال کے طور پر لکھنا دوسروں کو بتانے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اکثر نوجوان ڈائری لکھتے ہیں (۱) (۲) کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار دوسروں سے کرنا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس ڈائری کو چھپا کر رکھتے ہیں تاکہ اس کو کوئی دیکھنے نہ پائے۔ یہ صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کے دماغ میں تضاد ہوتا ہے۔ اس قسم کا تضاد قریب قریب ہر شخص کو اس زمانہ میں رہتا ہے۔

ذاکر صاحب ایک مرتبہ ایک صاحب کے متعلق جن کی وہ بہت عزت کرتے تھے، اور دراصل وہ عزت کرنے کے لائق بھی ہیں اور بعد میں ایک بہت معزز عہدہ پر پہنچے (جن کا نام میں لکھنا نہیں چاہتا) ان کی اپنی محبت کی بنا پر دوسری شادی کا ذکر کر رہے تھے۔ کہانی تو یہ بڑی لمبی چوڑی ہے اس لئے کہ اس میں ایک داستان سے دوسری اور دوسری سے تیسری ملی ہوئی ہے۔ لیکن فی الوقت میں صرف اتنا حصہ عرض کر رہا ہوں جو اس سلسلہ میں بتانا ضروری ہے۔ وہ صاحب غیر مسلم ہیں۔ جن کے یہاں شاید دوسری شادی جائز بھی نہیں ہے۔ ذاکر صاحب نے ان کی اور ان کی محبوبہ دونوں کی بہت اچھی صفات بیان کیں۔ اتفاق سے میں نے ذاکر صاحب سے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ محبت کی شادیاں عموماً ناکامیاب ہوتی ہیں۔ کہنے لگے اس کی وجہ تو صاف ہے۔ محبت کرتے وقت لڑکا لڑکی کو دیوی سمجھتا ہے اور لڑکی لڑکے کو دیوتا۔ اور جب بھی ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ایک دوسرے کے سامنے اپنے کو اسی رول میں ظاہر کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں نہ لڑکی دیوی ہوتی ہے اور نہ لڑکا دیوتا۔ وہ تو دونوں انسان ہوتے ہیں اور دونوں میں کچھ نہ کچھ کمیاں اور کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ کسی میں کم اور کسی میں زیادہ۔ جب شادی ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں تو لڑکی کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا محبوب تو انسان ہے۔ اور لڑکے کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی محبوبہ بھی انسان ہے۔ ایک دوسرے کی کمیاں دونوں کے سامنے آنے لگتی ہیں۔ اور ان کو احساس ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے رہے۔ حالانکہ دراصل دھوکہ کوئی کسی کو نہ دیتا تھا۔ بس اس کو غلط طریقے سے سمجھا تھا۔ جب ان دونوں کی کمیاں اور برائیاں ایک دوسرے پر ظاہر ہوتی ہیں تو دونوں کو ایک دوسرے سے دھکا لگتا ہے۔ اگر وہ یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ دراصل دونوں انسان ہیں اور دونوں میں خامیاں ہیں تو غلط فہمی بڑھنے کی گنجائش ختم ہو جائے اور ایک دوسرے سے معاملہ کرنے کی کوشش کریں۔ ظلم تو یہی ہے کہ اکثر سینما کی پکچریں اس جگہ ختم ہو جاتی ہیں جہاں یا تو ہیرو اور ہیروئن کی شادی ہو جاتی ہے۔ یا جہاں ایک دونوں ایک دوسرے کے لئے جان دے

دیتے ہیں۔ تو اس سے لوگوں میں اور بھی زیادہ غلط فہمیاں بڑھتی ہیں۔ اور ہمیشہ وہ زندگی کو غلط سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوشش یہ نہیں کرتے بلکہ یہ خیالات اور یہ آئیڈیں ان کے ذہنوں میں اس قدر مستحکم طور سے جمع ہو چکے ہوتے ہیں کہ غالباً وہ دوسری باتیں سمجھنے کی اہمیت ہی نہیں رکھتے۔

ذاکر صاحب کے اندر ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ ہر استاد کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور کوئی بھی جو استاد کی عزت نہ کرے یا اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرے اس کو پسند نہ کرتے تھے۔ ایک زمانہ کا ذکر ہے کہ بدرالدین طیب جی صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر آئے۔ وہ استادوں سے بہت سختی اور طلباء سے بہت نرمی کا برتاؤ کرتے تھے۔ انہوں نے یونیورسٹی کے کئی معزز اور سینئر اساتذہ کو خاصی سختی سے بات کر کے نکال دیا۔ ایک مرتبہ انہوں نے اطلاع دی کہ وہ شعبہ معاشیات میں آنا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ اپنی کتابیں یا جو بھی مطبوعات ہوں ان کی کاپیاں رکھیں تاکہ ان کو جمع کر کے وائس چانسلر صاحب کو پیش کیا جا سکے۔ میں نے شعبہ معاشیات کے صدر کی حیثیت سے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی مطبوعات ان کے لئے پیش کیں تو انہوں نے بہت تیزی سے جواب دیا کہ ان چیزوں کو ان کو کیوں پیش کیا جا رہا ہے۔ مجھے بات تو عجیب و غریب معلوم ہوئی لیکن میرے اندر قوت برداشت کا مادہ بہت ہے تو میں خاموش رہ گیا۔ یہ بات میں نے خود کبھی ذاکر صاحب سے ذکر نہ کی۔ لیکن کسی نہ کسی طرح ان کو معلوم ہو گئی۔

حسن اتفاق سے بدرالدین طیب جی صاحب نے آتے ہی نوٹس دے دیا تھا کہ کوئی صدر شعبہ بغیر وائس چانسلر سے اجازت لئے ہوئے باہر نہ جا سکتا تھا۔ اور اجازت لیتے وقت اس کو یہ بات بتانے کی ضرورت بھی تھی کہ وہ اس کی تفصیل سے وجہ بتائے۔ حقیقی بات یہ ہے کہ کام وہ اپنے آفس میں بیٹھ کر اتنی مستعدی سے کرتے تھے کہ جس وقت ان کے پاس کوئی درخواست جاتی تھی اس کا جواب فوراً ہی آجاتا تھا۔ اسی دوران میں ذاکر صاحب نے ایک مرتبہ مجھ کو اور میری بیوی کو کھانے پر مدعو کیا۔ تو میں نے وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں باہر جانے کی اجازت کی درخواست دی اور ساتھ ہی ذاکر صاحب کا خط منسلک کر دیا۔ تاکہ اس کی وجہ بھی ان کو معلوم ہو جائے۔ یہ میں نے اس لئے نہیں کیا تھا کہ اس میں کوئی تعلی منظور تھی بلکہ اس لئے کیا تھا کہ وائس چانسلر صاحب کا حکم یہ تھا کہ اگر کوئی صدر شعبہ باہر جا رہا ہو تو اس کو اس سے باہر جانے کی وجہ کا ثبوت دینا بھی لازم ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ذاکر صاحب کے خط میں میرے باہر جانے کی وجہ ہی کا اظہار تھا جس سے اس کا ثبوت ملتا تھا۔

جیسے ہی میری درخواست وائس چانسلر صاحب کے پاس پہنچی تو انہوں نے فوراً چپراسی کو بھیج کر مجھے بلایا۔ میں کلاس میں لکچر دینے کے لئے جا رہا تھا۔ میں نے کہلوا دیا کہ اس وقت تو میں لکچر دینے جا رہا ہوں۔ اس کے فوراً بعد وائس چانسلر صاحب کے پاس حاضر ہوں گا۔ وائس چانسلر صاحب کو شاید یہ بات ناگوار گذری۔ اس لئے کہ میرے پہنچتے ہی سب سے پہلے بہت

پوچھا کہ آپ میری اطلاع ملتے ہی فوراً کیوں نہ آئے۔ کیا میرے پاس اتنا وقت ہے کہ بیٹھے بیٹھے آپ کا انتظار کرتا رہوں۔ میں نے
عرض کیا کہ بچوں کو تعلیم دینا میرا اولین فرض ہے۔ جب میں اس میں مشغول ہوتا ہوں تو کسی اور کام کو نہیں کر سکتا۔ طوعاً او کرہاً میری
ان کو سن لینا پڑی۔ اس کے بعد مجھ سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ میری درخواست نکال کر دیکھا اور پھر مجھ سے پوچھا کہ
آپ کے ذاکر صاحب سے اتنے تعلقات ہیں کہ انہوں نے آپ کو کھانے پر بلایا ہے۔ میں نے کہا کہ صاحب وہ تو ان
کی شفقت ہے کہ اپنے چھوٹوں سے ایسا سلوک کرتے ہیں ورنہ وہ کہاں اور میں کہاں۔ کہنے لگے بہرحال آپ ان کے ہاں
کھانے پر مدعو ہیں۔ اور بات کرنے کا کافی وقت ملے گا تو ان سے میری طرف سے کہہ دیجئے گا کہ میں علی گڑھ کے پاس شدہ
طلباء کو ملازمت دلوانے کی کوشش کا کام بہت انہماک سے کر رہا ہوں۔ ان سے کہنا کہ چونکہ وہ اس یونیورسٹی کے پرانے طالب علم
ہیں۔ اور اس کے بعد وائس چانسلر رہ چکے ہیں تو وہ بھی میری اس کام میں مدد کریں۔ میں نے کہا ضرور عرض کروں گا۔ اس کے
بعد مجھے باہر جانے کی اجازت دی۔ اور میں کشور کے ساتھ ذاکر صاحب سے ملنے دہلی چلا گیا۔ جب میں ان سے ملا تو حسب عادت
انہوں نے سب سے پہلے علی گڑھ یونیورسٹی کے حالات پوچھے۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب پہلے ایک بات عرض کر دوں۔ کہنے
لگے کہو۔ میں نے عرض کیا کہ ہمارے وائس چانسلر صاحب علی گڑھ کے پاس شدہ طلباء کو ملازمت دلوانے میں بہت کوشاں
ہیں اور ان کی خواہش یہ ہے کہ آپ بھی چونکہ یونیورسٹی کے پرانے طالب علم اور وائس چانسلر رہ چکے ہیں، اس کام میں ان کی
مدد کریں۔ تو کہنے لگے اچھا تم پیغامبر ہو تو میرا بھی ایک پیغام ان کو پہنچا دینا۔ ان سے کہنا کہ ذاکر صاحب نے آپ کی
درخواست کے جواب میں یہ کہا ہے کہ آپ اپنے معیار کے ساتھیوں سے مدد چاہیں۔ میں نے بہت تعجب سے عرض کیا کہ
ڈاکٹر صاحب میں نے دیکھا ہے کہ آپ ہر ایک شخص کی عزت کرتے ہیں چاہے وہ چپراسی ہی کیوں نہ ہو۔ کافی ناراضگی
کے لہجہ میں کہنے لگے وہ بات تو اپنی جگہ ہے لیکن وہ شخص جو استادوں کی اور ان کے کام کی عزت نہ کرے تو نہ تو وہ
یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونے کے قابل ہے اور نہ ہی قابل احترام ہے۔ اس دن انہوں نے مجھ سے پوچھا کیا یہ صحیح ہے کہ
اس شخص نے تمہاری کتابیں پھینک کر واپس کر دیں اور لینے سے انکار کیا۔ میں خاموش ہو گیا۔ کہنے لگے تمہاری خاموشی میرے
سوال کا جواب ہے۔ کیا ایسا شخص جو معاشیات کے ایسے استاد کو جس کی کتابوں پر دنیا کے بہترین رسائل میں اتنی
زیادہ تعریف کی گئی ہو اور ماہرین معاشیات نے ان کی تعریف کی ہو اس کو تم اپنا وائس چانسلر ماننے کے لئے تیار ہو۔
میں بڑے سناٹے میں رہ گیا کہ یہ سب باتیں ان کو کیسے معلوم ہو گئیں جب کہ میں نے کبھی ذکر بھی نہ کیا تھا اور نہ مناسب
سمجھتا تھا اس لئے کہ میں اپنی حقیقت اور کمیوں سے ہمیشہ واقف رہا ہوں۔ اس کے بعد کھانے پر بہت خوشگوار باتیں
ہوتی رہیں لیکن رخصت ہوتے وقت ذاکر صاحب نے مجھ سے تاکیداً کہہ دیا کہ میرا پیغام اس شخص کو جوں کا توں پہنچا

دینا۔ میں نے علی گڑھ آ کر ذاکر صاحب کے حکم کے مطابق ان کی بات بعینہٖ بدرالدین طیب جی صاحب سے کہہ دی۔ یقیناً وہ دل ہی دل میں بہت غصہ ہوئے ہوں گے۔ لیکن قہرِ درویش بر جانِ درویش۔ اگر کوئی اور ایسی بات کہتا تو شاید وہ برس پڑتے لیکن ذاکر صاحب کے بھجوائے ہوئے پیغام پر وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔

ذاکر صاحب جو میرے جیسے کم مایہ انسانوں کی ہمت افزائی کرتے تھے وہ یقیناً ان کی بڑائی کی دلیل ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ذاکر صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے تذکرہ کیا کہ ترقی کے اصول اور غیر ترقی یافتہ ممالک میں بینک کے اوپر کوئی تیار خاکہ بنا کر کوئی کورس طلبا کو دیا جائے تو یقیناً بہت مفید ہوگا۔ میں تو ہمیشہ اپنا لکچر دینے کے لئے نوٹ بناتا ہی تھا جس میں اپنی تقریروں کے خاص نکات لکھتا اور مختلف کتابوں کے حوالے اور صفحات اہم سمجھتا ان کو درج کیا کرتا تھا۔ تو میں نے محنت کر کے ایک کورس پچھڑے ہوئے ممالک کے لئے تیار کیا۔ خاکہ اس کا یقیناً لمبا ہو گیا لیکن ذہن میں اسکیم یہ تھی کہ دہ کورس اگر محنت سے پڑھایا جائے تو چھ مہینہ میں یقیناً ختم کیا جا سکتا ہے۔ میں نے چونکہ اس قسم کے لکچر پہلی مرتبہ تیار کئے تھے لہٰذا ان کے نکات، پڑھنے والی کتابیں اور رسالہ جات کے اسباق اور صفحات کے تذکرے کا نوٹ بنا کر ایک کاپی ان کی اطلاع کے لئے ذاکر صاحب کے پاس بھی اور ان سے تصحیح اور مشورہ کی درخواست کی۔ انہوں نے جواب میں ایک خط ارسال کیا جس میں لکھا کہ تمہارے لکچر بہت اہم معلوم ہوتے ہیں۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے متعلق میں کوئی مشورہ تو نہیں دے سکتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے ان طلبا پر حسد آتا ہے جن کو تمہارے ان لکچروں کو سننے کا موقع ملے گا۔ اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ انہوں نے لفظ حسد ہی کو استعمال کیا ہے۔ اس کی جگہ بہت تعریف کرنے کے لئے رشک کا لفظ بھی استعمال کر سکتے تھے۔ اب یہ سوچئے کہ کہاں ذاکر صاحب جیسا جید عالم اور کہاں میرے جیسا کم اہل استاد۔ ان کے یہ الفاظ اگر ہمت افزائی کے لئے نہیں تو کیا میری تعریف کے لئے ہو سکتے تھے؟ میں اپنے کاغذات اور خطوط کو احتیاط سے رکھنے میں بہت ہی غیر محتاط ہوں، لیکن یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ ان کا یہ خط اور صرف یہی خط میرے پاس محفوظ رہ گیا۔ جب پروفیسر مجیب صاحب شیخ الجامعہ ذاکر صاحب کے اوپر ایک کتاب تیار کر رہے تھے تو انہوں نے ملک کے تمام لوگوں سے درخواست کی تھی کہ اگر ذاکر صاحب کے خطوط کسی کے پاس محفوظ ہوں تو وہ میرے پاس بذریعہ رجسٹری بھیج دیں۔ ان کے فوٹو اسٹیٹ کروا کے اصل خطوط ہم واپس کر دیں گے اور اس کے لئے ہم احسان مند ہوں گے۔ ان کی یہ اپیل میری نظر سے گزری۔ لیکن میں نے احساس شرمندگی سے اس خط کو ان کے پاس نہ بھیجا۔ اب چونکہ میں نے اس کی پوری تفصیل سے اس مضمون میں اپنے قارئین کو آگاہ کر دیا ہے تو اس کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی آپ کے ملاحظہ کے لئے پیش کر رہا ہوں:

عکس مکتوب



VICE-PRESIDENT
INDIA
NEW DELHI

No. VP(PS)1644

July 25, 1963.

My dear Shabbir Saheb,

Thank you for your letter and for the synopsis of your proposed course on Problems of Economic Growth and Planning. I feel jealous of the students who will have the privilege of hearing you. We had rather poor stuff in our day at Aligarh! I can hardly suggest any improvements. Your design is very comprehensive and includes much of which I am ignorant. I hope you will write out the lectures for use by a larger public.

With all good wishes for both of you and with love for your child,

Yours sincerely,

Zakir Husain

Mohd. Shabbir Khan Saheb,
Head of the Department of Economics,
Muslim University,
Aligarh.

ذاکر صاحب کو ملک کے عام لوگوں سے عموماً اور مسلمانوں سے خصوصاً بہت لگاؤ تھا۔ میں نے ان کو امریکہ کے چند دن کے قیام میں دیکھا ہے کہ وہ فجر کی نماز کے بعد بلاناغہ ملک کے سب لوگوں اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے رو رو کر دعائیں مانگتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان کی حیثیت آئندہ چل کر وہی ہوگی جس کو وہ خود کوشش کر کے بنائیں گے۔ وہ کسی کے عقلمند ہونے پر اتنا اعتماد نہ کرتے تھے جتنا اس کے محنتی ہونے پر۔ اور میں نے ان کو علامہ اقبال کا یہ شعر اکثر و بیشتر پڑھتے سنا ہے کہ :۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی   یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ان کی ہدایت ہمیشہ یہی ہوا کرتی تھی کہ بغیر صلہ کا احساس لئے ہوئے اپنی محنت کئے جاؤ۔ اور اپنی محنت اور کام پر اتنا یقین رکھو کہ اگر کسی موقع پر تم کو کسی معاملہ میں ناکامی ہو تو تمہیں اس کا احساس نہ ہو اور جس نے تمہارے آگے بڑھنے میں مخالفت کی ہے اس کو کم از کم ایک رات نیند نہ آئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد جب ان کو یونیورسٹی کے کانووکیشن میں ایڈریس دینے کے لئے بلایا گیا تھا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ طلبا سے بھی انہوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ چاپلوسی سے بڑے بڑے [illegible] قابو میں آجاتے ہیں۔ تم کہاں کے دانا ہو تمہارا کیا تو اگر میں ذرا سی تعریف کر دوں تو تم سب کے سب خوش ہو گے اور خوب خوب تالیاں تعریف میں بجاؤ گے۔ میں مثال کے طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے اوپر نہ صرف اس ملک کا بلکہ پوری دنیا کی قسمت کا انحصار ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تم سے پہلے بہت سے طالب علم ہوئے جن سے یہی کہا جا سکتا تھا اور یقیناً لوگ کہتے رہے لیکن ان کی امیدیں کامیاب نہ ہوئیں۔ میں تم کو صرف یہ ہدایت کروں گا کہ بغیر محنت اور مستحکم یقین کے تم کیا دنیا میں کوئی بھی شخص ایسا کام نہیں کر سکتا جو قابل تعریف ہو۔ ہو سکتا ہے میرا یہ کہنا تم کو ناگوار گذرے۔ لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ میں اس کے علاوہ تم سے اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔

جس زمانہ میں ذاکر صاحب ملک کے صدر تھے مجھ کو اور کشور کو کھانے پر بلایا کرتے۔ یہ ان کی بڑائی تھی ورنہ اتنا بڑا اور اتنا مشغول انسان کیسے اتنا وقت نکال سکتا ہے کہ وہ اس قسم کے کاموں میں وقت ضائع کر سکے۔ ایک مرتبہ گفتگو میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ عجیب لوگ ہیں کہ ان کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ آج کل میرے پاس وقت کی کمی رہتی ہے اس لئے کہ اکثر اوقات باہر کے ممالک کے بڑے بڑے لیڈر آتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ جو لوگ مجھ سے مل سکتے ہیں ان کو ملنے کا موقع دوں چاہے وہ دو چار منٹ ہی کے لئے کیوں نہ ہو۔ پھر بھی بعض لوگ ایسی حرکت کرتے ہیں کہ میرے پروگرام کو کسی طرح معلوم کر لیتے ہیں۔ اور جب بھی میں اپنی بچی سے ملنے کے لئے (جو خورشید عالم خاں صاحب کی بیگم صاحبہ کی طرف اشارہ تھا) جاتا ہوں وہاں وہ مجھ سے ملنے

کے لئے موجود رہتے ہیں۔ ان کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ایک باپ اپنی بیٹی سے ملنا چاہے تو اس کا موقع تو اس کو دینا چاہئے لیکن کیا کریں، بعض لوگ اپنی عادت سے مجبور ہوتے ہیں اور ان کو سوائے اپنے کام کے کسی کے متعلق کوئی احساس نہیں ہوتا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، ذاکر صاحب اپنی گفتگو میں بہت خوشگوار باتیں کیا کرتے تھے۔ اور ان سے چند منٹ کی باتوں ہی سے دل خوش ہو جاتا تھا۔ مگر ایک ملاقات میں ذاکر صاحب نے تھوڑے تھوڑے وقفہ پر داغ کا یہ شعر کئی مرتبہ پڑھا کہ:

جو گذرتے ہیں داغ پر صدمے   آپ بندہ نواز کیا جانیں

میں نے وہاں سے نکلتے ہی اپنی بیوی سے کہا کہ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ ذاکر صاحب ہماری بدقسمتی سے زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں گے، اس لئے کہ ایسا انسان جو ہمیشہ انتہائی خوشگوار باتیں کرتا ہو جب ایسی ناامیدی کی باتیں کرنے لگے تو اس کی زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کی امید کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ میری بیوی نے میری اس بدقسمت رائے سے اتفاق کیا اور ہم دونوں ان کی صحت اور اپنے سروں پر ان کا سایہ رہنے کی دعا کرتے رہے۔ لیکن موت کا وقت جب آتا ہے تو دعائیں بھی اثر نہیں کرتیں۔ بہت جلد ہی ذاکر صاحب اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ذاکر صاحب کو میں نے اس موقع کے علاوہ دو مرتبہ اور بھی مغموم دیکھا۔ ایک مرتبہ تو سفر کے دوران جب ان کو معلوم ہوا کہ ڈبلیو۔ ڈبلیو لینیف کو معاشیات میں نوبل پرائز ملا ہے۔ تو وہ مجھ سے کہنے لگے کہ جب میں جرمنی میں علم معاشیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا تو یہ صاحب بھی میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ مجھ کو بہت اچھا اور ان کو بہت کم اہلیت کا طالب علم سمجھا جاتا تھا۔ اور آج یہ دن ہے کہ دنیائے علم میں میری معاشیات میں کوئی پوزیشن نہیں اور ان صاحب کو معاشیات ہی میں نوبل پرائز ملا۔ تو میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب آپ نے اپنے کام میں جو ترقی کی ہے اور تعلیم و طلبا کی تربیت میں جو کام کیا ہے وہ بہت نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ کیا وہ پائے کا نہیں ؟ یا اس کو دنیائے علم میں نہیں مانا گیا۔؟ جب آپ نے علم معاشیات میں کام کرنے کو اپنا مشن ہی نہ بنایا تو آپ کا مقابلہ کسی ایسے آدمی سے جس نے صرف معاشیات میں کام کیا ہو کیسے کیا جا سکتا ہے ؟ اس لئے کہ میرے خیال میں آپ کے کام اور ان کے کام میں ایک دوسرے سے تقابل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک دوسرے سے بالکل مختلف کام ہیں۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ پتا نہیں میری بات کا ان کے اوپر وہ اثر ہوا یا نہیں جس کی مجھے خواہش تھی اور جو میں حقیقت میں صحیح سمجھتا تھا۔

دوسرے موقعہ پر میں نے ان کو مغموم جب پایا جب میں ایک مرتبہ پٹنہ میں راج بھون میں ان سے ملا۔

اس زمانہ میں میری بیوی کشور انگلستان میں تعلیم پا رہی تھیں اور میرے ساتھ رہتیں۔ کہنے لگے اگر تم میری اس بات کو ذاتی سمجھتے ہو تو تمہیں جواب دینے کی ضرورت نہیں ورنہ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے کشور سے کیوں شادی کی جبکہ عادتوں میں وہ تم سے بالکل مختلف ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ میرے بزرگ ہیں اور آپ سے میری کوئی بات جو چھوٹی ہو یا بڑی پوشیدہ نہیں ہے اور نہ ہی رکھنا چاہوں گا۔ بات در اصل یہ ہے کہ کشور معاشیات میں بہت اچھی ہیں۔ اس سے تو غالباً آپ بھی اتفاق رائے رکھتے ہوں گے۔ اور دوسری اس سے زیادہ اہم بات یہ کہ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ بہت ہی مغموم انداز میں کہنے لگے۔ مجھ سے تو تم بہت خوش قسمت ہو کہ جس چیز سے تم نے محبت کی تم نے حاصل کر لی اور میں اتنا بد قسمت ہوں کہ جس چیز سے بھی دل لگایا وہ حاصل نہ ہوا تم جانتے ہو میں نے جامعہ ملیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے دل لگایا۔ اور دونوں میں کوئی کامیابی حاصل کرنے میں ناکام رہا پھر اسی سانس میں کہا کہ جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی میں صرف فرق اتنا ہے کہ جامعہ ملیہ ایک مردہ ادارہ ہے اور مسلم یونیورسٹی ایک مرتا ہوا اور سسکتا ہوا ادارہ ہے۔ جو کسی وقت مردہ ہو جائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب یہ تو دل کی وسعت کا سوال ہے۔ میں نے تو ایک بہت چھوٹی چیز کو چاہا اور اس کو حاصل کر لیا۔ آپ ایک نہیں دس خوبصورت، نوجوان اور علمی قابلیت رکھنے والی لڑکیوں سے اپنی جوانی کے عالم میں محبت کرتے تو آپ کو یہ طے کرنا مشکل ہوتا کہ آپ کون سی کو اختیار کریں۔

— لیکن آپ نے تو بڑے بڑے اداروں سے دل لگایا۔ اور ان کا تعمیری کام اتنا مشکل ہے کہ ان کی تھوڑی کامیابی بھی آپ کی مکمل کامیابی کی دلیل ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید وہ اس جواب سے مطمئن ہو جائیں گے۔ لیکن انہوں نے اس معاملہ میں مجھ سے اتفاق رائے نہ کیا۔ اور کہنے لگے ایسی عورت کو جو بالکل مختلف خیالات اور مختلف عادتوں کی ہو پالینا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ تم کو اس بات کا احساس نہیں ہے کہ تم نے اس معاملہ میں کتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ پھر انہوں نے اسی بات کو دہرایا جس کو وہ پہلے کہہ چکے تھے کہ مجھے یقین ہے کہ تم دونوں معاشیات کے علم میں بہت اضافہ کرو گے جو میری خوش قسمتی کا باعث ہوگا۔

ہر چند کہ مضمون لمبا ہو گیا ہے۔ لیکن قارئین سے اس کی طوالت کی معافی چاہتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو بات ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے جامعہ ملیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں کہی تھی، وہ غالباً بالکل بے معنی نہیں تھی۔ ہر چند کہ مجھے یقین ہے کہ جو بات انہوں نے مجھ سے میرے معاملہ میں کی تھی وہ میرے دل بہلانے کی بات تھی۔ میں جامعہ ملیہ کے متعلق تو کچھ کہہ نہیں سکتا اس لئے کہ مجھے اس کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جہاں میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد اپنی عمر کا بیشتر حصہ گذارا ہے۔ کی تھوڑی بہت معلومات ہے یہاں کے حالات
جب میں غور کرتا ہوں تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ آخر ذاکر صاحب جیسے دور رس انسان نے یہ بات کیوں کہی۔ کیا وہ بالکل
بے معنی تھی۔ ایسا ہونا تو غالباً مشکل ہے کہ وہ ایسی بات کرتے جو حقیقت سے بالکل دور ہوتی۔ یہ خیال میرے ذہن میں
بار بار اس لئے آتا ہے کہ ذاکر صاحب جس زمانہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے بار بار اس بات کو
دہراتے تھے کہ آپ لوگ صرف اوپر والے لوگوں کی طرف نہ دیکھیں جن کو میں نے پروفیسر اور صدر شعبہ بنایا ہے۔ وہ تو
عارضی لوگ ہیں اور کچھ عرصہ کے بعد ریٹائر ہو جائیں گے۔ آپ تو زیادہ تر نوجوانوں کی طرف توجہ کریں جو آگے چل کر مختلف
شعبہ جات کی باگ ڈور سنبھالیں گے۔ وہ نوجوان اشخاص کی زیادہ سے زیادہ ہمت افزائی کرتے تھے۔ ان کو باہر جانے
کے لئے وظائف دلواتے تھے۔ ان سے کام کرنے کی تاکید کرتے تھے۔ اور ان سے وعدہ لیتے تھے کہ وہ ————
———— اپنے اپنے شعبوں کو معیاری شعبہ بنائیں گے۔ اور یقیناً بہت سے لوگوں نے جو اس
وقت نوجوان یا جوان تھے ان سے ایسے وعدے ضرور کیئے ہوں گے جس طرح کا میں نے کیا تھا اور جس کی وجہ سے
میں نے باہر کے بڑے سے بڑے عہدہ کو ٹھکرا دیا مگر ان میں سے زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو یہاں سے نکل کر
چلے گئے اور بڑے آدمی بن گئے۔ بہت عرصہ تک تو میں یہ سمجھتا رہا کہ میں نے بڑا زبردست کام کیا کہ ذاکر صاحب
سے جو وعدہ کیا تھا اس کو اپنی حیثیت کے مطابق نبھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اور دوسرے لوگوں کے متعلق خیال
کرتا تھا کہ انہوں نے اس معاملہ میں ذاکر صاحب سے وعدہ خلافی کی۔ میرے ذہن میں یہ آیا کرتا تھا کہ شاید انہوں نے اچھا
نہیں کیا۔ لیکن اب سوچتا ہوں کہ ذاکر صاحب نے مجھ سے یا کسی اور سے یہ وعدہ تو نہیں لیا ہوگا کہ علی گڑھ میں ہی رہنا
اور اپنے اپنے شعبہ کی تخریب کا کام کرتے رہنا۔ اب دعا کرتا ہوں کہ کوئی خدا کا بندہ ایسا ہو جو اس بگڑے ہوئے
کام کو بنانے کی کوشش کرے تو شاید ذاکر صاحب کی روح کو اس سے آرام ملے۔ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے زیادہ
امید تو نظر نہیں آتی لیکن دنیا میں کوئی کام ناممکن بھی نہیں ہوتا۔

میں یقین کے ساتھ تو کچھ نہیں کہہ سکتا ———— لیکن اپنے ریٹائر ہونے
سے پہلے میرے علم میں دو واقعات ایسے آئے جن سے سخت تکلیف ہوئی اور خیال پیدا ہوا کہ وہ ذاکر صاحب کے ان خیالات
کی تصدیق کرتے ہیں جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حالات کی بنا پر ان کے دل میں پیدا ہوئے تھے اور جو ان کی تکلیف کا باعث تھے۔

پہلی بات تو یہ ہوئی کہ ایک خلفشار کے زمانہ میں جب کہ وائس چانسلر صاحب حالات سے کافی پریشان
ہو رہے تھے ، پرو وائس چانسلر صاحب کو کچھ مجبوریوں کی بنا پر علی گڑھ سے تھوڑے عرصہ کی چھٹی لے کر باہر جانا پڑا۔

ہر چند کہ میں ہارٹ اٹیک کے بعد اسپتال سے واپس آیا تھا اور وائس چانسلر صاحب اور میرے درمیان یہ پہلے ہی معاہدہ ہو چکا تھا کہ میں ان تمام کاموں میں مدد دوں گا جو یونیورسٹی کی ترقی کے لئے کئے جائیں گے لیکن میں ان کا پرو وائس چانسلر بننے کے لئے تیار نہ ہوں گا۔ لیکن چند ایک مجبوریوں کی بنا پر وائس چانسلر صاحب کو مجھے کوئی دو مہینہ کے لئے پرو وائس بنانا پڑا۔ اور میں ان کی مجبوریاں سن کے اس سے انکار نہ کر سکا۔ اسی دوران میں ایک مرتبہ سائنس کے شعبہ جات کی فیکلٹی کی اعلیٰ تعلیم اور تحقیقات کی کمیٹی کی صدارت کر رہا تھا، تو اس میں ایک کیس ایسا آیا جس میں ایک شعبہ کے کسی ریسرچ اسکالر کے تحقیقی مقالہ کی ایک ملک کے باہر کے ممتحن نے بہت سخت الفاظ میں تنقید کی تھی۔ رپورٹ بہت لمبی تھی اور اس میں بہت سی غلطیوں کے متعلق بھی بیان کیا گیا تھا اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کس طرح ان تمام چیزوں کی تصحیح کی جا سکتی ہے۔ باہر کے ملک کے پروفیسر نے یہ بھی لکھا تھا کہ میں اس سے قبل مسلم یونیورسٹی کے کئی ریسرچ اسکالرس کے کئی تھیسس دیکھ چکا ہوں جن کا معیار بہت ہی بلند ہوتا تھا۔ اور اب میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تحقیق کا معیار اتنا کیسے گر گیا۔ میری رائے یہ ہے کہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کو خاص طور پر تحقیق کرنی چاہئے کہ تحقیق کے معیار کے اتنا گرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ مزید یہ لکھا تھا کہ میں یہ سفارش کرتا ہوں کہ اس تھیسس کے بارے میں میں نے جو بہت سی رائیں دی ہیں، ان کی روشنی میں دوبارہ درست کیا جائے۔ اور اس کے بعد چونکہ میں کافی وقت تک بہت مشغول رہوں گا اور اس تھیسس کو دوبارہ جلدی نہ دیکھ سکوں گا اسلئے میری رائے یہ ہے کہ اس مقالہ کو درست کرنے کے بعد ہندوستان کے جو دوسرے دو ممتحن ہیں ان کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ وہ دیکھ لیں کہ جب اس کی ساری غلطیاں درست ہو جائیں تو ریسرچ اسکالر کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دے دی جائے۔ قارئین میں سے جو لوگ یہاں کے حالات سے واقف نہ ہوں ان کو میں یہ بتا دوں کہ اس قسم کی کمیٹی میں پوری فیکلٹی کے تمام شعبہ جات کے صدر ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ فیکلٹی کے متعدد ایسے اشخاص جن کو تحقیقات کے کاموں میں نمایاں سمجھا جاتا ہے کمیٹی میں الیکشن کر کے بھیجا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کا وائس چانسلر یا ان کی عدم موجودگی میں پرو وائس چانسلر صدر ہوتا ہے چنانچہ کمیٹی کی بڑی اہمیت سمجھی جاتی ہے اور اس لئے اس کی سفارش کبھی آگے چل کے کسی بھی جگہ رد نہیں کی جاتی۔ میری حیرت کی حد نہ رہی جب اس رپورٹ کو سن لینے کے بعد سائنس کے ہر شعبہ کے صدر، ڈین اور دوسرے نمائندے سب لوگوں نے سفارش کی کہ ریسرچ اسکالر کو فوراً ڈگری دے دی جائے اور ان تمام لغویات میں زیادہ وقت صرف نہ کیا جائے کہ وہ تمام غلطیاں اور کمزوریاں دور کرتا پھرے۔ اس لئے کہ ملک کے باہر کے ممتحن نے یہ تھوڑے ہی لکھا ہے کہ اس مقالہ کو اس کی نمایاں غلطیاں درست کرنے کے بعد میرے پاس بھی دوسری بار دیکھنے کو بھیجا جائے۔ اور جہاں تک ہندوستان کے دو ممتحنوں کا ذکر ہے تو وہ تو ڈگری دینے کی سفارش

پہلے ہی کر چکے ہیں۔ یہ بات آپ لوگوں کے ملحوظ خاطر رہے کہ ہندوستان کے جو دو ممتحن ہوتے ہیں ان میں سے ایک تو شعبہ ہی کا ہوتا ہے جس کی نگرانی میں تھیسس لکھا جاتا ہے۔ میں نے حاضرین جلسہ سے بہت معذرت کے ساتھ درخواست کی کہ ہر چند کہ میں اس وقت اس میٹنگ کی صدارت کر رہا ہوں لیکن آپ لوگوں کی طرح میں بھی مسلم یونیورسٹی کا ایک استاد ہوں۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ یونیورسٹی کے قوانین میں لکھا ہے کہ جب تک ڈگری دینے کا تینوں ممتحن سفارش نہ کریں اس وقت تک ڈگری نہیں دی جا سکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ کیا آپ لوگوں کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ یہ بات انتہائی شرمناک ہے کہ غیر ملک کے ممتحن نے جو پہلے بھی اس یونیورسٹی کے ایسے کاموں سے متعلق رہ چکا ہے اور جس نے یہاں کے پہلے کے مقالات کی بہت تعریف بھی کی ہے اس مقالے کی کڑی تنقید کرتے ہوئے ثبت سی تجویزیں کیوں پیش کیں اور کیوں لکھا ہے کہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کو اس بات کی تحقیق خاص طور سے کرنا چاہئے کہ مسلم یونیورسٹی میں تحقیق کا معیار اتنا زیادہ کیوں گر گیا ہے۔

میری ان باتوں کے سننے کے بعد بھی سائنس کے کسی صدر شعبہ، دوسرے نمائندہ اور ڈین نے میری بات نہ مانی اور اپنی ضد پر اڑے رہے کہ اس سے تو ریسرچ اسکالر کے وقت ضائع کرنے کے علاوہ اور کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس پر آخر میں میں نے انتہائی صفائی سے کہہ دیا کہ آپ لوگ برا مانیں یا اچھا لیکن کم از کم میں اپنی صدارت میں اس طرح سے اس ریسرچ اسکالر کو ڈگری نہیں تجویز کر سکتا۔ حالانکہ میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے اور اس کے کیا حالات ہیں۔ لیکن جو کوئی بھی ہو اور اس کے جو حالات بھی ہوں، میں اپنی یونیورسٹی کے معیار کے اس طرح گرتے رہنے کے حق میں نہیں ہوں۔ اور کم از کم میں اس میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ جب وائس چانسلر صاحب کی موجودگی ہو۔ یا آپ کے مستقل پرو وائس چانسلر کی موجودگی میں یہ میٹنگ ہو اس وقت آپ جو چاہیں منظور کر والیں عارضی طور پر دو ماہ پرو وائس چانسلر کی حیثیت سے میں نے کام کیا میرے بعد اس کیس کا کیا حال ہوا۔ مجھے اس کا علم نہیں اس لئے کہ میں جس راستہ پر نہیں چلتا اس کے میل نہیں گنتا۔ لیکن میرے دل میں بار بار خیال آتا تھا کہ آخر ڈاکٹر صاحب جیسی قابل ذہین اور ممتاز شخصیت نے جو مسلم یونیورسٹی کے متعلق اظہار خیال کیا تھا اس میں اگر زیادہ نہیں تو تھوڑی صداقت ضرور تھی جو اس واقعہ سے نمایاں ہے۔ اور ان جیسے علی گڑھ کے عاشق کی رائے آخر بالکل فضول کیسے ہو سکتی تھی۔

دوسرا واقعہ جس کا مجھے صدمہ ہوا یہ تھا کہ میڈیکل کالج کے ایک صاحب جو اپنے مضمون میں جید عالم سمجھے جاتے تھے اور یقیناً ہوں گے بھی ایک مرتبہ ایگزیکٹیو کونسل کے الیکشن کے سلسلہ میں ایک صاحب کو ووٹ دینے کی سفارش کرنے میرے یہاں تشریف لائے۔ میں اور میری بیوی ان کے پاس ڈرائنگ روم میں

بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میری بیوی نے اُن کی خاطر مدارات کے لئے خاص طور سے چائے اور دوسری چیزوں کا انتظام کیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب موصوف سے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب! آپ اپنے مضمون کے بہترین استادوں میں سے ہیں، پڑھنے لکھنے اور کام کرنے والے ہیں۔ اور ایسے آدمی کے لئے ووٹ مانگنے آئے ہیں جن کو پڑھنے لکھنے اور اپنے کام کرنے میں نہ کوئی دلچسپی ہے نہ تعلق۔ تو وہ ایگزیکٹیو کاونسل جو قریب قریب ہر معاملہ کے لئے بہترین کاونسل سمجھی جاتی ہے وہاں جا کر کیا کریں گے۔ کہنے لگے جب میں انگلستان گیا تھا تو میں نے وہاں بہت اچھا کام کیا تھا۔ لیکن یہاں استاد ہونے کے بعد جب میں نے حالات دیکھے تو یقین ہو گیا کہ مسلم یونیورسٹی میں ہر کام پالکس سے ہوتا ہے۔ اب تو مجھے پالکس لڑنے اور لڑانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ اور پڑھنا لکھنا تو اب صرف برائے نام ہے۔ اس کام کو میں نے بالکل چھوڑ دیا۔ جو سرمایہ جمع کیا تھا اس کے سود پر معاملہ چل رہا ہے۔ میں نے بہت تکلیف سے ان سے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب یہ بات آپ کے لئے زیب نہیں دیتی اس لئے کہ استاد کا فرض تو یہ ہے کہ ہمیشہ تعلیمی کام میں مشغول رہے۔ بولے مسلم یونیورسٹی میں تو کام کرنے والے استادوں کی مٹی پلید ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس سے کیا فائدہ۔ میں یہ سن کر سناٹے میں رہ گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب کی بات دل پر تازہ ہو گئی۔ لیکن اب ان کی باتیں یاد کرنے کے علاوہ اور بچا ہی کیا ہے۔ اگر کسی سے کچھ کہوں تو وہ یقیناً یہی خیال کرے گا کہ یہ آدمی تو زندگی بھر ڈاکٹر صاحب کی خوشامد میں لگا رہا اور آج بھی وہی کام کر رہا ہے۔

اب میں یونیورسٹی سے ریٹائر ہو گیا ہوں لیکن اپنے مضمون سے نہیں۔ اس لئے کہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی استاد کبھی اپنے مضمون سے ریٹائر نہیں ہوتا۔ بانی یونیورسٹی نے جب یونیورسٹی بنائی تھی تو کیا کیا حوصلے رہے ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب کے کیا حوصلے تھے۔ ہم تو کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر ان کی تقلید میں تھوڑی بہت ملک اور قوم کی خدمت کرتے رہیں تو یہی ہمارا حاصل زندگی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ سائنس کی تحقیقات میں دو ایک مثالیں دینے سے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ اور یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ صرف دو ایک باتیں دیکھ کر جلدی سے کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ریٹائر ہونے کے بعد چونکہ میری بیوی مسلم یونیورسٹی ہی میں ملازم ہیں اور ان کے ساتھ یونیورسٹی کے اندر ہی رہتا ہوں اور کبھی کبھی تھوڑے بہت حالات معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ تو پتہ چلا کہ موجودہ وائس چانسلر صاحب نے Academic Programme Commission بنایا ہے جس کا کام منجملہ اور کاموں کے یہ ہے کہ وہ یہ تحقیقات کرے اور جگہ جگہ جا کر معائنہ کرے اور یہ دیکھے کہ ہر شعبہ کے اساتذہ کام کر رہے ہیں یا نہیں۔ حالانکہ اتنے عرصہ تک یونیورسٹی میں کام کرنے کے بعد مجھے کم از کم اتنی بات معلوم ہے کہ یہ بات تو یونیورسٹی کے قواعد میں پہلے ہی سے موجود ہے۔ وائس چانسلر پوری یونیورسٹی کے کام کا ذمہ دار ہے، ہر ڈین

اپنی فیکلٹی کا ذمہ دار ہے۔ ہر صدر شعبہ اپنے شعبہ کا ذمہ دار ہے اور ہر استاد اپنے کام اور اپنے طلباء اور تحقیق کے کام کا ذمہ دار ہے۔ تو موجودہ وائس چانسلر کو ایسا کمیشن بنانے کی کیا ضرورت پڑتا۔ وجہ صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ ان کو اس بات کا احساس ہے کہ لوگ اپنی اپنی جگہ پر کام نہیں کر رہے ہیں۔ اور یہی ذاکر صاحب کا خدشہ تھا جس کو رنجیدہ ہو کر انہوں نے مجھ سے بیان کیا تھا۔

یہ بات میں ہرگز نہیں کہتا کہ یونیورسٹی میں قابل استاد نہیں ہیں۔ دراصل بہت سے لوگ تو بہت ہی اچھے ہیں اور مزید لوگ بھی ہوں گے۔ جنھیں میں نہیں جانتا۔ بہت سے لوگوں نے اپنے کام کا سکہ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر بھی جمایا ہے اور جما رہے ہیں۔ مگر یہاں پر جتنا زیادہ بگڑنے کا چانس ہے۔ اس کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ جو جو وائس چانسلر کم از کم میری علمی زندگی میں یہاں پر آئے۔ سب بڑے بڑے حوصلے لے کر آئے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں ہر ایک کی مخالفت کی گئی۔ اس لئے ان سے طرح طرح کے کام کروائے جا سکیں۔ آخر استاد کو استاد بننے سے زیادہ کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور میری سمجھ میں آج تک نہ آ سکا کہ کیوں یہاں کے لوگ وائس چانسلر سے اس بات کے امیدوار ہوتے ہیں کہ ان کو استاد کے علاوہ کوئی اور چھوٹا موٹا عہدہ مل جائے

مجھے یقین ہے کہ میرے اس مضمون سے علی گڑھ اور علی گڑھ سے جو لوگ باہر جا چکے ہیں ناراض ہو سکتے ہیں۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ استاد کا فرض ہے کہ جس بات کو وہ صحیح سمجھے صفائی سے کہے۔ اور اس کو اپنے خیالات کے علاوہ کسی اور چیز کا غلام نہیں ہونا چاہئے۔ یہ خیالات وقت کے ساتھ تبدیل بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ میرے خیالات آئندہ چل کر کچھ اور ہو جائیں۔ لیکن جب دوسرے ہوں گے تو میں اپنی غلطی کو تسلیم کرنے میں کسی وقت بھی کسی قسم کا تامل نہ کروں گا۔ انشاء اللہ۔

●●

ڈاکٹر اقبال حسین
(سابق پروفیسر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی)
اکزیبیشن روڈ، پٹنہ

ڈاکٹر ذاکر حسین سے میری چند ملاقاتیں

میری ملاقات مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے پہلی بار غالباً ۱۹۳۱ء میں دہلی میں ہوئی ہیں ان کے پاس ایک تعارفی خط امام المشائخ حضرت خواجہ حسن نظامیؔ کا لے کر گیا تھا۔ امام المشائخ کا خط دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور دیر تک ان کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے رہے۔ اس زمانہ میں میں "سام مرزا صفوی" کا تذکرہ "تحفۂ سامی" پر کام کر رہا تھا اور میں نے اس کام میں ڈاکٹر صاحب کا مشورہ لینا مناسب سمجھا تھا۔ اس کتاب کو پٹنہ یونیورسٹی شائع کرانے والی تھی اور میں اس کو نہایت خوبی کے ساتھ ایڈٹ کرنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب پروفیسر براؤن (Prof. Browne) کی "تاریخ ادبیات ایران" میں اس کتاب کے متعلق پڑھ چکے تھے۔ پروفیسر براؤن نے "تحفۂ سامی" کو ایک گراں بہا کتاب قرار دیا تھا۔ از راہ کرم ڈاکٹر صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ کتاب کو اس طرح سے ایڈٹ کیا جائے کہ متن میں کوئی غلطی اور خامی نہ رہ جائے اور حواشی کے نوٹ کو زیادہ طول نہ دیا جائے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے اس مشورہ پر پورا عمل کیا۔ جب یہ کتاب ۱۹۳۴ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے توسل سے شائع ہوئی تو ایران اور یورپ میں یہ ایڈیشن نہایت مقبول ہوا۔ میں نے ایک نسخہ کتاب کا ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ڈاک سے روانہ کر دیا اور تین مہینوں بعد جب میں دلی جا کر ان سے ملا تو وہ کتاب "تحفۂ سامی" کو پڑھ چکے تھے۔ میری ہمت افزائی کی اور ان خطوط کو دیکھا جو میرے پاس کتاب کے بارے میں ایران اور یورپ سے آئے تھے خصوصاً مرزا محمد قزوینی اور آقائی محمد علی تربیت کے خطوں کو نہایت شوق سے پڑھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ یہ سب کچھ ڈاکٹر صاحب کے اچھے مشوروں کی بدولت ہوا۔

ڈاکٹر صاحب ایک خوش مزاج آدمی تھے اور ہر بات میں ان کی متین ظرافت کا اظہار ہوتا تھا۔ کتاب کھول کر آگہی خراسانی کا احوال پڑھنا شروع کیا۔ سام مرزا نے اس شاعر کے بارے میں لکھا ہے کہ خباثت اس کے مزاج پر غالب تھی اور مختلف قسم کے "شہر آشوب" لکھا کرتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب اس شاعر کے متعلق کہنے لگے کہ خوب آدمی تھے اور ایک بات تو ایسی کہی ہے جس کو میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ چیل کے بارے میں کہتے ہیں کہ چھ مہینے نر اور چھ مہینے مادہ رہتی ہے۔ آگہی خراسانی نے مولانا محمد طبسی

کی (جو کہ عام طور سے احمد آتون کہے جاتے تھے) خوب ہنسی مندرجہ ذیل شعر میں اڑائی ہے ؎

احمد آتون گہی شیعی گہی سنی بود   چون نلیبوائی کہ شش مذہب و شش مذرت

پھر فرمایا کہ احمد آتون بڑے وقت شناس انسان تھے کبھی اپنے کو شیعہ کہتے اور کبھی سنی یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب خوب ہنسے اور کہا کہ آپ کے پٹنہ میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے کو کبھی شیعہ اور کبھی سنی ضرورت کے مطابق کہتے ہیں یہ اشارہ میرے ملنے والوں میں ایک صاحب کی طرف تھا جو اپنے کو کبھی سنی اور کبھی شیعہ کہتے تھے۔ سام مرزا کے بارے میں کہا کہ جب وہ قید میں تھا تو اس نے وصیت کی تھی کہ جب وہ مر جائے تو دفن کرنے کے بعد اس کے لوح قبر پر یہ رباعی کندہ کر دی جائے۔

سامی ز غم زمانہ بیغم می باش   با محنت درد و عشق ہمدم می باش

چون موجب شادی حقیقی مرگ است   گر مرگ رسد تو شاد و خرم می باش

میں نے بعد تحقیق اس رباعی کو "تحفہ سامی" کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچہ میں درج کر دیا ہے۔



۱۹۳۷ء میں میری کتاب (The Early Persian Poets of India) کو پٹنہ یونیورسٹی نے شائع کیا میں نے پہلی کاپی ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بذریعہ ڈاک روانہ کی۔ جب کتاب ملی پہنچی تو ڈاکٹر صاحب بیمار تھے اور شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ وقت پر رسید نہ بھیجنے کی معذرت چاہی اور اپنے خط میں میری کتاب کی تعریف کرتے ہوئے مجھے تحقیق کا کام جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ اس خط کو میں نے ۴۴ سال سے بطور یادگار اپنے پاس محفوظ رکھا ہے۔ ایک سال بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے اس کتاب کی تین کاپیاں طلب کیں اور جب میں دہلی سرکاری کام سے گیا تو ان تین کاپیوں کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ میں محمود شیرانی سے اس بات پر اتفاق کرتا ہوں کہ کچھ عرصہ تک اس طرح کی کتاب نہیں لکھی جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا مقابلہ نئی کتابوں کے پڑھنے میں کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ جب بھی کوئی نئی کتاب کا تذکرہ کیجیے خواہ اُردو کی ہو یا انگریزی کی یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گذر چکی ہوگی اور اس پر وہ اپنا عالمانہ تبصرہ فوراً دیتے تھے۔ کہنے لگے کہ میں شیرانی صاحب کا تبصرہ پڑھ چکا ہوں۔ لاؤ تمہارے سامنے کتاب کو پڑھوں۔ چونکہ میری کتاب (Sir Denison Ross) ڈاکٹر عظیم الدین احمد اور ڈاکٹر ہادی حسن کے مشوروں سے مرتب کی گئی تھی کچھ دیر تک ان بزرگوں کا تذکرہ رہا۔ ڈاکٹر صاحب (Sir Denison Ross) سے خوب خوب واقف تھے اور اکثر ان کی خدمات کی تعریف کیا کرتے تھے۔ میں نے ابوالفرج رونی کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا اس کو بہت پسند کیا اور فیضی کے ایک قصیدہ کے چند اشعار پڑھے جس میں اس نے الفرج رونی کا تتبع کیا تھا۔ رونی کی رباعیوں کو بھی بہت پسند کیا۔ عمید الدین کے اشعار کو بھی

شوق سے پڑھا۔ خصوصاً اس نظم کو جس میں شراب اور بھانگ کے درمیان مناظرہ درج ہے۔ عبیدالدین کے اس قصیدہ کو جس کی تشبیب ہے۔

وارم جفائی نو بہ نو زیں چرخ نا خوش منظری   کوری کبودی کج روی عاقل کشی دون پروری

نہایت شوق سے شروع سے آخر تک پڑھا اور مندرجہ ذیل شعر کو کئی بار پڑھا۔

برخیز بر عزم سفر زیں جای نا خوش درگذر   کاندر تنور شیشہ گر قیمت ندارد جوہری

ڈاکٹر صاحب سے یہ ملاقات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ انھوں نے اپنے چند ضروری کاموں کو چھوڑ کر مجھے موقع دیا کہ میں ان سے کچھ استفادہ کرسکوں میں بغیر اطلاع کئے ان سے ملنے گیا تھا اور انھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے میرے ساتھ اپنا قیمتی وقت صرف کیا۔



ڈاکٹر عبدالحفیظ فردوسی اپنے مرادپور کے بنگلہ میں مقیم تھے۔ یہاں اب پٹنہ مارکٹ بن گیا ہے۔ ان کا بیٹا جامعہ ملیہ میں پڑھتا تھا۔ کسی کام سے ڈاکٹر ذاکر حسین غالباً ۱۹۴۳ء میں جب پٹنہ تشریف لائے تو ڈاکٹر حفیظ نے ان کو اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا اور مجھے بھی بلایا۔ میں مسٹر امتیاز محمد خاں ایم اے علیگ بی ٹی لندن کے ساتھ جو اس زمانہ میں دانا پور گھگول ریلوے اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اس دعوت میں شرکت کے لیے گیا۔ ہم لوگ کچھ دیر پہلے پہنچے تو مسٹر امتیاز محمد خاں نے مجھ سے ڈاکٹر ذاکر حسین کی بنیادی تعلیم کی اسکیم پر اعتراض کرنا شروع کیا۔ میں نے ان کو روکا اور کہا کہ یہ موقع ان سب باتوں کا نہیں ہے ڈاکٹر صاحب کا قیام پٹنہ میں تین دن اور رہے گا آپ ان سے مل کر اپنی بدگمانیوں کو دور کرلیں۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور ہم مختلف موضوع پر خصوصاً مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں ان سے باتیں کرتے رہے۔ چائے کی میز بڑی لمبی تھی اور ہر قسم کے کھانوں اور پھلوں سے لدی ہوئی تھی جب چائے شروع کرنے میں دیر ہوئی تو ذاکر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ یہ تو جنت کا نظارہ معلوم ہوتا ہے۔ کل اچھی اچھی چیزیں سامنے رکھی ہوئی ہوں مگر کوئی ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں کرنے والا ہے۔ میرے دوستوں میں سے ایک نے اپنے علیگڈھ کے انداز میں کہا کہ حضرت جبرئیل کا انتظار ہے۔ وہ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ مولانا سید سلیمان ندوی کمرے میں داخل ہوئے اور چند لوگوں نے کہا کہ آج سے آپ کا خطاب جبرئیل ہوگیا۔ سلیمان ندوی صاحب نے بھی ہنسی میں شرکت کی اور تقریب ایک گھنٹہ تک ڈاکٹر صاحب نے اپنی باتوں سے ہم لوگوں پر جادو کا اثر ڈالا اور ہم لوگ دم بخود ان کی باتوں کو سنتے رہے کیونکہ گفتگو کا موضوع اسلامیات تھا۔ مولانا سلیمان ندوی جب اسلامیات کی باتیں ہوں تو کب چپ رہنے والے تھے کبھی تو ڈاکٹر صاحب کا ساتھ دیتے تھے اور کبھی نہایت شدت کا اختلاف کرتے تھے۔ جی تو چاہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کچھ دیر اور بیٹھیں کیونکہ ان کی باتیں ہم لوگوں کے لیے نہایت سودمند اور دلچسپ تھیں۔ مگر مرادپور کی مسجد سے مغرب کی اذان ہوئی اور جلسہ ختم ہوگیا۔



راج بھون آج بھی اپنی ایک خاص نوعیت اور اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ریاست کی ثقافتی اور نیم سیاسی زندگی کا مرکز ہوتا ہے۔ سرکار کا فرض ہے کہ اس کے واجب اخراجات کو فراخ دلی سے برداشت کرے۔ آج کل تو اکثر کہا جاتا ہے کہ گورنر کا عہدہ بیکار ہو چکا ہے اور یہ عہدہ اگر قائم ہی رکھا جائے تو راج پال جی کو کسی چھوٹے مکان میں منتقل کر دیا جائے کوئی کہتا ہے کہ راج بھون کی عمارت میں گوشالہ کا صدر دفتر قائم کر لیا جائے یا اس میں دھرم شاستر کی کتابوں کا عجائب گھر کھول دیا جائے۔ جیسی عقل ویسی باتیں۔

ڈاکٹر صاحب کے آنے سے پہلے راج بھون کی رونق میں کمی آ چکی تھی۔ جب ڈاکٹر صاحب تشریف لائے تو نقشہ ہی بدل گیا۔ فراش، چپراسی، جمعدار، چوب دار وغیرہ صاف سفید کپڑوں میں ملبوس نظر آنے لگے۔ راج بھون کی برساتی کے دوسری جانب جو کمرہ عرصۂ دراز سے گورنر سے ملنے والوں کے لیے مخصوص تھا فرنیچر سے آراستہ کیا گیا اور نامور قومی لیڈروں کی تصویروں سے مزین ہوا۔ اس انتظام سے گورنر کے ملنے والوں کو بہت سہولت ہو گئی اور ان کو ADC کے کمرہ میں بیٹھنے کی حاجت باقی نہ رہی۔ اکثر لوگ ADC کے کمرہ میں بیٹھ کر انتظار کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی آمد نے راج بھون کو ایک نئی زندگی بخشی۔ اس زمانہ میں کرنل بھٹناگر گورنر کے ملٹری سکریٹری تھے اور ایک نہایت تجربہ کار افسر تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ہمت افزائی کی بدولت راج بھون کے ہر دفتر اور شعبہ میں انھوں نے ایسی درستگی لائی جس کو لوگ اب تک یاد کرتے ہیں۔ بچتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہدایت کر دی کہ اخراجات اگر اس رقم سے جو گورنر کے مصارف کیلئے دی جاتی ہے (Governor's sumptuary allowance) سے زیادہ ہو جائے تو اس کمی کو نجی فنڈ سے پورا کر دیا جائے۔

ڈاکٹر صاحب کے گورنر ہونے کے بعد جو پہلی گارڈن پارٹی ۲۶ جنوری کو دی گئی وہ نہایت شاندار تھی۔ لان کی سبزی دیدہ زیب تھی اور موسمی پھول اپنی کیاریوں میں بہار دکھا رہے تھے۔ کل عمائدین شہر پارٹی میں موجود تھے اور ریاست کے اکثر اضلاع سے بھی مہمان آئے تھے۔ ایک نئی بات یہ ہوئی کہ ریاست کے بہت سے سینئر پروفیسر نوید دیکر بلائے گئے اس سے پہلے اکثریت سرکاری ملازمین اور ممبران اسمبلی اور کانسل کی ہوا کرتی تھی۔ جن لوگوں نے کچھ عرصہ سے راج بھون کی پارٹیوں میں آنا ترک کر دیا تھا وہ بھی شوق سے آئے۔ گورنر کا عہدہ نہایت عزت و قدر کا عہدہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ایسا شریف انسان جب گورنر بہار ہو کر آیا تو ان سے ملنے کی تمنا ہر مہمان کے دل میں تھی۔ وقت معین پر ڈاکٹر صاحب پارٹی میں تشریف لائے وہ چوڑی دار پائجامہ سیاہ رنگ کی شیروانی اور اسی رنگ کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ ان کے آتے ہی بینڈ

نے "جن من گن" کی دھن بجائی اور اس کے بعد مہمان ناشتہ کی میزوں کی طرف گئے۔ ناشتہ نہایت پرتکلف تھا۔ انگریزی اور ہندوستانی مٹھائیاں اور پھل موجود تھے۔ مہمانوں نے گاجر کا حلوہ جس کو ڈاکٹر صاحب نے شوق سے منوایا تھا خوب کھایا اور پسند کیا۔ اعلیٰ قسم کا سگریٹ اور سگار سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ ناشتہ کے بعد ڈاکٹر صاحب مہمانوں سے ملنے گئے۔ کرنل بھٹناگر بہت سے لوگوں سے واقف تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے ملنا شروع کیا خاص طور سے مسٹر الکھ نرائن سنہا سابق انسپکٹر جنرل پولیس، پرنسپل معین الحق، پدم شری وشنو کانت جھا، فادر منی اور ایسے ہی چند اشخاص کو ڈاکٹر صاحب سے ملایا۔ جب میں ڈاکٹر صاحب سے ملا تو انھوں نے مجھ سے میری اہلیہ کی خیریت دریافت کی جو ان دنوں سخت علیل تھیں۔ آج کل گورنر کے ملیٹری سکریٹری بہت کم لوگوں سے واقف ہوتے ہیں اور مہمانوں کو گورنر سے ملانے میں ان کو دشواری ہوتی ہے پہلے کا دستور اچھا تھا کہ نوید کے کارڈ کے ساتھ ایک چھوٹا سا تعارفی کارڈ جس پر مہمان کا نام اور پتہ درج ہوتا بھیجا جاتا تھا۔ گورنر کے سامنے ملیٹری سکریٹری اس چھوٹے کارڈ کو پڑھا دیتا تھا اور نہایت آسانی سے تعارف ہو جاتا تھا۔ اب تو مہمان کو خود ہی اپنا نام اور پتہ بتا کر تعارف کرانا ہوتا ہے۔ آج کل ان جلسوں میں لباس کی کوئی پابندی باقی نہیں رہی۔ پہلے تو سب لوگ سیاہ رنگ کی شیروانی یا بند کوٹ پہن کر آتے تھے اور گرمیوں میں لباس کا رنگ سفید یا بادامی ہوتا تھا۔ پارٹی ذرا دیر کر کے ختم ہوئی اور میں مرحوم بھائی عبدالجلیل صاحب وکیل کو ساتھ لے کر گھر واپس آیا۔ راستہ بھر بھائی جلیل ڈاکٹر صاحب کی جامعہ ملیہ کی قدیم باتوں کو یاد دلاتے آئے اور ان کی شفقت اور عنایت کا تذکرہ بہت ہی خلوص سے کیا۔ یہ بھی یاد دلایا کہ ڈاکٹر صاحب شروع میں کس جفاکشی کی زندگی گذارتے تھے اور جامعہ ملیہ سے جامع مسجد پیادہ جایا کرتے تھے لباس بھی نہایت موٹے اور معمولی کپڑوں کا ہوا کرتا تھا اور موٹے کپڑے کی اونچی ٹوپی جو اب گاندھی نما ٹوپی میں بدل گئی ہے۔



اپنے عقیدے کی بنا پر مجھے ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کی دعوت میں شریک ہونے سے انکار کرنا پڑا۔ بات یوں ہوئی کہ نیپال کے کوئی رانا پٹنہ آئے تھے اور ڈاکٹر صاحب نے ان کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ مسلمانوں میں لیڈی امام، نواب زادہ سید محمد مہدی، ڈاکٹر عبدالحئ اور میں بلایا گیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالحئ دعوت میں شریک ہوئے۔ لیڈی امام، نواب سید محمد مہدی اور میں نے کھانے میں شرکت نہ کی۔ دعوت کی رات شب عاشورہ تھی اس لیے ہم لوگوں کا دعوت میں جانا ناممکن تھا۔ لیڈی امام نے خط لکھ کر دعوت میں شریک ہونے سے انکار کیا اور یہ بھی لکھا ہے کہ شب عاشورہ میں مسلمانوں کو دعوت پر بلانا ان کے جذبات کو مجروح کرنا ہے۔ میں نے نواب زادہ صاحب سے دریافت کیا کہ کیا جواب دیا جائے؟ نواب زادہ نے جو لیڈی امام کے جواب سے باخبر تھے مجھ سے کہا کہ لکھ دیا جائے کہ دوران عشرہ محرم میں کسی دعوت میں

شریک نہیں ہوتا ہوں۔ اس لیے میری غیر حاضری معاف کی جائے۔ نواب زادہ نے خود بھی اسی طرح کا جواب روانہ کیا اور بات ختم ہو گئی۔

کچھ عرصہ پہلے تک یہ دستور تھا کہ جو لوگ گورنر سے ملتے یا ان کے یہاں دعوتوں میں شریک ہوتے ان کے نام "راج بھون" کی طرف سے پٹنہ کے اخباروں میں شائع کر دیے جاتے تھے۔ اس خبر کو دیکھ کر کہ ڈاکٹر عبدالحیی بھی شریک تھے، کچھ لوگوں نے اعتراض کیا اور مختلف طرح کے تبصرے ہوئے۔ میں تو اس واقعہ کو بھلا چکا تھا اور اس میں میری کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ کچھ عرصہ تک میری ملاقات ڈاکٹر صاحب سے نہ ہو سکی۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب کا خط آیا کہ میں "راج بھون" آکر ان کتابوں کو دیکھوں جن کو مسٹر اس۔ وی۔ سوہنی آئی۔ سی۔ اس۔ موضع کواتھ، ضلع شاہ آباد سے لائے تھے۔ یہ کتابیں میرے دوست الحاج جان محمد بلگرامی کی ملکیت تھیں اور ان سب کتابوں کو وہ خدا بخش لائبریری میں فروخت کرنا چاہتے تھے۔ ہر قسم کی کتابیں تھیں جن میں کچھ اچھی کتابیں بھی مجھے نظر آئیں۔ میں نے ان کتابوں کو قریب تین گھنٹے دیکھ کر واجبی قیمت لگا دی جو اس قیمت سے کچھ زیادہ تھی۔ جو ایک صاحب پہلے لگا چکے تھے۔ جب یہ کام ختم ہو گیا تو ڈاکٹر صاحب مجھے چائے کے کمرے میں لے گئے اور دوران شب عاشورہ کی دعوت کا تذکرہ آ ہی گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کو ہم لوگوں کی غیر حاضری پر افسوس تھا۔ فرمانے لگے کہ شب عاشورہ ایک برکت والی رات ہے۔ عرب اس رات کو مبارک رات سمجھ کر دعوتیں کرتے ہیں۔ اور لوگ شوق سے ان دعوتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ میں ڈاکٹر صاحب کے سامنے کیا بولتا؟ تھوڑی دیر چپ رہنے کے لہذا نہایت ادب کے ساتھ میں نے عرض کیا کہ شب عاشورہ تو میرے لیے غم کی رات ہے میں کیونکر دعوت میں شریک ہو سکتا تھا۔ کھانا تو بہت دور کی بات ہے میں تو غم امام مظلوم میں شب عاشورہ میں پانی تک نہیں پیتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کچھ بولنا چاہتے تھے معلوم نہیں کیوں خاموش ہو گئے اور دوسری دوسری باتیں کرنے لگے۔ مغرب کا وقت نزدیک تھا میں اجازت لے کر گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے عقیدوں کا اظہار خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی نہایت دلیری سے کیا کرتے تھے۔



۱۹۶۰ء میں بحیثیت پرنسپل پٹنہ کالج میں رسل میموریل ٹرسٹ کا سکریٹری تھا۔ مسٹر چارلس رسل ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۱ء تک پٹنہ کالج کے پروفیسر اور پرنسپل تھے۔ دوران پہلی جنگ عظیم مسٹر چارلس رسل وطن کی خاطر انگریزی فوج میں جو جنرل الن بی کے کمان میں تھی داخل ہو گئے۔ اور دوران جنگ نہایت گراں بہا خدمات انجام دیتے رہے۔ ۲۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو جب انگریزی فوج حملہ آور ہو کر یروشلم کے فصیل تک پہنچ چکی تھی اور فتح رسل کی نظروں کے سامنے تھی تو دشمن کی ایک گولی نے ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ ایسے بہادر دانشور کی یاد میں ان کے چند دوستوں نے یہ ٹرسٹ قائم کیا ہے۔ اس ٹرسٹ کی آمدنی سے کسی موضوع پر جس کا تعلق ادب یا فلسفہ یا سائنس سے ہو لکچر کرایا جاتا ہے۔ اور یہ لکچر "رسل لکچر" کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ لکچرس آکسفورڈ

یونیورسٹی پریس" شائع کراتی ہے۔ خطبہ دینے کے لیے کسی نہایت قابل اور نامور شخص کا انتخاب ہوتا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں مقرر کا انتخاب میں نے ڈاکٹر صاحب کی مرضی پر چھوڑ دیا جو ان دنوں پٹنہ یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام کے لیے پروفیسر ہمایوں کبیر کو منتخب کیا جو مرکزی حکومت میں وزیر تھے اور اپنی اعلیٰ قابلیت کے لیے مشہور تھے۔ اس انتخاب سے مجھے بہت خوشی ہوئی کیونکہ پروفیسر موصوف میرے دیرینہ دوست تھے۔ اور مرتے دم تک ان کی اور میری دوستی برقرار رہی۔ پروفیسر ہمایوں کبیر کے لیے لکچر کا موضوع "مرزا ابوطالب خاں" تھا۔ جو اپنے زمانے کے نامور دانشور، سیاح اور مورخ تھے۔ ۱۶ر اپریل ۱۹۶۱ء کو جلسہ پٹنہ کالج میں ہوا۔ چونکہ دو بڑے دانشوروں (ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر ہمایوں کبیر) کی شرکت ہونے والی تھی شائقین کا بڑا اجتماع ہوا اور جلسہ کا انتظام جگہ کی کمی کے باعث ونس گارڈن کے کھلے میدان میں کرنا پڑا۔ پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا جو کہ نہایت عالمانہ تھا اور حاضرین نے نہایت شوق سے سنا اور خوب داد دی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطبہ میں افلاطون سے لے کر ٹیگور اور مولانا آزاد تک کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ کس طور سے ان بزرگوں نے عوام کی خدمت کی ہے۔ اور باوجود اپنی برتری کے کبھی بھی عوام الناس سے الگ نہیں رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

"These giants of the spirit had not been able to persuade themselves into an attitude of indifference towards the society of comman man in which they lived and had theirs being. Man and affairs have claimed their attention and political thinking as well as political actions have been enriched by their participation."

پھر پروفیسر ہمایوں کبیر نے اپنا خطبہ پڑھا اور اس کے ختم ہونے پر ہم لوگ چائے کی دعوت میں شریک ہوئے جس کا اہتمام پٹنہ یونیورسٹی نے کیا تھا۔ اس دعوت میں حاضرین سے ڈاکٹر صاحب انیسویں صدی کے مورخوں اور دانشوروں کا تذکرہ کرتے رہے۔ ان کی گفتگو کو لوگوں نے خوب جی لگا کر سنا۔ کل کام ختم ہو جانے کے بعد میں پروفیسر ہمایوں کبیر کے ساتھ راج بھون گیا جہاں ڈاکٹر صاحب نے چند مہمانوں کو رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اور مجھے بھی اس دعوت میں شریک ہونا تھا۔ اس رات ڈاکٹر صاحب کے ٹیبل ٹاکس کا رنگ گفتگو بالکل بدلا ہوا تھا۔ جو باتیں ہوئیں وہ سب کی سب نہایت عالمانہ تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مرزا ابوطالب کے دیوان کا تذکرہ کیا جس کا انگریزی ترجمہ ۱۸۰۷ء میں لندن میں شائع ہوا تھا۔ اور ابوطالب کے کچھ اشعار بھی سنائے اس کے بعد فرمایا کہ مرزا ابوطالب خاں کی چند تصنیفوں کے

نسخے بتیا میں مہاراجہ بتیا کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ مہاراجہ کا کتب خانہ اپنے وقت میں ایک مشہور کتب خانہ تھا جہاں بہت سی نادر کتابیں مل جاتی تھیں۔ جب بتیا کے کتب خانہ کا تذکرہ آیا تو میں نے عرض کیا کہ بہار میں زمینداری کے خاتمہ سے بہت سی اچھی چیزیں بھی ختم ہوگئیں اور ہوسکتا ہے کہ بتیا راج کے خاتمہ کے بعد اس کتب خانہ کا بھی خاتمہ ہوگیا ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے کتب خانہ کے بارے میں دریافت کرنے کو کہا تھا۔ شاید بھول گئے اور کوئی بات معلوم نہ ہوگی۔ مہاراجہ کے کتب خانہ میں میری ذاتی دلچسپی تھی کیونکہ تقریباً سوا سو سال پہلے میرے خاندان کے ایک بزرگ سید نجم الدین صاحب مہاراجہ کے دیوان تھے۔ اور نہایت ہی علم دوست انسان تھے۔ انھوں نے کتب خانہ میں بہت کچھ توسیع کی تھی اور ان کے زمانہ میں یہ کتب خانہ اپنی نوادرات کے لیے مشہور ہوگیا تھا۔ سید نجم الدین صاحب کا تذکرہ کرنل سلی مین نے اپنی کتاب (Rambles & Recollections) میں کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی عالمانہ باتیں جب اس بدمذاقی کے دور میں یاد آتی ہیں تو نہایت دکھ ہوتا ہے۔ اب ایسے لوگوں کا ملنا ناممکن ہے۔



دسمبر ۱۹۶۱ء میں خان بہادر عبید الرحمٰن شروانی علی گڑھ سے ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر پٹنہ تشریف لائے اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے "راج بھون" میں ٹھہرے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ٹیلی فون کرکے کہا کہ میں خان بہادر کو پٹنہ کالج اور پٹنہ یونیورسٹی کے دوسرے تعلیمی اداروں کو دکھادوں۔ خان بہادر عرصہ دراز سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے خازن تھے اور ان کو پٹنہ یونیورسٹی کی درسگاہوں میں خاصی دلچسپی تھی۔ میں خان بہادر کو سید اکبر حسین کے ہمراہ جو ان دنوں پٹنہ یونیورسٹی کے خازن تھے اکثر درسگاہوں کو دکھاکر "راج بھون" واپس لایا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہم لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر پٹنہ کالج کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پٹنہ کالج کی صد سالہ خدمتوں کا تذکرہ کیا اور کالج کے چند نامی استادوں کو بھی یاد کیا۔ خصوصاً استاد محترم ڈاکٹر عظیم الدین احمد کا تذکرہ دیر تک ہوتا رہا۔

۱۲ دسمبر کی رات کو خان بہادر عبید الرحمٰن کے اعزاز میں ایک دعوت ہوئی جس میں دس مہمانوں نے شرکت کی۔ کھانے کی میز کا نقشہ میرے پاس بطور یادگار محفوظ ہے۔ بھٹناگر صاحب نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اور ہم لوگوں کو کھانے کے کمرہ میں لے گئے۔ بہت جلد ڈاکٹر صاحب بھی تشریف لائے اور کل مہمانوں سے مل کر ان کی مزاج پرسی کی۔ ایک دو مہمانوں سے کچھ عرصہ پر ملاقات ہوئی تھی اس لیے ان سے دیر تک باتیں کیں۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا پرانا دستور تھا۔ اس طرح کی وضع داریوں کو ڈاکٹر صاحب نے آخر دم تک قائم رکھا۔ ڈاکٹر صاحب ایک خوش گفتار آدمی تھے اور نہایت ہی دلچسپ انداز سے باتیں کرتے تھے۔ اس رات بھی ڈاکٹر صاحب نے کھانے کی میز پر اپنے ٹیبل ٹاکس سے سب لوگوں کو بے حد خوش کیا۔ کھانے کے

دوران مہمانوں کو طرح طرح کے قصے سنا کر ہنساتے رہے۔ ایک نواب صاحب کا قصہ سنایا جن کو ایک ہنر مند باورچی کی ضرورت تھی۔ نواب صاحب نے لکھنؤ جا کر چند اچھے باورچیوں میں سے ایک کا انتخاب کیا اور اس کو اپنے گھر لے گئے۔ گھر آکر نواب صاحب نے باورچی کو حکم دیا کہ وہ جو سب سے اچھا کھانا پکا سکتا ہے اسے پکا کر دسترخوان پر لائے۔ نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ کھانا پکانے کے متعلق اسے کوئی ہدایت نہیں دی جائے گی۔ اور اچھے سے اچھا کھانا پکا کر دسترخوان پر حاضر کرنا ہوگا۔ پہلی رات باورچی نہایت اچھی چپاتیاں اور نہایت خوش مزہ اور خوش رنگ قورمہ پکا کر دسترخوان پر لایا۔ نواب صاحب نے ان کو شوق سے نوش جان فرما کر باورچی کی تعریفیں کیں دوسرے دن باورچی نے پھر وہی چپاتیاں اور قورمہ نواب صاحب کے دسترخوان پر حاضر کیا۔ نواب صاحب نے نہایت برہم ہو کر فرمایا کہ میں تم کو ایک ہنر مند باورچی تصور کرتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ تم چپاتی اور قورمہ کے سوا کچھ نہیں پکا سکتے ہو۔ باورچی نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ قورمہ اور چپاتی شریفوں کا کھانا ہے اور باقی چیزیں نوابوں کے چونچلے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک دوسرا قصہ چینی عورتوں کا سنایا۔ چین کی عورتوں میں کھانے کے بعد ہر مہمان کو ایک چورن کی شیشی دی جاتی تھی کہ خدا نخواستہ اگر کسی مہمان کو کھانے کے بعد بدہضمی ہو جائے تو چورن کھا کر اپنی تکلیف کو دور کرے۔ اس قصہ پر خوب ہنسی ہوئی اور کسی نے کہا کہ آپ کی باتوں نے ہم لوگوں کو ہنسا کر دسترخوان پر ہی کھانا ہضم کر دیا۔ ان سب قصوں کے بعد ذاکر حسین صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں پندرہ سال تک خدابخش لائبریری کی مجلس انتظامیہ کا ممبر رہ چکا تھا اور کتابوں کی خریداری میں مجھ سے بھی مشورہ طلب کیا جاتا تھا۔ اور میرے کہنے پر مسٹر ایس وی سوہنی آئی سی ایس اکثر کتابیں خریدا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ ایک شاہ صاحب کے پاس کلام مجید کا نہایت اچھا قلمی نسخہ ہے جس کی قیمت پانچ ہزار روپے مانگتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ قیمت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ سب باتوں کو سن کر اس کی قیمت لگائیے۔ میں خاموش ہو گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب کی باتوں کو سننے لگا۔ ڈاکٹر صاحب نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت امام حسین جس کرتے میں شہید ہوئے تھے۔ اسی کے کپڑے سے اس کلام مجید کا جزدان بنایا گیا ہے چونکہ جزدان اتنے متبرک کپڑے سے بنایا گیا ہے لہذا دو سو جنات اس نسخہ کے لیے ہمیشہ پہرہ داری کرتے رہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ یہ نسخہ خدابخش لائبریری کے لیے ضرور خریدا جائے کیونکہ لائبریری کو دو سو پہرے دار بلا تنخواہ والے مل جائیں گے۔ اس پر خوب ہنسی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر فرمایا کہ ایک خانقاہی شاہ صاحب کے پاس اونچی استراخانی ٹوپی ہے اور عیدین کے موقع پر اس کو پہن کر نماز کے لیے جایا کرتے ہیں۔ اگر رکوع اور سجود میں ان کے سر سے ٹوپی گرنے لگتی ہے تو دو جنات جو ان کے ساتھ ہمیشہ موجود رہتے ہیں ٹوپی کو گرنے سے بچا لیتے ہیں۔ نہایت ہنسی خوشی سے کھانا ختم ہوا اور ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گھر روانہ ہوئے ڈاکٹر

صاحب کی خوش مذاقی اور خوش گفتاری اکثر یاد آتی ہے۔ ان کے پاس سے ہٹنے کا جی نہیں چاہتا تھا۔



بہار میں پانچ سال گورنر رہنے کے بعد ڈاکٹر صاحب جمہوریہ ہند کے نائب صدر بنائے گئے۔ اس تقرری سے سارے ملک میں لوگوں کو خوشی ہوئی خصوصاً بہار میں تو بڑے اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ سارے صوبے سے ہر طبقہ کے لوگ ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد دینے کے لیے "راج بھون" جانے لگے۔ اور ڈاکٹر صاحب بھی ان لوگوں سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے اور شکریہ ادا کرتے۔ میرے لیے تو "دلی دور است" والا مضمون پیدا ہو گیا۔ اور مجھے پانچ سال سے جو قربت نصیب تھی وہ اب جلد ہی ختم ہونے والی نظر آنے لگی۔ اس کا مجھے افسوس تھا۔ سرکاری اعلان کے دس روز بعد جب میں ڈاکٹر صاحب کو اپنی مبارکباد پیش کرنے گیا تو تقریباً تیس طلبا قدیم و جدید جامعہ ملیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد دینے گئے تھے۔ جامعہ ملیہ کے طلبا تو ڈاکٹر صاحب سے ہمیشہ والہانہ محبت کرتے تھے۔ اور مسلم یونیورسٹی کے طلبا بھی باوجود چند اختلافات کے ان کا نہایت احترام کرتے تھے۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں خوشبودار پھولوں کے گلدستے تھے جن کو ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ سارا کمرہ معطر تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب ان لوگوں سے نہایت شفقت سے باتیں کر رہے تھے۔ اور ہر کا حال دریافت کر رہے تھے۔ جب ملاقات ختم ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے طلبا کے ساتھ برساتی تک آکر ان لوگوں کو رخصت کیا۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی ڈاکٹر صاحب سے اجازت لے کر واپس ہو گیا۔ میں نے بہار میں گوروں اور کالوں کی حکومت کا دور خوب دیکھا ہے۔ بیس سال کے سن سے "گورنمنٹ ہاؤس" جاتا رہا ہوں اور پچاس سال سے ہر گورنر سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے مقابلہ کا کوئی گورنر مجھے نہیں ملا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ "راج بھون" کو ڈاکٹر صاحب جیسا گورنر نہ ملا ہے اور نہ ملے گا۔ بیساختہ زبان سے نکلتا ہے کہ "بسیار خوباں دیدہ ام اما تو چیزے دیگری" میں اس صاف گوئی کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کی ملنساری کا یہ حال تھا کہ جو بھی ان سے ملتا ان کو اپنا سمجھنے لگتا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آ گیا۔

ایک مرتبہ Wheeler Senate Hall میں جرمنی کتابوں کی نمائش ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کو ایک جرمن نوجوان کتابیں دکھا رہا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب اس سے جرمن زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب چلے گئے تو میں نے اس نوجوان سے انگریزی زبان میں پوچھا: " How do you like our Governor " اس نے فوراً جواب دیا کہ: " Excellent. He is one of us.! " ڈاکٹر صاحب کی روانگی کے قبل بہار اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے میدان میں ایک نہایت شاندار الوداعی جلسہ منعقد ہوا جس میں ہر پیشے اور ہر طبقے کے لوگوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی جلسہ

کی صدارت وزیر اعلیٰ نے کی۔ اور ڈاکٹر صاحب کی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے پرزور الفاظ میں کہا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی ذات سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی ہے اور اس معاملے میں ہر شخص ان کا مداح رہا ہے۔ ان کی وسعت نظری، بلند ذوق اور ملنساری سے ہر شخص بہت جلد ان کا گرویدہ بن جاتا ہے۔ صوبہ بہار سے ان کا دیرینہ سروکار رہا ہے اور گزشتہ پانچ سالوں میں ڈاکٹر صاحب نے بہار کے لوگوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اس جلسہ میں اتنی کثیر تعداد میں لوگوں کی شرکت ڈاکٹر صاحب کی ہر دلعزیزی کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے نہایت جذباتی انداز میں کہا کہ ڈاکٹر صاحب جیسے لوگ اب بہت کم ملتے ہیں۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب کی صحت اور کامیابی کی دعا کی اور امید ظاہر کی کہ ڈاکٹر صاحب بہار اور بہار کے لوگوں کو کبھی فراموش نہیں کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں بہار اور بہار کے لوگوں سے اپنی محبت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ گذشتہ پانچ سالوں میں بہار کے ہر چھوٹے بڑے لوگوں نے کل کاموں میں ان سے پورا تعاون کیا ہے جس کے لیے وہ نہایت مشکور ہیں۔ بہار کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ زمانہ قدیم سے اس صوبہ کا بلند مقام رہا ہے۔ اور ہمیشہ سے یہ تہذیب اور تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ قدرت نے اس صوبہ کو معدنیات کے ذخیروں سے مالا مال کر رکھا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جبکہ ان خزانوں کی بدولت بہار جدید دور میں بھی سربلند رہے گا۔ اپنی تقریر کو بہار اور بہار کے لوگوں کے لیے فلاح اور بہبود کی دعا پر ختم کیا۔ جلسہ کے اختتام پر ہر شخص ڈاکٹر صاحب سے مصافحہ کرنے کے لیے بیتاب نظر آرہا تھا۔ اور قریب آدھ گھنٹے تک وہ حاضرین جلسہ سے ملتے رہے۔ میں نے ایسا شاندار الوداعی جلسہ کسی گورنر کے اعزاز میں نہیں دیکھا ہے۔

پبلک جلسہ کے چند دنوں بعد ڈاکٹر صاحب نے "راج بھون" میں اپنی طرف سے ایک الوداعی دعوت دی۔ تقریباً ڈیڑھ سو مہمان رات کے کھانے پر بلائے گئے تھے۔ کھانا ضیافت کے کمرہ (Banquet Hall) میں ہوا۔ یہ کمرہ "راج بھون" میں نہایت خوبصورت کمرہ ہے جس کی دیواریں کاٹھ کے پینل سے مزین ہیں۔ میری دانست میں شاید ہی کسی گورنر نے اس کمرے میں دعوت دی ہو۔ ڈاکٹر صاحب مہمانوں کے خیر مقدم میں مصروف تھے اور کھانا ختم ہونے پر انھوں نے مہمانوں سے ہاتھ ملا کر الوداع کہا۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ آخری دعوت تھی جو "راج بھون" میں ہوئی۔ جب میں اور مسٹر سوہنی گھر جانے کے لیے روانہ ہوئے تو ہم دونوں کی آنکھیں نم تھیں کیونکہ ڈاکٹر صاحب ہم لوگوں سے بہت دور جا رہے تھے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

••

قاضی معز الدین احمد
(سابق مدیر مسئول تہذیب الاخلاق علیگڑھ)
مظفر منزل، تار بنگلہ، علیگڑھ

ذاکر صاحب

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز

انیسویں صدی میں ہندوستان میں جدید علوم کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو ملکی حالات کے تحت مسلمانوں نے بھی جدید علوم حاصل کرنے کی طرف قدم اٹھایا لیکن جدید تعلیم مسلمانوں میں مقبول نہ ہوئی اور اسکول اور کالج کے ساتھ ساتھ دار العلوم بھی قایم رہے۔ مسلمانوں کے نظام تعلیم کی بنیاد دینی علوم پر رہے۔ ایسی تعلیم جس کا انکی معاشرت کی بنیاد سے کوئی تعلق نہ ہو، وہ کیسے خوش دلی سے قبول کر لیتے؟ لیکن وقت کی ضرورت کو بھی کس طرح نظر انداز کیا جا سکتا تھا؟ چنانچہ ملازمت پیشہ اور رئیسوں کے لڑکے جدید تعلیم حاصل کرنے لگے۔ تحریک آزادی شروع ہوئی تو انھوں نے جدید و قدیم نظام تعلیم کو یکجا کر کے ایک نیا نصاب تعلیم تیار کیا اور ایک نئی درس گاہ "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کے نام سے قایم کی۔ اس زمانہ میں راقم کو کسی اچھی درسگاہ میں داخل کرنے کا مسئلہ زیر غور تھا۔ جامعہ ملیہ کے قیام کی خبر اخبارات میں دیکھ کر اس درس گاہ کو راقم کے لئے منتخب کیا گیا۔

جامعہ ملیہ کے ابتدائی درجات میں چند ہی طالب علم تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان میں سے ایک محمود حسین خاں تھے ان سے راقم کی بڑی دوستی ہو گئی۔ دن کا کچھ حصہ انہی کے ساتھ گزرتا۔ ان دنوں ملک کی اور خصوصاً "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کی فضا پر تحریک آزادی کا جوش و خروش غالب تھا۔ جامعہ کا ہر شخص اس سے متاثر تھا، اور ہر وقت سیاسی حالات پر اپنی بصیرت کے اعتبار سے تبصرہ کرتا رہتا تھا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں پر مذہب کا بڑا غلبہ ہوا۔ جو داڑھی منڈھاتے تھے، انھوں نے داڑھی رکھ لی۔ جو انگریزی لباس استعمال کرتے تھے، انھوں نے کوٹ، پتلون، ہیٹ اور شو کا استعمال ترک کر دیا۔ انگریزی بال بھی ترشوا دیے گئے۔ کرتا، پجامہ، اچکن یا صدری جو بعد میں جواہر کٹ کہلانے لگی اور پیروں میں چپل، ان کے جسم پر نظر آنے لگا۔ جامعہ ملیہ کے اساتذہ اور دیگر ملازمین سب ہی ایک سی وضع قطع کے ہو گئے۔ سیاہ گھنی داڑھی، سفید کھدر کا لباس اور سر پر گاندھی ٹوپی۔ بڑے با اخلاق، بے حد مخلص، اسلام اور ہندوستان کی محبت میں سرشار، انگریزوں کے

دشمن، آزاد وطن کے شیدا۔ بس کیا کہا جائے، فرشتے اگر انسان کی صورت میں نمودار ہوتے تو انھیں جیسے ہوتے۔ ان سب حضرات میں ایک صاحب کو خصوصیت حاصل تھی۔ وہ آتے تو ان کی طرف سب ہی متوجہ ہو جاتے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے سب ہی ان کے انتظار میں ہوں۔ ہر شخص ان کا گرویدہ نظر آتا۔ راقم تو اسکول کا طالب علم تھا اور جامعہ میں نوادر تھا اس کو ان بزرگ سے کیا دلچسپی ہوتی، بس اتنا معلوم ہو گیا کہ ان کا نام ذاکر حسین ہے اور پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ میرے دوست محمود خاں کے یہ بڑے بھائی ہیں۔ مختصر یہ کہ محمود صاحب کی وجہ سے راقم کا ذاکر صاحب اور یوسف حسین خاں سے تعارف ہو گیا، اور یہ تعلق برابر قایم رہا اور بڑھتا ہی گیا۔

ذاکر صاحب جامعہ میں اعلیٰ تعلیم کی کسی جماعت کو پڑھاتے تھے۔ اسکول کے بچوں کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ ان کو بھی وہ پڑھائیں۔ یہ آرزو ایک بار پوری ہو گئی۔ اس دور میں جیسا کہ لکھ چکا ہوں کہ اساتذہ کو سیاست سے دلچسپی زیادہ اور تعلیم کی طرف توجہ کم تھی، اساتذہ سیاسی کاموں کے سلسلے میں کہیں جاتے تو جامعہ سے آسانی سے چھٹی مل جاتی، اور ٹائم ٹیبل بدل جاتا۔ جانے والے صاحب کی جگہ کوئی اور آجاتا۔ ایک بار نظام اوقات بدلا تو دیکھا کہ کلاس لینے والوں میں ذاکر صاحب کا نام ہے۔ ان کا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، لیکن ذاکر صاحب نے چند بار کلاس لی اور پھر ٹائم ٹیبل بدل گیا۔ کوئی اور صاحب پڑھانے آگئے۔

جامعہ کے طلبا اور اساتذہ علی گڑھ کی مختلف کوٹھیوں میں رہتے تھے۔ ذاکر صاحب کا قیام بنگالی کوٹھی میں تھا۔ یہ کوٹھی اب بھی ہے، لیکن کافی بدل گئی ہے۔ جامعہ کا دفتر جس کوٹھی میں تھا اور کلاسیں جہاں ہوتی تھیں، اس کا نام نشاط تھا۔ اسی کوٹھی کے میدان میں ایک ہال کچی مٹی کا جس پر معمولی چھپر ڈالا گیا تھا، تعمیر کر لیا گیا تھا۔ جو ڈائننگ ہال کا بھی کام دیتا تھا، اور اسی میں جلسے بھی ہوتے تھے۔ اس ہال کا محمد علی ہال نام رکھا گیا تھا۔ جامعہ ملیہ کا پہلا کانوکیشن Convocation اسی ہال میں منعقد ہوا۔ حکیم اجمل خاں نے خطبہ دیا۔ ذاکر صاحب نے ایک تقریر کی۔ ذاکر صاحب اور حکیم صاحب نے کیا کہا یہ تو یاد نہیں بس اتنا یاد ہے کہ ذاکر صاحب کی تقریر کی بہت تعریف ہوئی اور حاضرین اس سے بہت متاثر ہوئے۔ ذاکر صاحب کی یہی خصوصیت تھی۔ ہر موقع پر وہ لوگوں کو اپنی تحریر، تقریر اور گفتگو سے متاثر کرتے تھے۔ معمولی بات بھی خاص انداز سے کرتے۔ ان کا ہر لفظ دل کو گرماتا۔ سننے والوں کی خواہش ہوتی کہ وہ بولے جائیں اور ہم سُنے جائیں۔

محمد علی ہال میں ہر کھانے اور ناشتہ پر سب طلبا جمع ہو جاتے۔ زمین پر دسترخوان بچھ جاتا اور سب بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ ذاکر صاحب اکثر صبح کے ناشتہ میں شرکت کرتے، اور حسب معمول دلچسپ باتیں ہوتیں۔ ایک دن خیال ہوا کہ جامعہ میں ڈبیٹنگ سوسائٹی نہیں ہے، وہ ہونی چاہیئے۔ اس خیال کا اظہار سعید انصاری صاحب ندوی سے کیا۔ انھوں نے بڑی سرگرمی سے

اس خیال کی تائید کی۔ جامعہ میں چند روز اس کا چرچہ رہا۔ ایک روز جلسہ کا نوٹس آگیا، اور ایک ڈیبٹنگ سوسائٹی قائم ہوگئی۔ اسکول کے طلبا نے سب سے پہلے تقریریں کیں، پھر کالج کے طلبا بولے۔ ڈاکٹر کنور محمد اشرف نے جو تحریک آزادی کے آخری دور میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے رکن تھے اور بعد میں کمیونسٹ پارٹی میں شریک ہوگئے تھے بڑی جوشیلی تقریر کی۔ ذاکر صاحب کی آخر میں تقریر ہوئی۔ ان کی بڑی ٹھنڈی تقریر تھی۔ انھوں نے حاضرین کو ہر مسئلہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ دونوں تقریریں حاضرین کو پسند آئیں، لیکن ذاکر صاحب کی تقریر کی حلاوت نے سب کو مسحور کیا۔

ذاکر صاحب بہت صاف ستھرے کپڑے پہنتے۔ ان کے کپڑوں پر شکن کبھی نہیں دیکھی گئی۔ گرمی ہو یا سردی اچکن کے سب ہی بٹن لگاتے کا اہتمام رکھتے، کوئی دوسرا لباس جسم پر کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ان کے جسم پر صدری گھر کے باہر کبھی نہیں دیکھی۔ جرمنی میں قیام کے دوران انھوں نے سوٹ تو پہنا لیکن داڑھی کبھی نہیں منڈوائی۔ ان کے دوستوں سے سنا ہے کہ جرمنی میں ان سے شیو کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ ان کا جواب تھا: "داڑھی سے مجھے انسیت نہیں شیو بھی کر سکتا ہوں، لیکن روز صبح یہ ورزش کرنا بار معلوم ہوتا ہے۔" ذاکر صاحب اچکن کے بٹن لگانا تہذیب کی علامت خیال کرتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ اچکن پہنو تو بٹن ضرور لگاؤ۔ ذاکر صاحب نصیحت کم کرتے تھے۔ دوسروں کی اصلاح اپنے عمل سے کرتے لیکن جب محسوس کرتے کہ بلا فہمائش کام نہ چلے گا تو بڑے طنزیہ انداز میں ٹوکتے۔ ان کے طنز میں بھی ایک لطف ہوتا اور نصیحت کی تلخی قابل برداشت ہو جاتی۔ راقم کو دو بار بڑی ندامت کا سامنا کرنا پڑا۔ میری اچکن کے چند بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ذاکر صاحب نے دیکھا تو تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے تشریف لائے اور بٹن لگا دیے۔ میں نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ دوسری مرتبہ بھی یہی ہوا۔ ذاکر صاحب نے بٹن لگا کر فرمایا کہ یہ بٹن لگانے کے لیے ہوتے ہیں، ان کو لگا لینا چاہئے۔ ذاکر صاحب اپنے نیازمندوں کو یاد رکھتے تھے۔ راقم کو ان سے ملنے کا کافی وقفہ کے بعد موقع ملتا تھا۔ وہ جب بھی ملتے بڑے خلوص سے ملتے۔ دور کہیں دیکھ لیتے تھے تو بھی متوجہ ہو جاتے ہاتھ ملاتے، حال دریافت فرماتے، اور وہ سب سوال کرتے جو کسی صاحب تعلق کو کرنے چاہئیں۔ ایک بار اپنے دوست مشہور سائنسداں سلیم الزماں صاحب لکھنوی ثم کراچوی سے ملنے ان کی قیام گاہ واقع ترکمان روڈ نئی دہلی تشریف لائے۔ یہ آزادیٔ وطن سے پہلے کا واقعہ ہے۔ گرمی کا موسم تھا۔ خوب دھوپ پڑ رہی تھی۔ راقم کناٹ پلیس سے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا اور ترکمان روڈ کے دوسرے سرے پر تھا۔ دور سے دو سفید پوش حضرات کو دیکھا۔ تھوڑا آگے بڑھا تو پہچانا کہ ایک ان میں سے ذاکر صاحب ہیں۔ ذاکر صاحب کے رفیق تو مکان میں داخل ہوگئے، لیکن ذاکر صاحب سڑک پر ہی کھڑے رہے۔ راقم قریب پہنچا تو سائیکل سے اترا۔ ذاکر صاحب کو سلام کیا۔ حسب معمول وہ ملے

اور چند سوالات کیے۔ راقم کی مصروفیات کے بارے میں معلوم کرکے فرمایا: "عزیز جو کچھ کرو محنت سے کرو۔ کامیابی محنت سے ہی کام کرنے میں ہوتی ہے۔"

۱۹۴۷ء میں دلی اور پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے۔ شمالی ہند کے دوسرے شہروں میں بھی اقلیت محفوظ نہ تھی۔ مسلمان ترک وطن کر رہے تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ راقم صفدر جنگ ہوائی اڈے پر ایک دوست کے انتظار میں کھڑا تھا۔ یکایک دیکھا کہ ذاکر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ راقم نے سلام کیا۔ ذاکر صاحب مسکراتے ہوئے راقم کی طرف بڑھے اور بڑی ہمدردی اور شفقت سے فرمایا: "کیسے آئے ہو؟ کیا جا رہے ہو؟" میں نے عرض کیا "نہیں دلی نہ چھوڑوں گا۔ ترک وطن کا کوئی ارادہ نہیں" پھر فرمایا "انشا اللہ نیا گھر بنائیں گے، اور پہلے سے اچھا بنائیں گے۔ میں اپنے وطن ہی میں رفیوجی تھا۔ گھر لٹ چکا تھا۔ خاندان کے لوگ پاکستان جا چکے تھے" ذاکر صاحب کے ہمدردی کے الفاظ سے تو آنکھیں بھر آئیں۔

آزادیٔ ہند سے پہلے ذاکر صاحب جہادِ آزادی کے ایک سپاہی تھے۔ گو محترم سپاہی تھے لیکن تھے سپاہی۔ نہ گورنر نہ صدر مملکت۔ ملنے جلنے کے تکلفات سے بالاتر۔ اپنے دوستوں اور نیازمندوں سے بے تکلفی سے ملتے اور باتیں کرتے تھے۔ ذکر ۴۳-۱۹۴۲ء کا ہے۔ وہ اکثر علی گڑھ آتے تھے اور جب بھی آتے اپنے دوست رشید احمد صدیقی کے مکان پر قیام کرتے۔ رشید صاحب اس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی میں اردو زبان کے لکچرار تھے نہ ریڈر نہ پروفیسر اور یونیورسٹی کے ایک معمولی کوارٹر میں رہتے تھے۔ ذاکر صاحب آتے تو ان سے ملنے ان کے ہم مسلک چند طلبا اور اساتذہ ہی آتے۔ نہ کوئی خان بہادر آتا تھا نہ شمس العلما آتا، اور نہ کوئی کوٹھی نشیں صاحب کار ان کا دوست آتا۔ آنے والوں میں قابل ذکر مولانا ابوبکر شیث، ناظم دینیات، عظمت الٰہی زبیری جو اس وقت نائب رجسٹرار تھے اور اسی دور میں رجسٹرار ہو گئے تھے، حمید الدین خاں استاد فارسی تھے۔ ذاکر صاحب کے کوٹھی نشیں دوست اگر کبھی ان سے ملنے رشید صاحب کے یہاں آ جاتے تو ہم سب کو تعجب ہوتا۔ یہ سب حضرات پیوند خاک ہو گئے۔ آج ان میں سے کوئی نہیں، نہ جامعہ والے نہ مسلم یونیورسٹی والے۔ اللہ مغفرت فرمائے۔ ؎

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم   تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کئے

رشید صاحب کے یہاں شام کو محفل جمتی۔ گپ شپ کا سلسلہ دیر تک جاری رہتا۔ راقم کبھی تنہا اور کبھی دوستوں کے ساتھ ذاکر صاحب سے ملنے جاتا۔ اور اکثر سب سے پہلے پہنچتا۔ ذاکر صاحب کو دالان میں لیٹا ہوا پاتا۔ وہ ہمیں دیکھ کر اٹھ بیٹھتے۔ پھر ہم سب مونڈھے اٹھا کر باہر چبوترے پر آ بیٹھتے۔ ذاکر صاحب کی جامعہ کے سلسلہ میں کوششوں کا اور ملک کے سیاسی حالات کا ذکر ہوتا۔ اور ذاکر صاحب اپنے تاثرات بیان فرماتے۔

اور جامعہ کے چندہ کے سلسلے میں اپنی جدوجہد کا ذکر کرتے۔ یہ وقت بہت دلچسپی سے گزرتا۔ اس کی یاد اب تک تازہ ہے۔ ایک بار ذاکر صاحب کی طبیعت جولانی پہ تھی کہنے لگے "آپ میں سے کوئی صاحب فلاں مولانا کے معتقد تو نہیں؟" ہمارے جواب کا انتظار کئے بغیر فرمایا "مولانا کی دلیلیں خوب ہوتی ہیں۔ ہوائی جہاز اُڑ گیا تو گویا خدا کی فتح ہو گئی اور اگر نہ گرتا تو سائنسدانوں کی فتح ہو جاتی اور شکست کیا (نعوذ باللہ) خدا کی ہوتی؟" پھر فرمایا کہ "مولانا ایک مرتبہ ہمسفر تھے۔ کسی کانفرنس میں شرکت کیلئے ہم لوگ گئے تھے۔ مولانا جانماز ایسی جگہ بچھاتے جہاں چار آدمی بیٹھے ہوں۔ مولانا نے گاندھی کیپ کھول کر اونچی باڑ کر رکھی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کی باڑ بیٹھ جاتی تو پھر اٹھاتے تھے۔ مولانا کی اس کوشش کی طرف لوگ متوجہ ہو گئے اور سب نے مسکرانا شروع کر دیا۔"

۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا انتخاب ہوا تھا۔ انتخاب کرنے کا حق یونیورسٹی کورٹ کو تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین اور نواب اسمٰعیل خاں میں مقابلہ تھا۔ ڈاکٹر ضیاءالدین کی حمایت حکومت کر رہی تھی۔ خود وائسرائے ہند انتخاب میں دلچسپی لے رہا تھا۔ سرکاری ملازمین کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ ڈاکٹر ضیاالدین کو ووٹ دیں۔ نواب اسمٰعیل خاں کی حمایت نیشنلسٹ کر رہے تھے۔ ذاکر صاحب انتخاب میں سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے، اور الکشن میں بڑی ہماہمی پیدا ہو گئی تھی۔ کورٹ کے ممبروں میں حکومت کے آدمی زیادہ تو نہ تھے لیکن ڈر یہ تھا کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کے مخالف بھی ان کو ووٹ دینے پر مجبور کئے جائیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین جیت گئے۔ نتیجہ کا اعلان ہوا تو ان لوگوں کو بہت افسوس ہوا جنھوں نے حکومت کی ہدایت کے تحت مجبوراً ڈاکٹر ضیاء کو ووٹ دیا تھا۔ نتیجہ نکلا تو ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ سجاد حیدر یلدرم بھی انہی میں سے تھے۔ ذاکر صاحب نواب اسمٰعیل خاں کی ناکامی پر بہت افسردہ تھے۔ نتیجہ کے اعلان کے بعد راقم رشید صاحب کے یہاں گیا۔ رشید صاحب، ذاکر صاحب اور دو ایک اور حضرات کمرہ میں بیٹھے تھے۔ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ راقم نے خاموشی توڑی۔ الکشن کے بارے میں ایک سوال کیا۔ ذاکر صاحب جو گردن جھکائے بیٹھے تھے بولے۔ وائس چانسلر کے انتخاب کا حق کورٹ کو نہیں، ایگزیکیوٹیو کانسل کو ہونا چاہیئے۔ کورٹ میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں انھیں کیا معلوم کہ یونیورسٹی کے کیا مسائل ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد حالات کے مطالبہ کے تحت مسلم یونیورسٹی کا ۱۹۲۰ء کا ایکٹ بدلا تو وائس چانسلر کے انتخاب کا حق ایگزیکیوٹیو کانسل کو دیا گیا۔ دوران گفتگو ذاکر صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ ملک میں ایک ایسا ادارہ ہونا چاہیئے جو ملک کی سب یونیورسٹیوں کو ایک سلسلہ میں منسلک کرے۔ معیار تعلیم سب کا ایک ہو، اور وہ ادارہ یونیورسٹیوں کے تعلیمی اور مالی مسائل بھی حل کرے۔ یو۔ جی۔ سی کا قیام ممکن ہے ذاکر صاحب کے مولانا آزاد کو مشورہ کا نتیجہ ہو۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم جب علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدہ سے مستعفی ہوکر دہلی واپس تشریف لائے تو وہ جامعہ ملیہ میں جس کے وہ بانیوں میں سے تھے واپس نہ آئے تھے بلکہ اپنے گھر واپس آئے تھے۔ ان کی اس فرصت کے دور سے ان کے نیازمندوں نے فائدہ اٹھایا۔ خواہش ہوئی کہ ذاکر صاحب سے درخواست کی جائے کہ راقم کے بڑے لڑکے فواد محمود خرم (خرم فواد محمود کا گھر کا نام ہے) کی بسم اللہ کی رسم وہ ادا فرمادیں۔ ایک بچہ کی بسم اللہ عام طور پر چار سال چار ماہ پر ہوتی ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر بچہ کی اس عمر پر ہوتی ہو۔ اس سے پہلے یا بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔ پھر اس رسم کی ادائگی میں کیوں تاخیر کی جائے۔ ذاکر صاحب جیسا محسن کہاں اور کب ملے گا اور نہ معلوم ذاکر صاحب کی مستقبل کی مصروفیات اس کا موقع دیں گی بھی یا نہیں۔

خرم سلمہٗ کی نانی مرحومہ کا قیام اس دور میں جامعہ ہی میں تھا۔ چنانچہ مرحومہ نے ذاکر صاحب سے درخواست کی اور ذاکر صاحب نے بخوشی اس کو قبول فرمایا اور اس رسم کی ادائگی کے وقت کا تعین ہوا۔ ذاکر صاحب نے خرم سلمہٗ سے پہلے بسم اللہ پڑھوائی۔ پھر سورہ العلق کی پہلی آیت پڑھوائی پھر خرم سلمہٗ کی انگلیوں میں قلم پکڑوا کر رحمٰن۔ رام۔ گاڈ لکھوایا۔ مٹھائی کی ایک ڈلی دی اور پھر جرمن زبان کی ایک کتاب پر یہ دعائیہ تحریر لکھ کر خرم سلمہٗ کو کتاب عنایت فرمائی:

عکسِ تحریر

خرم میاں سلمہٗ کو ان کے پہلے
سبق کے موقع پر یہ [illegible] کی
کتاب دی گئی۔
خدا ان کی عمر میں برکت دے
علم اور نیک سیرت کی دولت
سے مالا مال کرے۔
ذاکر
۹/۹-۵۶

اس جرمن کتاب کے سرورق کا عکس بھی ملاحظہ ہو جو ذاکر صاحب نے خرم سلمہ کو عنایت فرمائی تھی:



الحمدللہ اللہ نے ذاکر صاحب کی دعا قبول فرمائی۔ خرم سلمۂ اب ایک ریلوے کے ذمہ دار اونچے عہدہ پر فائز ہیں اور اپنی ذہانت اور شرافت کے لیے اپنے حلقہ میں متعارف ہیں۔

جامعہ ملیہ کے نصاب میں عربی زبان کی بڑی اہمیت تھی اور ابتدائی درجات ہی سے عربی پڑھانا شروع کر دیا جاتا تھا۔ ذاکر صاحب سے ایک بار اس کا ذکر آیا۔ ذاکر صاحب نے فرمایا عربی بہت مشکل زبان ہے۔ طالب علم عربی پڑھتا ہے تو دوسرے مضامین کے مطالعہ کے لیے وقت نہیں نکال سکتا۔ جامعہ میں عربی اب بھی پڑھائی جاتی ہے لیکن اب نصاب میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔

ایک نشست میں مسلمانوں کی تعلیم کا ذکر ہو رہا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مالی حالت کا بھی ذکر آیا۔ انگریزوں کے دور میں مسلم یونیورسٹی کے اخراجات کے لیے چندہ جمع کیا جاتا تھا۔ ملک کو آزادی ملی تو یونیورسٹی کے تمام اخراجات کی ذمہ داری حکومت نے لے لی۔ راقم نے کہا "اچھا ہوا کہ اب یہ بار حکومت اٹھائے گی اور یونیورسٹی ترقی کرے گی۔" ذاکر صاحب نے فرمایا "یونیورسٹی کو چندہ اب بھی جمع کرنا چاہیے۔ ایسا کرنے سے مسلمانوں کا تعلق یونیورسٹی سے قائم رہے گا جس کی ضرورت ہے۔"

ذاکر صاحب کی زندگی کے سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ذاکر صاحب بہت بدپرہیز اور خوش خوراک تھے۔ راقم کو اس کا تجربہ پہلی بار رشید صاحب کے یہاں ہوا۔ ایک روز صبح ہی رشید صاحب کے یہاں چلا گیا تھا۔ دیکھا تو رشید صاحب زمین پر بیٹھے کچھ دھو رہے تھے۔ تخت پر دسترخوان بچھا تھا۔ کباب، قیمہ، انڈے، مکھن، بالائی وغیرہ وغیرہ سب کھانوں کی طشتریاں سجی ہوئی تھیں۔ رشید صاحب نے راقم کو دیکھا تو فرمایا آؤ بیٹھو۔ ذاکر صاحب تو غائب ہیں۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ میں نے عرض کیا "کہاں گئے ہیں؟" رشید صاحب بولے کہاں جاتے، اپنے انہی دوست کے یہاں گئے ہوں گے۔ اتنے میں ذاکر صاحب قدم بڑھاتے ہوئے مکان میں داخل ہوئے۔ راقم نے کہا "لیجیے آ تو گئے ہیں۔" رشید صاحب بولے "ان سے اب پوچھیے کہ کہاں گئے تھے۔" ذاکر صاحب ہنسنے لگے۔ راقم ایک طرف کو بیٹھنے لگا تو ذاکر صاحب نے ناشتہ میں شرکت کی دعوت دی۔ رشید صاحب بولے "ذاکر صاحب کا یہ پرہیزی ناشتہ ہے۔ آپ بھی شریک ہو جائیے۔"

ذاکر صاحب کی بدپرہیزی کے دلچسپ قصے ہیں۔ مسعود احمد عباسی صاحب میرے ایک عزیز دہلی میں رہتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے قتل و غارت گری کے زمانہ میں مظلوموں کی امداد کے کاموں میں دلچسپی لے رہے تھے۔ ایک روز راقم کے مکان پر تشریف لائے اور اپنی کارگزاریوں کی داستان سنائی۔ اسی زمانہ میں جامعہ ملیہ کا ایک رفیوجی کیمپ ہمایوں کے مقبرہ میں لگا ہوا تھا۔ ذاکر صاحب کا کافی وقت اسی کیمپ میں صرف ہوتا تھا۔ دوپہر کا کھانا وہ کبھی کبھی عباسی صاحب کے یہاں کھا لیتے تھے۔ عباسی صاحب نے راقم سے

دوران گفتگو فرمایا کہ ذاکر صاحب آج دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیں گے۔ تم میرے ساتھ چلو کھانا وہیں کھانا۔ دلچسپ باتیں ہوں گی۔ ذاکر صاحب کی بد پرہیزی کا علم سب کو تھا۔ عباسی صاحب نے بھی اس کا ذکر کیا۔ لیکن یہ بھی کہا کہ کھانا بد پرہیزی نہ ہوگا۔ اطمینان رکھو۔ ذاکر صاحب کے ملنے والے نہ تو ان کو پرہیزی کھلاتے تھے اور نہ ہی پرہیزی غذا ذاکر صاحب خود رغبت سے کھاتے تھے۔ چنانچہ عباسی صاحب نے بھی بد پرہیزی کرانے کا پورا انتظام کیا ہوا تھا۔ ذاکر صاحب تشریف لائے دیر تک فسادات کا ذکر رہا اور کھانا خوب پیٹ بھر کے کھایا۔

ذاکر صاحب کی بد پرہیزی کا ذکر شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی آنجہانی ذاکر صاحب کے رفیق اور ادارہ تعلیم و ترقی کے سربراہ سے ہوا تو انھوں نے سنایا کہ جرمنی سے واپسی کے بعد ذاکر صاحب کے ساتھ ان کو دہلی کے مشہور بازار چاندنی چوک جانے کا اتفاق ہوا۔ چاندنی چوک میں ایک بینک کی سیڑھیوں پر ایک 'دہی بڑے' والا بیٹھتا تھا۔ اس کے 'دہی بڑے' بہت مشہور تھے۔ ذاکر صاحب اس دہی بڑے والے کے پاس سے گزرے تو کہنے لگے۔ بھئی 'دہی بڑے' کھانے کو دل چاہتا ہے۔ شفیق صاحب کہتے تھے کہ انھوں نے کہا کہ دہی بڑے لے چلتے ہیں۔ گھر چل کر کھالیجئے گا۔ ذاکر صاحب کا جواب تھا کہ دہی بڑے کھانے کا تو یہی مزہ ہے۔ چنانچہ بازار کی طرف پیٹھ کر کے وہیں بیٹھ گئے اور دہی بڑے کھائے۔ شفیق صاحب نے بتایا کہ ذاکر صاحب سفر میں کبھی اسٹیشنوں پر چاٹ لے کر کھاتے جاتے ہیں۔

ذاکر صاحب جرمنی سے واپس آئے تو تعلیم و ترقی کی بہت سے تجاویز ذہن میں ساتھ لائے۔ سب سے پہلے جامعہ ملیہ کے ابتدائی مدرسہ کی ترقی کی طرف توجہ کی ایک جرمن خاتون کو بچوں کی تربیت و تعلیم کے لیے بلایا۔ جامعہ کے اس اسکول نے بہت ترقی کی اور دہلی میں مشہور ہو گیا۔ ان مسلمانوں نے بھی اپنے بچوں کو اس اسکول میں داخل کرایا جو ذاکر صاحب سے سیاسی اختلاف رکھتے تھے۔ جامعہ کا یہ قرول باغ کا دور تھا۔ ذاکر صاحب ہمہ وقت بچوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہتے۔ راقم شام کے وقت جامعہ جاتا تو ذاکر صاحب کو بچوں کے ہوسٹل میں پاتا۔ وہ ایک وقت کی نماز بچوں کے ساتھ جماعت سے ادا کرتے۔ اکثر یہ مغرب کا ہوتا۔

ملک کے سیاسی حالات اس دور میں ایسے تھے کہ مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک وہ جو تحریک آزادی کے بارے میں کانگریس کے نقطہ نظر کی حمایت کرتا تھا۔ اور دوسرا وہ جو کانگریس کے لیڈروں کے نقطہ نظر سے اختلاف رکھتا تھا۔ دہلی میں ذاکر صاحب اس دور میں تقریباً اجنبی تھے۔ مسلمانوں کے اجتماعات میں ذاکر صاحب کی تقاریر ہونا شروع ہوئیں تو وہ بہت مقبول ہو گئے۔ ذاکر صاحب کی تقریروں

اور جامعہ ملیہ کی تحریک کا یہ نتیجہ ہوا کہ چند تعلیم یافتہ نوجوان جامعہ ملیہ کی خدمت کے لیے تیار ہو گئے۔ ان میں سے ایک بچوں کے ادیب و شاعر شفیع الدین نیر تھے جو نئی دہلی کے موڈرن اسکول میں اردو کے ٹیچر تھے اور معقول تنخواہ پاتے تھے۔ جامعہ کے ستر، اسّی روپے ماہانہ انھوں نے قبول کئے اور اپنی کئی سو روپے ماہانہ کی ملازمت ترک کر دی۔ دوسرے ایک نوجوان تھے جنھوں نے سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی سے ام۔ اے کیا تھا۔ وہ بھی جامعہ میں پڑھانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اور برسوں ذاکر صاحب اور ان کے رفقا کے ساتھ عسرت کی زندگی گزاری۔ یہ نوجوان عبدالرزاق صاحب اب بوڑھے ہو گئے ہیں اور جامعہ ملیہ سے سبکدوش ہو کر جامعہ سے متصل ایک لڑکیوں کا اسکول چلا رہے ہیں۔ یہ ذاکر صاحب کے گرویدہ رہے ہیں۔ ان سے باتیں کیجیے تو محسوس ہوگا کہ 'مرشد' (رشید احمد صدیقی ذاکر صاحب کو 'مرشد' کہتے اور لکھتے تھے) کے ایک مخلص عقیدت مند سے گفتگو ہو رہی ہے۔

ذاکر صاحب کی دوسری اہم خدمت تعلیم بالغاں کی تحریک کا اجرا تھا۔ ایک روز راقم جامعہ گیا تو معلوم ہوا کہ تعلیم بالغان کا سلسلہ شروع ہوا ہے اور خاصا کامیاب ہے، البتہ پولیس حرکت میں آگئی ہے۔ اور تحریک کی نگرانی کر رہی ہے۔ انگریزوں کے دور میں تحریک آزادی کے ہمدرد جو کام بھی کرتے تھے حکومت کو ڈر ہوتا تھا کہ وہ کہیں اسکے خلاف کوئی پروپگنڈے کا ذریعہ نہ ہو۔ چنانچہ اس تحریک کی بھی ابتدائی دور میں نگرانی ہوئی۔ یہ تو یاد نہیں کہ تعلیم بالغان کا آغاز کس کی نگرانی میں ہوا، لیکن یہ دیکھا کہ اس تحریک نے بہت ترقی کی۔ شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی کی نگرانی میں یہ ملک گیر ہوتی جا رہی تھی۔ دہلی میں مٹیا محل مسجد پر ذاکر صاحب کی ہدایت پر ایک مرکز قائم ہوا تھا۔ تعلیم بالغان کے سلسلہ میں کتابچے اور پوسٹر شائع ہوتے تھے۔ آزاد ہندوستان میں شفیق الرحمٰن صاحب کو امید ہوئی کہ یہ کام اور بڑھے گا۔ اس تحریک کی ایک اسکیم بھی تیار ہو گئی لیکن یکایک معلوم ہوا کہ تحریک بند کر دی گئی۔ شفیق صاحب سے دریافت کیا تو بجز ٹھنڈا سانس لینے کے کوئی جواب نہ ملا۔ ذاکر صاحب سے دریافت کیا تو انھوں نے ٹالنے کیلئے جواب یہ دیا کہ اب ملک آزاد ہے۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ تعلیم عام کرے۔ کچھ پتا نہ چلا کہ اتنا اہم اور مفید کام کیوں بند کر دیا گیا۔ عرصہ بعد محسوس ہوا کہ جب عربک کالج کا نام بدلنا پڑا، مسلم یونیورسٹی کا ۱۹۲۰ء کا ایکٹ تبدیل ہوا، اور کلکتہ کے سرکاری اسلامیہ کالج کا انتظام باقی نہ رہا تو پھر ادارہ تعلیم و ترقی کیسے اپنا کام جاری رکھتا۔

تقسیم ہند کے نتیجہ میں اکثریت کا مطالبہ تھا کہ جب ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان بن گیا ہے تو پھر مسلمانوں کے علیحدہ تعلیمی اداروں کی کیا ضرورت رہی۔ حکومت اکثریت کو بھی مطمئن کرنا چاہتی تھی اور مسلمانوں کی

درس گاہوں کو بھی محفوظ رکھنا چاہتی تھی اس لیے اس نے مسلم اداروں کے سلسلے میں چند اقدامات کئے۔ اس مضمون میں تفصیلات لکھنا غیر موزوں ہوگا۔ بس جو کچھ عرض کیا جاچکا ہے، امید ہے کہ کافی ہوگا۔ انہی حالات میں مسلم درسگاہوں کے ناموں اور نظام میں وہ تبدیلیاں کی گئیں جن کا ذکر کیا گیا ہے۔

جامعہ کے ابتدائی دور میں عید کارڈ شائع کئے گئے تھے۔ ان کے اشعار ذاکر صاحب اور ان کے رفقائے کار کے دل کی دھڑکن ہوتے تھے۔ ایک شعر جو راقم کو یاد ہے، پیش خدمت ہے ؂

اس مزرعِ عالم کو سینچو تم جد و جہد کی بارش سے جو بیج عمل کا بوتا ہے، پھل رحمت کا وہ پاتا ہے

ذاکر صاحب ملت کے مستقبل کی تعمیر کے خواب دیکھتے تھے۔ انھوں نے وطن کے مستقبل کی تعمیر کے خواب بھی دیکھے۔ وہ نئے ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر میں خونِ جگر صرف کر سکتے تھے لیکن ان کی زندگی کا آخری دور ایسی خدمت میں صرف ہوا جہاں نہ جد و جہد کی ضرورت تھی نہ فکر و عمل کی۔ افسوس آزاد ہندوستان کو ان کی زندگی سے کوئی فائدہ نہ پہونچا، اور وہ گوہر تابناک نہ رہا ؂

ہوشیاروں میں تو اِک اِک سے سوا ہیں اکبر
مجھ کو دیوانوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا

●●

جناب شہاب الدین دسنوی

(سابق ڈائرکٹر انجمن اسلام، بمبئی)
تاج منزل۔ ٹی۔ این۔ بنرجی روڈ، پٹنہ

ذاکر صاحب ــــــ کچھ یادیں

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی سنہ ۱۹۴۶ء کے آخر میں منائی جانے والی تھی۔ اس وقت تک اس ادارے کو نہ سرکاری منظوری حاصل تھی نہ مالی اعانت۔ جامعہ کے ارباب حل و عقد نے عوام کو ادارے کے کاموں سے روشناس کرانے اور اس کی مالی حالت استوار کرنے کی خاطر، فنڈ کی فراہمی کے لیے بمبئی میں ایک تعلیمی نمائش کا انتظام کیا اور ساتھ ہی عطیات کی اپیل کی۔ نمائش کہاں کی جائے؟ مجھ سے مشورہ ہوا تو میں نے اپنے انسٹی ٹیوشن (محمد حاجی صابو صدیق ٹکنکل انسٹی ٹیوشن) کے سنٹرل ہال اور گیلری کی تجویز پیش کی جو منظور ہو گئی۔ مرحوم شفیق الرحمٰن قدوائی اس نمائش کے نگراں تھے۔ شفیق صاحب اور ڈاکٹر ذاکر حسین بمبئی پہنچ کر دن بھر شہر کے مختلف باحیثیت شخصیتوں سے ملاقات کر کے عطیات جمع کرنے لگے۔ ان کی رہنمائی زیادہ تر ذاکر صاحب اور جامعہ کے ایک مقتدر سابق طالب علم معین الدین حارث (مدیر اجمل) کیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ سندھیا اسٹیم نیویگیشن کمپنی کے ایک افسر عبدالحمید بھی اکثر ساتھ ہوتے۔ مسلم لیگ کی تحریک ان دنوں اپنے عروج پر تھی۔ لیگی حلقوں میں جو لوگ جامعہ کے تاسیس سے واقف نہ تھے یہ ادارہ اور بالخصوص ڈاکٹر ذاکر حسین کچھ زیادہ مقبول نہ تھے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کا رویہ معاندانہ تھا۔ ان کے اس رویے میں بڑا دخل اس وردھا اسکیم کو تھا جو گاندھی جی کے ایما پر ذاکر صاحب کی صدارت پر مشتمل کمیٹی نے بنیادی تعلیم کے لیے تیار کی تھی۔ مسلم لیگ نے اس اسکیم کو مسلمانوں کیلئے مُضر قرار دے کر اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ ان حالات کے باوجود مسلمانوں کا ایک ایسا حلقہ بھی موجود تھا جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخ اور اس میں کام کرنے والی مقتدر شخصیتوں کے ایثار اور جذبہ خلوص سے واقف تھا اور جو اس موقع پر ذاکر صاحب اور ان کے رفقا کی دامے درمے سخنے تعاون کرنا چاہتا تھا۔ خود جناح صاحب، ذاکر صاحب کے مداح تھے لیکن اپنے سیاسی مسلک کے تحت چاہتے تھے کہ ذاکر صاحب ان کے ساتھ مسلم لیگ کے تحت رہ کر تعلیمی کام انجام دیں۔

ذاکر صاحب اور ان کے رفقا کو عطیات جمع کرنے میں ایک دقت یوں بھی پیش آئی کہ کچھ ہی عرصہ پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مجوزہ میڈیکل کالج کیلئے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد (جن کی لیگی ہمدردیاں مشہور تھیں) کئی لاکھ روپے کا

چندہ جمع کر چکے تھے اور اب جامعہ کے لیے بھی انھیں معطیان کے یہاں جانا تھا۔ مگر وہ تو عالمی جنگ کا فیض کہیے کہ تاجر پیشہ طبقے پر ہُن برس رہا تھا۔ بمبئی کی فیاضی کی روایت پرانی ہے۔ اس کی بدولت جامعہ کو بھی خاصی معقول رقم مل گئی۔ عطیات جمع کرنے کی مہم میں ذاکر صاحب اور شفیق صاحب کو کئی دلچسپ تجربے بھی ہوئے ایک کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

میں صابو صدیق انسٹی ٹیوشن کے آفس میں کام کر رہا تھا کہ گیارہ بجے کے قریب ایک صاحب تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ایک دوسرے صاحب آئے (جن کا نام جمال فرض کر لیجیے) میں ان دونوں سے واقف تھا۔ آتے ہی انھوں نے دریافت کیا کہ وہ ذاکر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں، کہاں مل سکتے ہیں؟ میں نے کہا' وہ ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید صاحب کے ساتھ کف پریڈ میں ٹھہرے ہیں۔ اس وقت کہاں ہوں گے، میں نہیں کہہ سکتا، البتہ شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب قریب ہی کے مکان میں مقیم ہیں، ان سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ وہ دونوں فوراً اٹھ کر جانے لگے۔ میں نے عجلت کا سبب پوچھا۔ معلوم ہوا کہ صبح ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ ذاکر صاحب اپنے رہبر عبدالحمید اسماعیل صاحب کے ساتھ جمال صاحب کے گھر عطیات کے سلسلے میں تشریف لے گئے۔ جمال صاحب بڑے فراخدل واقع ہوئے تھے۔ تعلیمی کاموں کے لئے خصوصاً دل کھول کر چندہ دینے میں مشہور تھے۔ بلگام کا ایک مسلم ہائی اسکول بڑی حد تک ان کی کفالت سے چل رہا تھا۔ اتفاق سے اس روز جمال صاحب کچھ علیل تھے۔ جب یہ دونوں ان کے مکان پر پہنچے تو جمال صاحب نے انھیں بیڈ روم ہی میں بلالیا۔ علیک سلیک کے بعد اسماعیل صاحب نے ذاکر صاحب کو یہ کہہ کر ملایا: "یہ ذاکر صاحب ہیں، دلّی کے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانی۔ اس کی سلور جوبلی کے موقع پر فنڈ جمع کرنے تشریف لائے ہیں۔" جمال صاحب نے نہ تو جامعہ ملیہ اسلامیہ کا نام سنا تھا اور نہ ذاکر صاحب کا۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے انھوں نے طنزاً فرمایا: "اسماعیل بھائی! میں پوچھتا ہوں کہ آخر کیا بات ہے کہ نارتھ انڈیا سے سارے لوگ چندہ مانگنے بمبئی چلے آتے ہیں؟ جسے دیکھو یتیم خانے کی رسید، مدرسے کی رسید کی کتاب لیکر زکاۃ، خیرات جمع کرنے کے لیے یہاں پہنچ جاتا ہے۔ بھائی! ہمارے یہاں بھی تو مدرسے، یتیم خانے چلتے ہیں۔"

اب اسماعیل صاحب کے کاٹو تو جسم میں لہو نہیں۔ چہرے کا رنگ اُڑ گیا، مگر ذاکر صاحب اپنی طبعی ظرافت اور بے پناہ ضبط سے کام لیتے ہوئے جمال صاحب کی تائید میں فرمانے لگے۔ "جی بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ ہاں اسماعیل صاحب یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ شمالی ہندوستان کے لوگ ہزار میل کا سفر کر کے چندہ مانگنے بمبئی آئیں، اور جمال صاحب جیسے لوگوں پر سارا بوجھ ڈال دیں۔" پھر جمال صاحب کی جانب مخاطب ہو کر کہنے لگے، "حضرت! آپ کی طبیعت ناساز ہے، آرام کریں۔ ہم نے بلا وجہ آپ کو تکلیف دی۔ اس کی معافی چاہتے ہیں۔" چلئے اسماعیل صاحب انھیں آرام کرنے دیجئے۔ اتنا کہکر وہ اسماعیل صاحب کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آئے۔ اسماعیل صاحب شرم سے پانی پانی ہو رہے تھے۔

اور ذاکر صاحب اس مضحکہ خیز صورت حال سے محظوظ ہو رہے تھے۔ ان دونوں کے چلے جانے کے بعد ایک مسلم اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے جو وہاں گفتگو کے درمیان وہاں بیٹھے تھے، کہا: "اجی حضرت، آپ نے یہ کیا غضب کیا! آپ کو کچھ معلوم ہے یہ کون تھے؟" پھر انھوں نے ذاکر صاحب اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تفصیلی تعارف کرایا۔ جمال صاحب کو ایسی ندامت ہوئی کہ اسی وقت ہیڈ ماسٹر صاحب کا ہاتھ پکڑ کر پلنگ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: "میں نے یہ کیا کیا! میرا وطیرہ تو یہ رہا ہے کہ معمولی سے معمولی آدمی بھی جو چندہ مانگنے آیا ہو، کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹا! میرے ساتھ چلیے اور مجھے ذاکر صاحب سے ملایئے، میں جب تک ان سے مل کر ان کے قدموں پر سر رکھ کر معافی نہیں مانگ لیتا، نہ گھر واپس آؤں گا نہ کھانا کھاؤں گا۔" دونوں ٹیکسی پر بیٹھ کر ذاکر صاحب کی تلاش میں نکلے تھے اور میرے یہاں پہنچے۔ بعد کو پتہ چلا کہ تقریباً ڈھائی بجے ذاکر صاحب انھیں ملے۔ اپنے عہد کے مطابق جمال صاحب نے ان سے معافی مانگی اور غالباً ڈھائی ہزار روپیہ کا عطیہ پیش کیا۔

نمائش کئی دنوں تک چلتی رہی جسے لوگوں کی بڑی تعداد نے دیکھا۔ اختتام پر ایک جلسہ ہوا جس میں ذاکر صاحب اور ان کے رفقا نے معطیان اور ہمدردوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر جن لوگوں نے تقریریں کیں ان میں میرے ماموں جان پروفیسر نجیب اشرف ندوی بھی تھے جو ذاکر صاحب کو اس وقت سے جانتے تھے جبکہ وہ (ندوی صاحب) رفیق دارالمصنفین کی حیثیت سے اعظم گڈھ میں مقیم تھے اور ذاکر صاحب وہاں اکثر جایا کرتے تھے۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی ذاکر صاحب کے خلوص، ایثار اور تعلیمی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے پرجوش جذبات میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگے: "اے اللہ، میری عمر کا بقیہ حصہ اس خادم ملت کو عطا کر دے، تاکہ یہ اپنا مشن پورا کر سکے۔" اس وقت حاضرین میں اکثر کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

سیاسی فضا خوشگوار نہ ہونے کے باوجود بمبئی سے ذاکر صاحب مطمئن اور خوش گئے اور اس کی ہم سبھوں کو خوشی ہوئی۔

جوبلی نومبر کو منائی جانے والی تھی۔ انجمن اسلام (بمبئی) نے، جس سے میں وابستہ تھا، مجھے اور میرے دو ساتھیوں کو اس تقریب میں شریک ہونے کیلئے دلی بھیجا۔ کئی حیثیتوں سے یہ ایک یادگار تقریب تھی۔ جو اس میں شریک ہوا اس کے دل سے تقریب کی یاد بھلائی نہ جائے گی۔ مختلف لوگوں نے اس کا حال قلمبند کیا ہے۔ ان کا اعادہ یہاں غیر ضروری ہے۔ خدا بخش لائبریری جرنل (شمارہ ۲۱-۲۲) میں ذاکر صاحب کی اس معرکہ آرا اختتامی تقریر کا اقتباس شائع ہو چکا ہے جس نے حاضرین کے دل ہلا دیئے تھے۔ جشن کے اس موقع پر مسلم یونیورسٹی کے طلبا کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جس میں اغلب اکثر مسلم لیگیوں کی تھی جو کانگریس اور نیشنلزم کے نام سے چڑتی تھی۔

ملک میں فرقہ وارانہ فسادات، بالخصوص بہار کے فسادات نے شدید ردِ عمل پیدا کیے تھے۔ عام مسلمان کے نزدیک ہر کانگریسی اور خاص طور سے بحیثیت مسلمان ان کو دشمن نظر آتا تھا۔ ایسی مکدر فضا میں جب ذاکر صاحب نے کپکپاتی ہوئی آواز میں ملک کے سیاسی لیڈروں کو مخاطب کرکے فرمایا: "خدا کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیے اور آگ کو بجھائیے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں کہ آگ کس نے لگائی؟ کیسے لگی؟ آگ لگی ہوئی ہے اُسے بجھائیے۔ یہ مسئلہ اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے۔ مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ زندگی کے انتخاب کا ہے۔ خدا کے لیے مہذب زندگی کی بنیادوں کو کھودنے نہ دیجیے۔" اس آواز میں اتنا درد، سوز و گداز تھا کہ مخالفین تک کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔

سلور جوبلی کی تقریب کئی حیثیتوں سے یادگار تقریب تھی۔ ان دنوں آج کی طرح سہولتیں میسر نہ تھیں۔ بے شمار مجبوریاں اور دشواریاں راہ میں حائل تھیں (فساد کے اندیشے کے تحت مزدوروں کی کمیابی بھی ایک تھی) مگر تقریب شروع سے آخر تک اتنے سلیقے اور خوبصورت انداز سے منعقد ہوئی کہ ہر قدم پر ذاکر صاحب کو داد دیے کا جی چاہتا تھا۔ جشن کا افتتاح کس کے ہاتھوں ہو؟ وزیر اعظم جواہر لال کے ہاتھ یا قائد اعظم محمد علی جناح کے ہاتھ؟ فیصلہ نواب صاحب بھوپال کے حق میں ہوا جو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ پنڈال کے اسٹیج پر نمایاں نشستیں اس طرح رکھی گئیں کہ ایک جانب مسلم لیگ اور دوسری جانب کانگریس کے لیڈران بیٹھے اور بیچ میں نواب صاحب بھوپال جن کے ایک طرف ذاکر صاحب دوسری طرف خواجہ عبدالمجید صاحب۔ حسن اتفاق سے جواہر لال نہرو اور قائد اعظم محمد علی جناح ایک ہی وقت جلسہ گاہ میں تشریف لائے۔ ذاکر صاحب نے کچھ ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ داہنی طرف سے جناح صاحب اور دوسری طرف سے جواہر لال نہرو اسٹیج پر پہنچے اور ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہوئے۔ جواہر لال نہرو نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، جناح صاحب نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ اس غیر متوقع منظر کو دیکھ کر حاضرین بے خود ہو گئے۔ تالیوں کا ایسا شور پنڈال میں بلند ہوا کہ جیسے سارے ہندوستان کے لوگ اس منظر کا خیر مقدم کر رہے ہوں۔ اور جو سچ پوچھیے تو یہی ہندوستانی عوام کی اصلی آواز تھی جو سیاست اور مصلحت کے ہنگامے میں گھٹ کر رہ گئی۔

جشن کے بعد میں دِلّی سے لوٹا تو ایک تمنا ساتھ لیکر آیا۔ میرے بچے کی عمر تقریباً ۸ سال تھی۔ میری خواہش تھی کہ اس کی پرائمری درجوں کی تعلیم جامعہ میں اور تربیت وہاں کے ہوسٹل میں ہو۔ چنانچہ میں نے اس کے داخلے کے لیے درخواست بھیجی۔ پتہ چلا کہ داخلہ بہت دقت طلب ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے ان دنوں جامعہ میں بچے آتے تھے۔ اتفاق سے میرے دوست معین الدین حارث (مرحوم) دِلّی جا رہے تھے تو میں نے ذاکر صاحب تک ان کے

ذریعے سفارش پہنچائی۔ حارث صاحب نے واپس آکر خوشخبری سنائی کہ ذاکر صاحب نے فرمایا "بھئی درخواستیں بہت ہیں۔ داخلے کی گنجائش باقی نہیں ہے، مگر ایک ٹیچر کے بیٹے کے لیے تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ داخلہ منظور ہوگیا۔ میں نے جامعہ کے قاعدے کے مطابق اپنے بچے کے لیے کپڑے بنوائے، ضروری سامان خریدا اور اسے بھیجنے کی تیاری کرلی، لیکن کچھ ہی دنوں میں دلی میں ایسا فساد پھوٹ پڑا کہ شہر میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوگیا۔ میری آرزو ناتمام رہ گئی اور مجھے اس کا ہمیشہ افسوس رہا۔ اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ، ذاکر صاحب کا دوسرا نام تھا! میرا بچہ اس سعادت سے زندگی بھر محروم رہا کہ اس کے استاد ذاکر صاحب ہوتے!

جوبلی کے بعد مجھے ایک نیازمند کی حیثیت سے بارہا ذاکر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کے مواقع ملتے رہے۔ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانہ میں وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر بھی تھے جس کا دفتر علی گڈھ منتقل ہوچکا تھا۔ مرکزی کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے جب بھی علی گڈھ گیا ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ان کی باوقار شخصیت، انسان دوستی، اعلیٰ کردار، اور بلند پایہ معلم کی حیثیت سے متاثر ہوتا رہا۔ غالبؔ نے کہا ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

میری زندگی میں بھی بہت سے ارمان پورے ہونے سے رہ گئے، ان میں سے صرف دو کی حسرتیں آج بھی باقی ہیں۔ ایک اپنے بیٹے کو جامعہ میں تعلیم نہ دلا سکنے کی اور دوسری یہ آرزو کہ میں بھی ذاکر صاحب کے ساتھ ایک معلم کی حیثیت سے کام کرسکتا!

میں مہاراشٹر سیکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ بورڈ کا رکن تھا اور اس کی فارسی، اردو کمیٹی کا کنوینر۔ اس حیثیت سے مجھے بورڈ کے اردو امتحانات کے لیے ایک انتخاب مرتب کرانے کی ذمہ داری سپرد کی گئی۔ میں نے اس کام میں ڈاکٹر عصمت جاوید سے مدد لی۔ عصمت جاوید سکول میں میرے عزیز شاگردوں میں سے تھے۔ ان سے کام اپنا آسان تھا۔ چنانچہ پہلے ہم دونوں نے بہت غور و فکر کے بعد چند بنیادی اصول مرتب کرکے کتاب کا ڈھانچہ تیار کیا، عنوانات مقرر کیے۔ پھر انتخاب عمل میں آیا۔ اور میرے ادارے کے ادبی پرنٹنگ پریس کے خوبصورت ٹائپ میں کتاب چھاپی گئی۔ اس میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے اُس خطبۂ صدارت کا ایک اقتباس بھی تھا، جو انھوں نے دارالمصنفین (اعظم گڈھ) کی طلائی جوبلی پر ارشاد فرمایا تھا۔ اصول کے مطابق بورڈ نے انتخاب کا ایک نسخہ ذاکر صاحب کو بھی (جو نائب صدر جمہوریہ ہند تھے) بھیجا۔ کچھ دنوں بعد بورڈ کو ایک خط موصول ہوا، جس میں موصوف نے اس انتخاب کے بارے میں اپنی رائے ان الفاظ میں لکھ بھیجی تھی: "اردو کا اتنا اچھا اور سلیقے کا انتخاب

کسی بورڈ یا یونیورسٹی کی طرف سے شائع کیا ہو اب تک میری نظر سے نہیں گذرا ہے۔ میں بورڈ کو مبارکباد دیتا ہوں۔"
بورڈ کے چیرمین کی خوشی کا کیا ٹھکانہ۔ اپنی خوشی میں انھوں نے مجھے بھی شریک کر لیا۔ یہ ذاکر صاحب کی اعلیٰ ظرفی تھی۔
کہ وہ ہر اچھا کام دیکھ کر، تعریف سے بخل کرنے کے بجائے دل کھول کر ہمت افزائی کیا کرتے تھے۔

ذاکر صاحب گورنر بہار ہو کر پٹنہ آئے تو جی چاہا کہ اپنے وطن دسنہ بلانے کی دعوت دوں۔ دسنہ شہر پٹنہ سے کوئی ستر کلومیٹر کے فاصلے پر تھا تو ایک قریہ لیکن یہاں کا کتب خانہ ایسا تھا کہ جس کی مثال بڑے بڑے شہروں میں بھی نہیں ملتی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد اس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر انتقال آبادی کی وجہ سے اس قیمتی سرمائے کا مستقبل بڑے خطرے میں پڑ گیا تھا۔ ڈر تھا کہ یہ متاع گراں جس کی آبیاری اہل دسنہ نے اپنے خون جگر سے کی تھی، زمانے کے دست بُرد سے برباد نہ ہو جائے۔ چنانچہ ذاکر صاحب کو صورت حال بتا کر انھیں دسنہ آنے پر رضامند کر لیا۔ دسمبر ۱۹۵۷ء میں دسنہ کے بچے کھچے باشندے جو بہار میں اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے، اپنے اجڑے ہوئے وطن میں اکٹھے ہوئے۔ بمبئی سے آیا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہم بے مایہ اور بے سروسامان گورنر کے شان شایان ذاکر صاحب کے استقبال کے لیے سوائے ہدیۂ خلوص و محبت اور کیا پیش کر سکتے تھے! ان کے تشریف لاتے ہی مسلم یونیورسٹی کے آٹھ دس دسنوی سابق طلبائے یونیورسٹی کا ترانہ پیش کیا۔ پھر ذاکر صاحب کتب خانے کے نوادر دیکھنے لائبریری کے اندر تشریف لے گئے۔ وہاں ایک لمبی سی میز پر ابنائے دسنہ کی تصنیفات کی اچھی خاصی تعداد رکھی تھی جسے دیکھ کر وہ متاثر ہوئے اور فرمایا "اتنا اچھا سرمایہ تو کسی ایک ریاست کے لیے بھی باعث فخر ہو سکتا ہے۔" کتب خانے کے سامنے شامیانہ لگایا گیا تھا جہاں ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا گیا جس میں کتب خانے کے آئندہ خطرات کا بھی اشارہ تھا۔

سپاس نامہ کا جواب دیتے ہوئے ذاکر صاحب نے دسنہ کے مایہ ناز فرزند علامہ سید سلیمان ندویؒ سے اپنے خصوصی تعلقات کا ذکر فرمایا: "میری زندگی میں ایک وقت ایسا بھی موڑ آیا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اُس وقت جو راہ سید صاحب علیہ رحمتہ نے دکھائی اُسی پر گامزن ہوا۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں، اسی کی وجہ سے ہوں۔" یہ کہتے کہتے وہ آبدیدہ ہو گئے، آواز گلوگیر ہو گئی۔ جلسے سے اُٹھے تو سید صاحبؒ کے اُس ناتمام مکان کو دیکھنے گئے جو سید صاحبؒ نے بڑے شوق سے بنوانا شروع کیا تھا۔ بہار کا گورنر ایسے گاؤں کی گندہ اور تنگ گلیوں سے گزر رہا تھا "جس کو فلک نے لوٹ کر ویران بنا دیا"۔

۱۷ جولائی ۱۹۶۰ء کو دسنہ لائبریری کی کتابیں ذاکر صاحب کے حکم سے خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ پہنچا دی گئیں اور اب یہ سارا ذخیرہ "دسنہ کلکشن" کے نام سے محفوظ ہے اور تشنگان علم اس سے فیض اُٹھاتے ہیں۔

یہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا احسان تھا۔

جو لوگ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس اور تاریخ سے واقف ہیں انھیں علم ہے کہ قیام کے وقت اس کے وسائل کتنے غیر تسلی بخش تھے۔ سرکاری امداد اور سرپرستی تو درکنار اس کا قومی کردار بھی برطانوی عینک سے مشکوک نظر آتا تھا۔ مالی دشواریوں کو کچھ حد تک ہلکا کرنے اور ایثار و اخلاق کی قدروں کو ارفع سطح پر پہنچانے کی غرض سے جامعہ میں "لائف ممبری" کا طریقہ اپنایا گیا۔ مہاراشٹر میں گوکھلے ایجوکیشن سوسائٹی"، "دکن ایجوکیشن سوسائٹی" وغیرہ کئی ایسے ادارے قائم تھے جن میں اساتذہ قلیل تنخواہ پر پندرہ بیس سال کی خدمت گزاری کا عہد و پیمان کرتے تھے۔ اسی نمونے پر جامعہ میں بھی ذاکر صاحب، ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر مجیب اور کئی دوسرے اساتذہ نے لائف ممبری کا عہد کیا۔ بمبئی میں انجمن اسلام مسلمانوں کا ایک قدیم تعلیمی ادارہ ہے۔ سنہ ۴۶ ۱۹ء میں انجمن کا ایک نیا دستور تیار ہوا جس میں "لائف ممبری" کی بھی گنجائش رکھی گئی مگر بعض قانونی مجبوریوں کی وجہ سے مجوزہ لائف ممبروں کو مالیات کے معاملے میں شریک نہ کیا جا سکا۔ انجمن کے صدر سیف طیب جی صاحب نے ذاکر صاحب سے مشورہ کیا جس کے بعد ایک درمیانی صورت نکل آئی۔

تقسیم کے بعد ملک سے مسلمانوں کا بڑے پیمانے پر انخلا شروع ہوا۔ بمبئی سے مسلمان بیوپاری، ملازم پیشہ اور دیگر پیشوں کے لوگ قسمت آزمائی کرنے نئی مملکت کی طرف رُخ کرنے لگے۔ اس کا اثر انجمن اسلام کی درسگاہوں پر بھی پڑنے لگا۔ مدرسین کی قلت ہونے لگی۔ اسکولوں کا کاروبار سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ ان حالات میں انجمن کے کارکنوں کا گھبرا جانا قدرتی تھا۔ سب سے زیادہ پریشان سیف طیب جی ہو رہے تھے۔ ایک روز انھوں نے مجھے بلا کر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ کہنے لگے: "اب وقت آ گیا ہے کہ جو لوگ انجمن کے مقاصد سے اتفاق اور ہمدردی رکھتے ہیں اور ملک اور ملّت کی خدمت کے آرزومند ہیں، وہ اپنے خلوص اور ہمت کا ثبوت دیں۔ انجمن کی لائف ممبری کھلی ہوئی ہے۔ کیا تم اس میں پہل کرو گے؟"

یہ بڑا نازک موقع تھا۔ ایک طرف ایک نئی سرزمین کے دلکش خواب اور بے پایاں مواقع، دوسری طرف کچھ اصول اور اقدار! میں چند لمحے اس کشمکش میں خاموش رہا۔ معاً ذاکر صاحب کا نقش اور ان کے ایثار اور کردار کی تصویر ذہن میں اُبھری۔ ان دنوں خود جامعہ پر جو کچھ گذر رہی تھی اور ذاکر صاحب کا جو حال تھا وہ سب آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ مجھے فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے کہا "سیف صاحب لائیے فارم، میں دستخط کر دوں۔" اس طرح میں نے اپنے آپ کو اگلے پندرہ سال کیلئے انجمن کی خدمت کا پابند کر دیا۔ میرے ساتھ دو اور رفیق

بھی لائف ممبر بنے، اور ہم لوگوں نے انجمن کو ایک مشکل وقت میں اپنی بساط کے مطابق سنبھالنے میں حصہ لیا۔ اس وقت سے اب تک عرب میں بہت کچھ پانی بہہ چکا ہے، لیکن ایک لمحے کیلئے بھی مجھے اپنے اس فیصلے پر ملال نہیں ہوا۔

صدر جمہوریہ کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد ذاکر صاحب کی شنکر اچاریہ سے ملاقات اور اس تصویر کا بہت چرچا ہوا، جو اخباروں میں شائع ہوئی تھی۔ بعض کوتاہ اندیشوں نے ان پر بد عقیدہ اور بظاہر مسلمان ہونے کا الزام تراشا۔ ذاکر صاحب کی طرف سے کوئی صفائی نہیں پیش کی گئی۔ دلوں کا حال جاننے والا اللہ ہے۔ کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ دوسرے کے عقیدے کے بارے میں فتویٰ صادر کرے۔ ایمان اور عقیدے کی باتیں بڑی نازک ہوتی ہیں۔ ان کا تعلق انسان کی اپنی ذات اور اس کے خالق سے براہ راست ہوتا ہے۔ اس لیے میں بھی اس پر کوئی رائے نہیں دینا چاہتا ہوں۔ ذاکر صاحب پٹھان تھے، لیکن وہ اپنے نام کے ساتھ "خاں" نہیں لکھتے تھے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے سکریٹری قاضی عبدالغفار صاحب نے ایک بار انجمن کی روداد میں "ذاکر حسین خاں" لکھ دیا۔ توثیقی دستخط ثبت کرتے وقت ذاکر صاحب نے اپنا نام پڑھا تو چیں بہ جبیں ہو کر بولے "میں تو اپنی پٹھانی چھپاتا ہوں، آپ اس کا اعلان کیوں کرتے ہیں؟" یہی معاملہ ان کا اپنی عبادت کے ساتھ تھا۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ جامعہ نگر کے دوران قیام میں ذاکر صاحب نے اپنی بیٹی سے ایک ایسی ٹوپی سی دینے کی فرمائش کی جس سے پیشانی ڈھک جائے۔ جب اس فرمائش کا سبب پوچھا گیا تو کہا "تاکہ نماز میں سجدہ کرتے کرتے پیشانی پر نشان نہ پڑ جائے اور لوگ مجھے بڑا نمازی نہ سمجھنے لگیں۔"

میرے مرحوم دوست معین الدین حارث نے بتایا تھا کہ ایک بار جب ذاکر صاحب نائب صدر تھے تو وہ ان کی کوٹھی پر مہمان ٹھہرے۔ دلّی میں حارث صاحب کا معمول تھا کہ جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ہی ادا کیا کرتے تھے۔ اس روز وہ ملازم سے کہہ گئے کہ رات دیر سے آئیں گے اور کھانا باہر کھائیں گے۔ حارث صاحب جب رات کے ساڑھے دس کے لگ بھگ کوٹھی پہنچے تو ملازم سے دریافت کیا: "میاں سو گئے؟" اور جب معلوم ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں تو بے تکلف تعلقات کی بنا پر کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں حارث صاحب نے دیکھا کہ ذاکر صاحب تخت پر مصلّٰی پر بیٹھے تلاوت کلام پاک میں مشغول ہیں۔ حارث صاحب کو دیکھ کر انھوں نے صرف ہاتھ کے اشاروں سے کھانے کے بارے میں پوچھا، اور جب حارث صاحب نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا تو پھر تلاوت میں لگ گئے۔ حارث صاحب وہیں بیٹھے رہے۔ تلاوت ہو چکی تو ذاکر صاحب نے ان سے دن کی مصروفیت کا حال دریافت کیا۔ حارث صاحب نے جمعہ کی نماز، عصر اور مغرب کی نماز جامع مسجد میں پڑھنے اور دیگر معاملات کا حال سنایا۔ جب وہ کہہ چکے تو ذاکر صاحب نے ٹھنڈی سی سانس لے کر کہا۔ "حارث صاحب! آپ تو اللہ کے نیک بندوں میں ہیں۔ اپنے بارے میں سوچتا

ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں، کہ وہاں (عاقبت میں) نہ جانے میری کتنی پٹائی ہوگی"۔ خوف الہٰی سے ایسے لرز اٹھنے والے انسان کو بدعقیدہ بتانا کتنا بڑا ظلم ہے۔

ذاکر صاحب کو حضرت شاہ محمد الیاسؒ اور ان کی تبلیغی جماعت کی تحریک سے جو لگاؤ تھا اس کا ذکر کئی مضامین میں آچکا ہے۔ اکثر فجر کی نماز کے بعد ذاکر صاحب اوکھلے سے بستی حضرت نظام الدین جاکر شاہ صاحب علیہ رحمتہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے فیض اٹھاتے تھے۔

رادھا کرشنن صاحب کی مدت ختم ہونے کو آئی تو سوال اٹھا۔ کیا ذاکر صاحب صدر جمہوریہ بنیں گے؟ ذاکر صاحب فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ اپنے بارے میں نہ کوئی بات اور نہ کوئی کوشش کریں گے۔ وہ یہ بھی طے کر چکے تھے کہ دوبارہ نائب صدر کے عہدے کی پیشکش قبول نہیں کریں گے، بلکہ کشمیر جاکر ساری ہنگامی زندگی سے دور ہو کر صرف ایک کام میں مشغول ہو جائیں گے، بچوں کیلئے سیرت رسول پاک پر ایک کتاب لکھنا۔ (یہ روایت حارث صاحب سے مجھ تک پہنچی تھی)۔

دارالمصنفین کی طلائی جوبلی کے موقع پر میری آنکھوں نے وہ منظر بھی دیکھا کہ شبلی منزل کی چھوٹی سی مسجد عصر کی نماز کے لیے مصلیوں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ ذاکر صاحب، جو افتتاحی جلسے کے لیے بطور خاص آئے تھے، اپنی قیام گاہ سے بھاگے ہوئے پہنچے اور جہاں نمازیوں کی جوتیاں پڑی تھیں وہاں جگہ بنا کر نماز ادا کی۔ اس وقت ذاکر صاحب جمہوریہ ہند کے نائب صدر تھے اور خدا کے حضور میں ایک بندۂ عاجز۔

ذاکر صاحب کی طبیعت میں نہایت لطیف قسم کی ظرافت تھی جس میں حقیقت کی تلخی اور زبان کی چاشنی دونوں ہوا کرتی تھی۔ ایک دن میں پروفیسر محمد مجیب کے مکان پر بیٹھا تھا کہ نائب صدر جمہوریہ کی بڑی سی کار دروازے پر آکر رکی اور ذاکر صاحب بلا تکلف گھر کے اندر داخل ہوئے۔ علیک سلیک کے بعد ادھر ادھر کی کچھ باتیں ہو رہی تھیں کہ پروفیسر مجیب پھولوں کی ایک پینٹنگ اٹھا لائے اور کمرے کے سرے پر ذاکر صاحب کو دکھاتے ہوئے بولے: "اس پینٹنگ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" ذاکر صاحب نے گردن دائیں بائیں موڑ کر کہا: "اچھی نہیں ہے"۔ مجیب صاحب نے تعجب سے پوچھا: "آپ نے یہ رائے کیوں قائم کی؟" ذاکر صاحب نے بڑی متانت سے فرمایا: "چونکہ اسے دیکھ کر مجھے وحشت نہیں ہو رہی ہے۔ آج کل اچھی تصویر کی یہی نشانی ہے"۔

بمبئی کی ایک ملاقات کے دوران مسلمانان ہند کے رویے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ذاکر صاحب نے آخر میں فرمایا: "بھئی ہم نے تو آج سے تیرہ سو سال قبل ایک سبق پڑھا تھا اور آج تک اسی پر عمل ہے، اور وہ یہ کہ دوسروں

کا ظلم ثابت کر کے اپنی بخشائش کا سامان پیدا کر لیں۔"

ذاکر صاحب کی تفریحی کارروائی کی ایک اور مثال حارث صاحب کی زبانی سننے میں آئی۔ حافظ محمد ابراہیم صاحب جب گورنر تھے تو ذاکر صاحب کے اعزاز میں انھوں نے ڈنر دیا جس میں عمائدین شہر مدعو تھے۔ کھانا ختم ہوا تو ذاکر صاحب کے ذاتی ملازم ایک طشتری میں ان کے لیے وٹامن اور دوسری دواؤں کی گولیاں لیکر ڈائننگ ہال میں داخل ہونے لگے۔ سیکورٹی والوں نے روکا۔ ملازم نے ہزار سمجھانے کی کوشش کی، مگر وہ نہ مانے۔ بڑی مشکل سے اس پر رضامند ہوئے کہ طشتری اندر پہنچا دینگے۔ ملازم نے دور ہی سے اشارہ کر کے بتایا کہ وہ جو سامنے شیروانی پہنے چھوٹی سی داڑھی رکھے ہیں، انھیں کو دوائیں پہنچانی ہے۔ اتفاق کی بات کہ حافظ صاحب اور ذاکر صاحب دونوں کا حلیہ ایک ہی جیسا تھا۔ سیکورٹی والوں نے وہ طشتری حافظ صاحب کے سامنے رکھ دی، اور حافظ صاحب نے رنگ برنگی گولیاں یکے بعد دیگرے کھانا شروع کر دیں۔ ذاکر صاحب غلطی تاڑ گئے، مگر دانستہ اس غلطی کا تماشا دیکھتے اور لطف اٹھاتے رہے۔

ذاکر صاحب سے میری آخری ملاقات ۸ مارچ ۱۹۶۸ء کو راج بھون بمبئی میں ہوئی۔ حارث صاحب نے فون کیا "آج شام کیا کر رہے ہیں؟" میں نے جواب دیا "کوئی خاص کام تو نہیں ہے۔" "تو پھر چلیے ذاکر صاحب سے مل لیں۔ میں نے ان کے سکریٹری سے معلوم کر لیا ہے۔ ۵ سے ۷ بجے تک وہ خالی ہیں۔"

ہم دونوں راج بھون پہنچے۔ ذاکر صاحب اپنے پروگرام سے فارغ ہو کر ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ ہم برآمدے میں انتظار کرتے رہے۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ تشریف لائے۔ سلام کلام ہوتے ہی وہ ہمیں اپنے ساتھ لیتے ہوئے اندر لے گئے۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اردو، طباعت کے مسائل، دینی تعلیم کے منصوبے، انجمن اسلام کی کارگذاریاں وغیرہ۔ بڑی توجہ سے سنتے رہے۔ اپنے مشوروں سے بھی نوازتے رہے۔ پون گھنٹے کے بعد ہم اُٹھے تو ذاکر صاحب نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ بڑی شفقت سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر فرمایا۔ "دسنوی صاحب، بمبئی میں آپ کی ذات بہت غنیمت ہے۔ بہت غنیمت ہے۔"

میں وہاں سے چلا تو ایقان، حوصلہ اور ولولے کا بے پناہ ہجوم دل میں لیے چلا۔

ع خدا رحمت کند بر عاشقان پاک طینت را

●●

پروفیسر شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی
(سابق پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی)
عطا منزل، سلطان گنج، پٹنہ

ذاکر صاحب: چند یادیں

۱۹۲۵ء میں ذاکر صاحب سے میری ملاقات مختصر ترین اور بہت طویل ہوئی۔ آپ پوچھئے کیسے؟ مختصر بھی اور طویل بھی۔ مختصر اس لئے کہ بس، دو ایک ملاقات ہوئی۔ طویل اس لحاظ سے کہ فرش سے شروع ہوا اور عرش تک اس کا سلسلہ چلتا رہا، عرش سماوی نہیں بلکہ ارضی۔ اگرچہ ہم سے خط و کتابت تھی، مگر آپ غالباً یقین نہ کریں گے کہ جب تک وہ گورنر رہے یہاں، ہم ایک دن بھی ان سے ملنے کیلئے راج بھون نہیں گئے۔ ۱۹۲۵ء کا واقعہ سنئے:۔

دلّی دیکھنے کے بعد ارادہ ہوا جامعہ ملیہ دیکھ لیں۔ ایسے نہیں جیسے لوگ آگرہ جا کر تاج محل دیکھتے ہیں۔ بات اصل میں یہ تھی کہ ہمارے عزیز قاضی سعید وہاں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے۔ ان سے ملنے کے لئے ہم جامعہ ملیہ گئے، قرول باغ۔ معمولی عمارت، چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں کمرے وغیرہ۔ یہاں بیٹھک ہے، یہاں لڑکے خود انتظام کرتے ہیں، اور لڑکے خود فیصلہ کرتے ہیں۔ خیر، ایک کوٹھری میں دیکھا کہ فرش بچھا ہوا ہے۔ ایک صاحب بیٹھے ہوئے ہیں شیروانی پہنے ہوئے۔ معلوم ہوا کہ یہ شیخ الجامعہ ہیں۔ جانے سے پہلے ہمارے استاد پروفیسر عبدالمنان صاحب نے کہا تھا کہ جا رہے ہو دلّی تو کوئی کتاب میرے لئے لیتے آنا۔ تو دیکھا کہ یہاں بکڈپو ہے۔ وہاں کتاب خریدنے چلے گئے۔ یکایک "بانگ درا" پر نظر پڑی۔ اچھا تو اقبال کا کلام یہاں چھپا ہے۔ قیمت چار روپیہ۔ وہ کتاب خرید لی۔ اس کے بعد اس کو لے کر ہم یہاں آئے۔ اس ضمن میں ایک لطیفہ ہے۔ مدرسہ میں ہمارے منجھلے بھائی بھی پڑھتے تھے۔ کتاب ہاتھ میں تھی۔ اتفاق سے مختار الدین آرزو صاحب کے والد ماجد، ملک العلما مولانا ظفر الدین تھے۔ انھوں نے پوچھا "کیا ہے؟" میں نے کہا "اقبال کا کلام ہے۔" "دیکھیں۔ اچھا ہم لے جاتے ہیں گھر، کل واپس کر دیں گے۔" دوسرے دن دیکھا کہ معاذ اللہ، تمام حاشیہ پر پنسل سے بھرے ہوئے ہیں کہ یہ کفر کا کلمہ ہے، یہ ناجائز ہے، اور یہ ہے، وہ ہے۔ انھوں نے وہیں سے کہا، "شعر را بمدرسہ کے برد"۔ خیر، مختصر یہ کہ وہ کتاب رہی نہیں۔ ایک صاحب لے گئے۔

پھر لائے نہیں۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔ ۱۹۷۰ء میں ذاکر صاحب سے ملاقات ہوئی وہ قاضی سید کے مہمان تھے۔ اسی دن انجمن اسلامیہ میں ایک جلسہ تھا۔ ذاکر صاحب، ان کی شخصیت، ان کا وقار تھا، علم تھا۔ وہ اس لیے آئے تھے کہ جامعہ کے متعلق چند لوگوں کو واقف کرائیں۔ چندہ وصولیں۔ ذاکر صاحب نے نہایت ہی اچھے طریقے سے بیان کیا۔ پھر خود سر علی امام اٹھے اور کہا "ذاکر صاحب! یہ تو بتائیے کہ آپ کا جامعہ ہے کیا؟ نام تو ہے جامعہ، یعنی یونیورسٹی۔ آیا یہ یونیورسٹی ہے؟ کالج ہے؟ اسکول ہے؟ پاٹھ شالا ہے؟ یہ ہے کیا؟" انھوں نے اس طریقے سے پوچھا کہ ایسا معلوم ہوا کہ اعتراض کر رہے ہیں کہ آخر کیا مقصد ہے۔ مگر ذاکر صاحب کے چہرے پر ذرا بھی کوئی تاثر نہیں تھا۔ نہایت اطمینان سے کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ "ہماری جامعہ یونیورسٹی بھی ہے۔ کالج بھی ہے، اور یہ بھی ہے اور وہ بھی ہے۔ ذاکر صاحب اسکے بعد گورنر ہو کر آئے۔ ایک دعوت نامہ آیا۔ Independence Day کا۔ تو وہ ملاقات کیا تھی۔ ہم لوگ گئے تھے۔ اگرچہ وہ شاعر نہ تھے، مگر شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ شاید آپ لوگوں کو معلوم نہیں کہ جب وہ جرمنی میں تھے تو دیوان غالب کو خود سے کمپوز کر کے انھوں نے چھپوایا تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے مشاعرہ کیا بہت مختصر سا، چار پانچ آدمی، اردو کے شعرا۔ غالباً بسمل عظیم آبادی بھی موجود تھے۔ یہ خاکسار بھی تھا۔ میں نے کیا پڑھا، یاد نہیں، مگر دو شعر یاد آ گئے جو انھوں نے پڑھے تھے کہ:

نہ بھولو غیروں کے گلزار پر تم اے بھولو ۔۔۔ جہاں کھلے ہو اسی گلستاں کی بات کرو
جہاں ابھی ہو، وہاں تم نے کیا کیا پہلے ۔۔۔ زمیں سنوار لو پھر آسماں کی بات کرو

فوراً ڈاکٹر ذاکر صاحب نے کہا:

تو کار زمین را نکو ساختی ۔۔۔ کہ با آسمان نیز پرداختی

میں نے کہا، یہ ان کا مضمون تھا، یہ میرا مضمون ہے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میرا ایک اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ بی۔ اے پاس کر چکا تھا اور ایم۔ اے اردو میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ اور ہم تھے فارسی ڈیپارٹمنٹ میں۔ شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔ اس نے کہا خط لکھ دیجیے گورنر صاحب کے نام۔ میں نے کہا، مجھ سے کیا واسطہ بھئی؟ اس نے کہا نہیں آپ لکھ دینگے تو ہو جائے گا۔ میں نے کہا، خیر! ہم لکھ دیتے ہیں۔ دیں یا نہ دیں میرا کیا بگڑتا ہے۔ میں نے لکھ دیا اس کو۔ یہ طالب علم ہے۔ یہ پڑھنا چاہتا ہے۔ ذاکر صاحب نے ہمدردانہ جواب دیا اور مالی امداد بھی دی۔

●●

ڈاکٹر عتیق الرحمن
اسسٹنٹ لائبریرین
خدا بخش لائبریری۔ پٹنہ

خدا بخش لائبریری کے چند اہم مخطوطات

خدا بخش لائبریری اپنی نادر قلمی کتابوں قدیم تحریروں اور مصور نسخوں کی وجہ سے دنیا کے اہم ترین کتاب خانوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ہر سال نئے اور اہم مخطوطات کا اضافہ ہوتا رہتا ہے جس کی وجہ سے اس لائبریری کی قدر و منزلت مزید بڑھ جاتی ہے۔ درج ذیل سطور میں ایسے فارسی مخطوطات کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے جو ابھی حال ہی میں دستیاب ہوئے ہیں اور اہل علم کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔

دیوان رضی (Acc.No.1928)

یہ فارسی شاعر مرزا رضی ارتیمانی کا دیوان ہے۔ جو ۵۵ اوراق پر مشتمل ہے۔ کتابت ۱۲ ویں صدی کی ہے۔ خط نستعلیق ہے۔ اس میں غزل، رباعی قطعات وغیرہ کے اشعار پائے جاتے ہیں یہ دیوان مندرجہ ذیل اشعار سے شروع ہوتا ہے۔

الٰہی سوختم باغم الٰہی ‏ ‏ ‏ کرامت کن نم اشکی و آہی
چہ اشک اشکی کہ چوں ریزد ز مژگاں ‏ ‏ ‏ شود داماں بداں لعل بدخشاں

اس کے علاوہ قطعہ کا شعر ملاحظہ کیجیے۔ جو اس دیوان کے آخری صفحے پر موجود ہے۔

ایں یافتہ ہرچہ خواستہ از یزداں ‏ ‏ ‏ اسکندر عہدی و سلیمان جہاں
ایں آنکہ کمینہ چاکرت را در شان ‏ ‏ ‏ قیصر قیصر خواند و خاقا خاقاں

مرآۃ المعانی (Acc.No.2108)

یہ مولانا جمالی کی ایک طویل مثنوی ہے جو ۲۷ اوراق پر مشتمل ہے۔ کتابت ۱۲۱۷ھ کی ہے۔ کاتب کا نام عبدالمجید ہے۔ یہ مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

نامہ آغازم بنام ذو الجلال ‏ ‏ ‏ آنکہ بیرون ذاتش از وہم و خیال
جان عالم پرتوی انوار اوست ‏ ‏ ‏ عرش اعظم نقطۂ پرکار اوست
صانع ہفت و نہہ و پنج و چہار ‏ ‏ ‏ خالق ماہ و خورد لیل و نہار

اس مثنوی میں تصوف کے مسائل اور واقعات وحکایات مختلف عنوانات کے تحت نظم کیے گئے ہیں۔ کچھ عنوانات اس طرح ہیں: دربیان رد کہ عبارت از وجہ حقیقی باشد، دربیان رندی کہ عبارت از قطع علائق وعوائق باشد، دربیان علوم اتب موسی برخضر علیہما السلام آخری شعر یہ ہے ؎

اندر این جا معرفت کردو تمام   عالم و آدم حق آمد والسلام

گلشن راز (Acc.No.1950)

یہ سید نذیر احمد شاہ مودودی چشتی سہوانی کا منظوم رسالہ ہے جو ۲۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کی کتابت ۱۳۰۶ھ میں ہوئی۔ کاتب کا نام سید کریم احمد مودودی سہوانی ہے۔ اس رسالہ میں تصوف سے متعلق کچھ سوالات کیے گئے ہیں اور پھر ہر ایک کا جواب دیا گیا ہے۔ ابتدائی شعر اس طرح ہے ؎

بنام آنکہ جان را فکرت آموخت   چراغ دل ز نور جان بر افروخت

آخری شعر یہ ہے ؎

بنام خویش کردم ختم پایان   الٰہی عاقبت محمود گردان

قصیدہ ہلالیہ (Acc.No.1941)

یہ میر غلام علی آزاد بلگرامی کا نعتیہ قصیدہ ہے جو ۲ اوراق پر مشتمل ہے کتابت ۱۳ ویں صدی کی ہے۔ یہ ناقص ہے کیونکہ درمیان میں کچھ اشعار کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے غائب ہیں۔ یہ اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

ماہ نو سر زدہ تا آئینہ پرواز ازل   میزند آئینہ سبز فلک را مصقل

نرگستان فلک طرفہ بہاری دارد   چشم زخمش مرساد ازدر وایں مجل

مندرجہ ذیل شعر میں شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے ؎

مدح والا بود از طاقت آزاد بروں   بحر در حوصلۂ کوزہ نگنجد بحیل

اس کے بعد دو اشعار مزید ملتے ہیں جو اس قصیدے کے آخری اشعار ہیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

تاتن نازک کس نیش خورد از زنبور   تالب و کام حلاوت بردازشان عسل

باد مقہور عدوے تو ز تعذیب فلک   باد مسرور محب تو ز سامان دول

مناجات جمشید جی جاماسپ (Acc.No.2087)

اس میں تین مناجات ہیں — مجموعی تعداد اوراق ۲۹ ہے۔ کتابت ۱۳ ویں صدی کی ہے۔ مناجات سے قبل

مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دستور صاحب جمشید جی جاماسپ کی کہی ہوئی مناجاتیں اور یہ کہ دستور صاحب قصبہ فرخندہ نوساری کے باشندہ تھے عبارت یہ ہے "من تصنیف دستور صاحب مرحوم جمشید جی جاماسپ جی آساجی متوطن قصبہ فرخندہ نوساری"۔ پہلی مناجات اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

نخواہند شیر تا طفلاں بزاری　　　گیش مادر نماید دست یاری

من ار از تو نخواہم داد خود را　　　کجا یابم جہاں آباد خود را

نیاز ازی نزانی از در خویشی　　　تصور کن ایکی درویش دل ریش

خاتمہ کے اشعار یہ ہیں ؎

مرا ہم از نوال و فضل و انعام　　　بخواہند از دعا نیکو سر انجام

امیدم ہست یا قاضی حاجات　　　اشیم وہو خوانند بعد ایں مناجات

اس کے بعد دوسری مناجات شروع ہوتی ہے جو دراصل پہلی ہی مناجات ہے لیکن جابجا کتابت کا فرق نظر آتا ہے۔ مثلاً پہلی مناجات میں پہلے شعر کے مصرع ثانی کے آخر میں دست یاری لفظ آتا ہے جبکہ دوسری مناجات میں اس کے بجائے 'غم گساری' ملتا ہے۔ اسی طرح پہلی مناجات کے دوسرے شعر کے مصرع ثانی میں "کجا یابم" درج ہے جبکہ دوسری مناجات میں "کجا دارم" ملتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس مناجات کے بعد تیسری مناجات شروع ہوتی ہے جو دراصل ایک علیحدہ مناجات ہے۔ اس کے شروع میں بھی ایک عبارت ملتی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ دستور صاحب جمشید جی کی کہی ہوئی مناجات ہے وہ عبارت یہ ہے "بنام ایزد بخشایندہ بخشائش گر مہربان ایں کتاب مستطاب از تصنیفات دستور صاحب جمشید جی جاماسپی"۔

یہ مناجات اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

نام ایزد ہر کہ در کار نخواند بر زباں　　　انجام آں بہ نیکوی رساند غیب داں

نام پاکش ہر کہ ساز دورد او یابد نجات　　　نامش از مقبول حق موصوف باشد در جہات

یہ مناجات مندرجہ ذیل اشعار پر ختم ہوتی ہے ؎

بس کن اے جمشید اینجا بر دعا ختم کلام　　　از اجازت یاد کن در پیش اخیاں السلام

میروم دل شاد سوی قصبۂ نوساری نگاہ　　　دیر زی و شاد زی والقوم نیک خواہ

رسالہ مظہر الاسرار (Acc.No.2111/1)

یہ حضرت شاہ فرحت اللہ الملقب بہ حسن دوست کی تصنیف ہے جو ۳۴ اوراق پر مشتمل ہے اور کتابت ۱۳۰۲ھ کی ہے۔ اس رسالہ کے مقدمہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ طالبان سلوک کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ ایک مفید اصلاحی رسالہ ہے جو تصوف کے رنگ میں ہے۔ اور خاص طور پر ان کے صاحبزادے مظہر حسین کے استفادہ کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جابجا یا دلدی یا فرزندی کہکر مخاطب کیا ہے اور تصوف کے رنگ میں نصیحت آمیز باتیں بتائی ہیں۔

رسالہ اسرار الصلوٰۃ (Acc.No.2111/2)

یہ رسالہ بھی حضرت شاہ فرحت اللہ الملقب بہ حسن دوست کی تصنیف ہے جو ۱۴ اوراق پر مشتمل ہے اور کتابت ۱۳۰۲ھ کی ہے۔ اس رسالہ میں نماز کے اسرار و رموز بیان کیے گئے ہیں جو تصوف کے رنگ میں ہیں۔

رسالہ جواہر الانوار (Acc.No.2111/3)

یہ حضرت شاہ قمر الدین چشتی عظیم آبادی کی تصنیف ہے جو ۳۵ اوراق پر مشتمل ہے۔ اور ۱۳۰۲ھ میں کتابت کی گئی ہے۔ کاتب کا نام ابوالحسن ہے۔

اس کے مقدمہ میں مصنف نے اپنے مختصر حالات زندگی تحریر کیے ہیں اور اس ضمن میں شاہ حسن علی، شاہ سید یحییٰ علی، شاہ ابوالبرکات خلیفہ حضرت شاہ گھسیٹا سے اپنے ذاتی و روحانی تعلقات بیان کیے ہیں۔

یہ رسالہ مسائل تصوف پر ہے۔ جن کی جانکاری ایک سالک کے لیے ضروری ہے مثلاً "جوہر اول: در بیان طلب پیر، جوہر دویم: در بیان توجہ مبتدیان و طریق نشستن آنہا، جوہر سوم: در بیان آداب پیران و مرشداں کہ موجب فائدہ است" آخری باب جوہری و چہارم ہے جو "در بیان عرفان" ہے۔

مثنوی اعجاز مسیحا (Acc.No.1948)

یہ شاعر رونق کی ایک طویل مثنوی ہے جو ۱۱ اوراق پر مشتمل ہے خط نستعلیق ہے اس کی کتابت ۱۹۰۷ء میں ہوئی ہے لیکن یہ مثنوی ۱۲۷۹ میں لکھی گئی ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ سے اس کی وضاحت ہوتی ہے ؎

چوں رونق مثنوی معجزہ گفت   پئے تاریخ گفت ایں ہاتف غیب
کہ از ہر مصرعش اعجاز پیدا   بگو او ساخت اعجاز مسیحا ۱۲۷۹

مندرجہ ذیل شعر بھی لائق توجہ ہے جس میں شاعر نے اپنا تخلص رند استعمال کیا ہے ؎

بفرما رحم بر احوال رونق   کشا چشم کرم برحال رونق

یہ مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

الہی رنگ و بوئے دہ سخن را | بآب فیض ترکن ایں چمن را
خداوندا اثردہ در بیانم | ز بحر حمد خود کن تر زبانم

انشائے میرم (Acc.No.2082)

یہ انشائے میرم سیاہ ہے جو ۲۰ اوراق پر مشتمل ہے، خط شکستہ ہے۔ کتابت ۱۳ ویں صدی کی ہے۔ یہ ناقص نسخہ ہے کیونکہ درمیان میں جابجا عبارت نقل ہونے سے رہ گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ جس نسخے سے یہ نقل ہوا ہے وہ یا تو اسی طرح لکھا یا کاتب ان عبارتوں کو پڑھنے سے معذور رہا۔ یہ نسخہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

"آغاز کتاب انشائے میرم سیاہ بعنایت حضرت الہ بعد از اثنائے حمد و ثنای بیحد مر بادشاہ را..."

خاتمہ کی عبارت یہ ہے:

"الہی ایں یاسمین امید درمیدان گیرد۔ وایں غنچہ مراد شگفتن پذیرد۔ والسلام والاکرام"

جواب شافی (Acc.No.1947)

یہ میر عبداللہ وارستہ کی تصنیف ہے جس کی کتابت ۱۳ ویں صدی کی ہے اور ۱۹ اوراق پر مشتمل ہے خط نستعلیق ہے۔
اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

بعد حمد ایزدی کہ ذات مقدسش از جمیع نقائص مواد حکمت بالغہ اش از ہمگی عیوب مبرا...

خاتمہ کی عبارت ملاحظہ ہو:

از سر صدق و راستی در نگذرند کہ انصاف بالائے طاعت است۔

اس تصنیف کا ایک دوسرا نسخہ بھی ہے (ACC.N. 1985) جو ۱۷ اوراق پر مشتمل ہے اور کتابت ۱۳ ویں صدی کی ہے۔ خط نستعلیق ہے۔

کتاب زراعت (Acc.No.1983)

یہ زراعت سے متعلق ایک مفید رسالہ ہے جو ۱۸ اوراق پر مشتمل ہے خط نستعلیق ہے اور کتابت ۱۲۱۷ھ کی ہے جیسا کہ خاتمہ کی عبارت سے پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ بھی تحریر کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب زراعت اس کا تاریخی نام ہے۔ قطعہ ملاحظہ ہو:

کلید دولت و اقبال و صدر حشمت و جاہ | بہ بخت ہم چو سکندر بفر چو دارا
برائے طرح زراعت و موسم فصلش | اشارت زسر التفات کرد بما
در ایں دیار کہ رسم زراعت است رواج | رقم کشیدم و کردم ز حکم او انشا
شدہ کتاب زراعت پسند تاریخش | کہ نام نسخہ ز تاریخ می شود پیدا

اس رسالہ میں زراعت کے سلسلے میں ہندستان کے مختلف موسم اور نچھتر کی تقسیم اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہندی، فارسی اور انگریزی مہینوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ پھر کون کون سی فصل کس کس موسم اور نچھتر میں ہوتی ہے۔ اس کو مفصل بیان کیا ہے۔ ترکاری، روئی، اناج، اجوائن وغیرہ کی کاشت کس طرح کی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک چیز کی وضاحت اختصار کے ساتھ کی گئی ہے۔

ریاض المعارف (Acc.No.3560)

یہ ایک طویل مثنوی ہے جو ۲۰۷ اوراق پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق ہے۔ کتابت ۱۳ ویں صدی کی ہے اس کے آخری ورق الف پر مندرجہ ذیل شعر درج ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مثنوی ۱۱۳۵ھ میں مکمل ہوئی ہے ؎

موج زن شد با تلف آمد سال خواں | باز چشمۂ معرفت آمد بر دل
۱۱۳۵ھ

یہ مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

حمد گوید مر خدا را بر وجود و بر بقا | جنی و انس و ملک و الطیر فی جو السماء
عالم تسلیم دارد جملہ ذرات وجود | از لسان حال گوید رب لا احصی ثنا
فی الحقیقۃ حامد و محمود ہم ذات وے ست | کس ندارد حق حمدش را توانائی قضا

خاتمہ کا شعر یہ ہے ؎

او نخواہد جاہ و مال و طمطراق | درد خواہد با دل پر اشتیاق

اس نسخہ میں سب سے پہلے حمد کے اشعار ہیں اور دو مناجات ہیں۔ اس کے بعد مختلف عنوان کے تحت اشعار درج ہیں مثلاً بیان عقل و ایمان و حیا، حکایت در بیان مناظرہ خوف و رجا، گفتار رجا، جواب خوف، جواب رجا، التماس خوف و رجا در جناب الٰہی، بیان خلقت آدم و حوا و مکر ابلیس بالایشان، بیان نفس و روح، وغیرہ۔

حکیم سید محمد حسان نگرامی
لٹریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (یونانی)
کراچی

استدراک

"القانون فی الطب" کے گمشدہ مشمولات کی تلاش

شیخ الرئیس بوعلی سینا (متوفی ۱۰۳۷ء) کی کتاب "القانون فی الطب" کی گمشدہ جلدوں کی تلاش کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر مزید حوالوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ "القانون فی الطب" جسے صرف ۵ جلدوں میں شائع کیا گیا ہے، اسے مکمل کہنا مناسب نہیں ہے کیونکہ "القانون فی الطب" کے سلسلہ کے تمام قدیم حوالوں میں اربع عشرۃ مجلدۃ (۱۴ جلدیں) واضح طور سے درج کیا گیا ہے اور بعد کی کسی کتاب میں اس کی تردید نہیں کی گئی ہے۔

اس سلسلے میں خدابخش جرنل نمبر ۴۴ میں ڈاکٹر سلیم الدین احمد کی یہ بات محل غور ہے کہ "مطبوعہ القانون کی طباعت کے وقت القانون کے دستیاب تمام نسخے پیش نظر رکھے گئے ہیں۔" البتہ اس بات کا امکان ضرور ہے کہ کسی ایک مکمل نسخے کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

واضح رہے کہ مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر "القانون" کی ایڈیٹنگ آج تک کہیں نہیں کی گئی ہے۔ ہمدرد دہلی سے شائع شدہ جدید ترین "القانون" کے ایڈیشن کے بارے میں بھی یہی معلوم ہوا ہے کہ صرف مکمل نسخے ہی سامنے رکھے گئے ہیں۔ ظاہر ہے نامکمل نسخے جن کے مشمولات موجودہ القانون سے مختلف ہوسکتے ہیں انہیں دیکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔

ڈاکٹر سلیم الدین احمد نے اپنے مضمون میں ایا صوفیا لائبریری کے "القانون" کے مخطوطہ (جس کی کتابت ۵۲۸ھ میں ہوئی ہے) کے سلسلے میں لکھا ہے کہ "اس مخطوطہ کی آخری عبارت عام مخطوطات کی آخری عبارت سے مختلف نہیں ہے" حالانکہ محولہ عبارت یعنی:

تم الکتاب الخامس فی القانون فی الطب وھو الاقرابادین وھو المجلدۃ السابعۃ منہ

—— "القانون" کے کسی مطبوعہ نسخے میں موجود نہیں ہے۔ اس عبارت میں لفظ "المجلدۃ السابعۃ" سے صاف طور سے پتہ چلتا ہے کہ قانون کی پانچویں کتاب ساتویں جلد پر مشتمل ہے۔

اب رہی یہ بات کہ "القانون" کے آغاز کتاب میں مصنف نے جو دیباچہ لکھا ہے اس میں القانون

فی الطب کے مشمولات کا تذکرہ کرتے ہوئے پوری کتاب کو ۵ کتاب ☆ میں تقسیم کیا ہے۔ تو اس سلسلے میں یہ نکتہ ذہن نشین رہنا چاہیے کہ دنیا کے جس قدیم ترین نسخے کی آخری عبارت کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی باقی شرح کی جلدوں کا ابھی تک مطالعہ نہیں کیا گیا ہے ان حالات میں اس مخطوطہ کی نشاندہی اور اس کے مطالعہ کے بغیر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے شرح میں "القانون فی الطب" کو کتنی کتاب میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس کے مشمولات کیا ہیں چنانچہ مطبوعہ القانون کی بنیاد پر مزید جلدوں کی تلاش کو بے سود کہنا بھی مناسب نہیں ہے۔

فاضل مقالہ نگار ڈاکٹر سلیم الدین کا یہ خیال کہ "القانون" کے مشتملات سات جلدوں میں سما جائیں یا پانچ میں بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ بات بہر حال طے کرنے کی ہے کہ "القانون" بنیادی طور سے کتنی جلدوں پر مشتمل ہے اور اسے کب صرف ۵ جلدوں تک محدود کر دیا گیا۔

ڈاکٹر سلیم الدین احمد کی یہ بات کافی وزن رکھتی ہے کہ القانون کی مزید کسی جلد کی موجودگی کی نشاندہی اگر کہیں بھی ملتی تو یقیناً اب تک اس کا حوالہ کہیں نہ کہیں ضرور مل جاتا۔

چنانچہ درج ذیل حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ "القانون" کے مشمولات کی گمشدگی کا احساس بہت پرانا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں درج ہے:

"Al-Qanoon is a systematic encyclopaedia based for the most part on the achievement of Greek Physicians of the Roman imperial age and on other Arabic works and, to a lesser extent, on his own experience (his own clinical notes were lost during his journeys)" 3

گویا طبیب اور ناظم شفاخانہ کی حیثیت سے شیخ الرئیس کے متعلق معلومات موجودہ القانون میں شامل نہیں ہیں۔
اس کے علاوہ چیمبرس انسائیکلوپیڈیا کی یہ عبارت بھی اہمیت کی حامل ہے:

☆ "القانون" کے مشمولات کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (نیا ایڈیشن) جلد ۳، ص ۹۴۲) —— فہرست نسخہ ہای مصنفات ابن سینا "تالیف یحییٰ مہدوی تہران ۱۳۳۳ (ص ص ۱۴۹ - ۱۵۵) میں بھی "القانون" کو پانچ کتاب پر مشتمل بتایا گیا ہے۔ اس کتاب میں دنیا بھر میں دستیاب "القانون" کے تمام خطی (مکمل اور غیر مکمل) نسخوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

۞ جمال الدین قفطی کو بھی یہی بیان ہے کہ "... آنچہ را بر اوراق متفرقہ نوشتہ بود لیکن قبل از اتمام قانون آن اجزا از شیخ فوت شدند" (تاریخ الحکماء ص ۳۶۷)

"The treatise proper was accompanied by an appendix which contains Avicenna's original case record." 4

اس عبارت سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ "القانون فی الطب" کے ساتھ شیخ الرئیس کے معالجانہ تجربات پر مشتمل کوئی ضمیمہ بھی شامل ہے۔

مطبوعہ "القانون" سے ہٹ کے ویلکم لائبریری لندن کے دو اور مخطوطات کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کمال سامرائی نے لکھا ہے کہ مذکورہ مخطوطات میں سے ایک میں جسم انسانی کی تشریح کو تصویر کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے اور دوسرے مخطوطہ میں مریض سے سریریاتی سوالات اور تشخیص و علاج کے اصول سے متعلق بحث کی گئی ہے۔

واضح رہے کہ یہ دونوں مضامین موجودہ طبع شدہ "القانون فی الطب" کی پانچوں جلدوں میں شامل نہیں ہیں۔*

ایک اور قدیم نسخہ کی بھی تلاش ہو سکی ہے جسے ۱۰۷۵ء یعنی ۵۱۷ھ میں شیخ کی وفات کے صرف ۳۸ سال بعد لکھا گیا ہے یہ مخطوطہ لینن گراڈ لائبریری میں دستیاب ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں ضرورت ہے کہ خدا بخش لائبریری (جسے طبی مخطوطات پر کام کرنے کے سلسلہ میں امتیاز اور اولیت حاصل ہے) اپنے وسائل کے ذریعہ دنیا کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ "القانون فی الطب" کے قدیم مکمل و نامکمل تمام نسخوں کے مشمولات سے متعلق معلومات حاصل کرائے تاکہ "القانون فی الطب" جیسی اہم کتاب کے گمشدہ مشمولات کی نشاندہی کی جا سکے۔

مصادر

۱۔ القانون کی دستیاب جلدیں از ڈاکٹر سلیم الدین احمد خدا بخش لائبریری جرنل نمبر ۴۷ ص ص ۱۶۵-۱۶۷۔

۲۔ ایا صوفیا میں القانون فی الطب کے مخطوطات (ہینڈ لسٹ) مرتبہ نظام الدین مغربی۔

۳۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد دوم ص ۳۱ د (۱۹۸۰ء)۔

۴۔ چیمبرس انسائیکلوپیڈیا جلد دوم ص ۹۰۔

۵۔ مختصر التاریخ الطب العربی جلد اوّل دکتور کمال سامرائی ص ۵۹۱۔

••

---

* انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (بحوالہ سابقہ) میں ایسے کئی دو رسائل کا تذکرہ ہے ور بھی "القانون" سے ماخوذ مگر علیحدہ رسائل کے طور پر شمار کیا گیا ہے: متعلقہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"Several treatises take up in isolation a number of data in <u>Kanun</u> and deal with particular points. Some are very well-known: their smaller size assured them of a wider circulation. Among the most widely diffused are treatises on the pulse, the medical pharmacopoeia, advice for the conservation of health and the study of diarrhoea; in addition, monographs on various remedies, chicory, oxymel, balsam, bleeding. The virtues of wine are not neglected"

جناب رئیس احمد نعمانی
پوسٹ گریجویٹ ٹیچر (فارسی) ایس۔ ٹی ہائی اسکول
مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

سخنوران فارسی ہند بعد از دکتر اقبال

جرنل ۹۴ میں مطبوعہ مندرجہ بالا مضمون کے آخری حصے میں قتیل داناپوری کے بعد اور طاہرہ سعید سے پہلے مندرجہ ذیل سطریں بھی اضافہ فرمالیں :

خاضع الہ آبادی

دشیر خاضع در حدود ۱۲۸۰ خورشیدی در الہ آباد از توابع یزد (ایران) متولد گردید۔ افزون بر چہل سال از عمرش در ہند بسر آمد و بہ سال ۱۹۸۷ میلادی در بمبئی فوت کرد۔ زرتشتی کیش و شاعر پر گوئی بود چندین اثر چاپی بہ نثر و نظم فارسی دارد، نمونۂ کلام :

باغ و بستان چیست؟ دانی روی جانان دیدن است ۔۔۔ مال و مکنت چیست، دانی سرّ حق بشنیدن است

دو چشمی کہ از غم نگرید کراست ۔۔۔ دلی کز غم کس نرنجد کجاست

آنچہ در روز ازل کردند با ما کردہ اند ۔۔۔ سرنوشت ما مگر ہر جا مہیا کردہ اند

حال ما زار و پریشان گشتہ ای جانش مپرس ۔۔۔ دیدۂ دل خون چکان شد راز پنہانش مپرس

21. *Siratu's Sharf*.
22. Letter nos. 121, 172 and 173.
23. See my article, (in Urdu) "*Shumali Hind Ke Sufiya-i Karam Ki Hindi Dosti*" in *Ma'asir* (new series) pt. 3, December, 1952, and my article in *PUJ*, vol. X, 455.
24. *MM*, p. 46; Amir Khusrau has also mentioned it in *IK*.
25. *Khwan-i Pur Ni'mat*, p. 13.
26. *MM*.
27. *Khwan-i Pur Ni'mat*. *MM*, and *IK*.
28. *Tuhfa-i Ghaibi*, p. 88; *Ganj-in La Yafna* on *muhr-i dukhtaran*.
29. *MM*.
30. In Letter, 58 in the Collection of *Maktubat* addressed to *Maulana* Hamidu'd Din, employment as a *Qadi* has been described as *Khatra-i 'Azim* (a grave, endangering, risk). The bribe-taking *Qadis* has been specially condemned.
31. The Makhdum's revered teacher Abu Tawwama, had silken ties in his curling ringlets of hair (*Ja'd*) and in his *izarband* (string of the drawer).
32. *Maktubat-i Quddusiya*.
33. *Tuhfa-i Ghaibi*, *Mukhkhu'l Ma'ani*, *Ganj-i La Yakhfa*.

References

1. G. Roerich (ed.) *Biography of Dharmaswamin*, K. P. J. Research Institute, Patna, 1959.
2. For further details, see Appendix, I.
3. See my article on the subject in *Bengal Past and Present*, 1947.
4. For further biographical details, see my article on the saint in *JBRS*, XXXIV, 1948.
5. For details, see my article 'Hazrat Ahmad Chirmposh, a 14th century Sufi Saint of Bihar, *Patna University Journal*, VIII, 1954.
6. He was a great *Ṣūfi* saint of very wide reputation and influence. He was born in Maner, but was brought up and educated in the Saran area. He died in 901/1496 and lies buried at Vaishali. For further details, see my article on the saint in *JBRS*, LXXVII, 1951.
7. For details see, my article on the saint in *Bengal Past and Present*, IXVIII (1949).
8. This is a new information which needs corroboration.
9. *MM*, printed text, p. 426.
10. There are many references in the Sufic literature about belief in spell and magic and incantation. *Tuḥfa-i Ghaibī* says that the *Makhdūm* once suggested that for dispelling devilish thoughts and diabolical suggestions (*waswās*) the verses of the Qurān called the *Ma'ūdhatain* may be recited. The *Malfūẓāt* of *Makhdūm* and also *Fawāidu'l Fuwād* describes how *Seḥr* was practised even on the Prophet.
11. *MM*., Chapter I. Other *Malfūẓ* also contain much about interpretation of dream. The *Makhdūm* was called by later *Ṣūfis* as *Fakhru'l Mu'abbirīn* (Pride of interpreters of Dream).
12. *Maktūbāt-i Muẓaffar Shams Balkhī.*
13. *Tuḥfa-i Ghaibi*, Baḥru'l Ma'āni, and *Mūnisu'l* Muridīn.
14. Maktūbāt-i *Quddūsiya*; see my article in *PUJ*, 1957.
15. *MM*., pp. 274-75; *Ganj-i Lā Yakhfa.*
16. Maktūbāt-i-Do Ṣadī; letter nos. 69 and 72.
17. *Khwān-i Pur Ni'mat*; see also *Ganj-i Lā Yakhfa*. Letter 82 of Muẓaffar Balkhi refers to his strong recommendation of poor and pious *Khwāja* Sirāj *Saudāgar*.
18. *Mūnisu'l Qulūb*, *MM*
19. *Ganj-i Lā Yafna*, chapter I, 28, 760.
20. *Mūnisu'l Muridīn.*

therefrom. The Balkhī saints, Husain Mu'izz and his successors, Ḥasan and Aḥmad, were good traditionists, as well as noted mystics, poets and writers of *Malfūẓ* and *Maktūb* literature.

The 15 works of *Makhdūm* Sharafu'd Dīn, and those in prose and poetry of his scholarly Balkhī followers, and *Ma'danu'l Asrār* of *Qāḍin* A'la *Shuṭṭāri*, edited by his son-in-law Khwāja 'Alī of Rajgir, have come down to us. There are references to lessons being imparted in the *Khānqāh* on *'Awārifu'l Ma'ārif*, *Kānzu'l Masā'il*, *Iḥyāu'l 'Ulūm*, *Mashāriqu'l Anwār*, *Tafsīr-i Ẓāhidi*, *Sharḥ-i Ādābu'l Murīdīn Wasīlatu'l Qulūb*, *Maṣābihu's Sunnah*, *Kashshāf*, *Hidāya*, *Buzdawī*, *Majma'u'l Bahrain*, *Fatāwa-i Sirāji*, *Fawa'idu'l Qulūb* of Makki, *Lama'* of As-Sirāj and *Kitābu't Taṣarruf* of Kalabadi. Of these, the first and the last three works were the very early and highly esteemed treatise and standard books on Sufism, and were all in Arabic. *Fuṣūṣu'l Ḥakam* of Ibn-i 'Arabī, *Tamhidāt* of *'Ainu'l Quḍḍāt* Hamadani were also subjects of discussions at the *Khānqāhs*

As regard the methods and theories of teaching and learning in Bihar, as elsewhere, under the older *Dars-i Niẓāmī* there was the system of Mu'īd, *Muawwin* (elder, skilful student, tutor, trainer, the restorer or bringer again of lessons) and of *Muṭāla'* (perusal), *Muẓākra* and *Mufawḍa* (dialogue and association) *Takrār* (repetition, revision), *Talfiq* (repetition), *Taḥqīq* (verification) and *Baḥath-o-Mubaḥtha* (debates, discussions and disputations), etc.

the Muslim child into the duty of reading and writing, use of letters of alphabets, written on *Takhta-i-Chobin* memorization of parts or wholly of the *Qurān*, prayers and benediction (*Taḥiyāt, Darūd*). Rising above in *Panjganj* stage the young learner acquired knowledge of special subjects. Amīr Khusrau further tells us how *Zānūzada* (sitting on one's knees) before the teacher, he rose above the *Panjganj*. He catalogues the subjects taught and the books and treatises generally read and studied in *Maktab* and *Madrasa*. He mentions the four or five treatises in Arabic grammar called *Panjganj*, works on *Ādāb*, *Inshā* (science of polite learning and Belles-letters) *Ma'ānī-o-Bayān* (Rhetoric), *Ilāhiyāt* (theology-tradition, commentaries, law, Jurisprudence), *Ḥikmat* (science and philosophy, mathematics) special science (*'Ilm-i-Naẓarī*) *Tanjīm* (astronomy), *Ṭibb* (medicine), *Manṭiq* (logic). We get references to a large number of books on ethics, tradition logic, law, scholasticism, mysticism etc., which must have constituted as the major fields of study. Some such were *Mashāriqu'l Anwār, Qudūrī, Muzdawī, Dhakhira, Mabsūt, Mutawwal, Maqāmat-i Harīrī, Baiḍavī, Jāmiu's Saghīr wa'l Kabīr Nāfe', Laṭā'if, Mufaṣṣal, Fatāwa-i Sirājī, Hedāya, Miṣbāḥu'd Doja, Kashfu'l Maḥjūb, Sulūku'l Murīdīn* and *Sirāju'l 'Ārifin, Iḥyā', Kīmiyā* and the other books of Aḥmad and Muḥammad Ghazzali and their commentaries by Jurjāmī and Zamashkharī, *Kashshāf* and *Qānūn* of Ibn-i Sīna (Avicenna). All these have found reference in *Risā'ilu'l A'ijāz*, the rhetorical work of Amir Khusrau.

More relevant to our purpose is what we get in the 14th and 15th century *Malfuẓāt* and *Maktubāt* of *Ṣūfi* saints of *Firdausi* and *Shuṭṭāri* Orders. The celebrated Makhdum Sharafu'd Dīn is credited with having introduced the teaching of *Ṣaḥiḥain* or the six celebrated standard collections of traditions. That Biharsharif had become a centre of *Ḥadith* learning and that the *Khānqāh* was well-equipped with library of books on mystical and rhetorical subjects is proved by the letters of *Maulāna* Muẓaffar Balkhī relating to his borrowing

We can compare this with what we get in the 17th century *Dabistān-i Mazāhib*, and the relevant extracts in *Ganj-i Arshadī* and *Ganj-i Fayyāḍī* of the 17th-18th century Ṣūfi of Jaunpur, whose ancestor, or Jamālu'l Ḥaq Muṣṭafa, lies buried in Purneah (Bihar). All the four sons and also the chief disciples of his great son, *Diwān* Abdur Rashīd, renowned scholar of the time, a poet and annotntor of Ibn-i 'Arabī's *Fuṣūṣ* and *Fatūḥāt*, had begun with *Bismillāh*, They had to learn by heart some short *Suras* of the *Qurān* and then completed their Quranic studies. Side by side, they were taught *Pand nāmah* of Sa'dī *Nām-i Ḥaq*, *Niṣābu's Ṣibyān* (vocabulary), *Dastūru'l Mubtadī* (grammar) and the five well-known books of Arabic grammar (Panj- *ganj*, *Ṣarf*, *Mizān*, *Munsha'ib*, *Nahw*). Different teachers took charge of the *Dars* (teaching) in *Kāfiya* of *Quṭbī*, *Mu'īniyah*, *Sharh-i Muṭāla'* (logic), *Mutawwal*, *Mukhtaṣar* (rhetoric), *Sharh-i 'Aqa'id* of *Mullā* Sa'du'd Dīn Taftāzānī with *Hāshiya-i Khayālī* (Scholasticism or *Kalām*), *Irshād* of Shihābu'd Dīn Daulatābādī *Tahzīb*, *Sharh-i Tahzīb*, *Hāshiya-i Mīr* and *Hidāya* of Bahau'd-Dīn (Law) *Waqāya* (*fiqh* or law), etc.

The 4th son, a poet who died in the service of Shāh 'Ālam in Hyderabad, was once asked as to whether he was a *Darwesh* or a *Sipāhī*, and he said that he was a seeker of knowledge. His eldest brother was a warrior, and was in service before taking, like others, to *Dars-o-tadrīs* (teaching and lecturing). It is interesting to find that closely connected as teacher or disciples were some eminent Bihari, like *Maulāna* Abdu's Shakur Manerī, *Mulla* Naṣīb Manerī, Abdul Ḥalīm Bihārī, *Mīr* Ja'far Patnavī and his scholarly sons, *Mīr* Bāqar and Mīr Aslam, who ran their own *Madrasa*, and also practised as very eminent physicians.

Amīr Khusrau also writes in *Tughlaq Nāmah* that the younger sons of 'Alāu'd Dīn were learning before they were killed by men of Khusrau Khān. He has written much more in *I'jāz-i Khusrawī* about the *Bismillāh* ceremony, initiating

the *Maktūbāt* of Firdausī *Ṣūfis*, Sharafu'd Dīn Manerī and of Muzaffar Shams Balkhī. The boys received some professional training also. Higher studies in *Madrasas* originally included that of the theological subjects, such as Ḥadīth (tradition) *Fiqh* and *Uṣūl* (jurisprudence), *Tafsīr* (exegesis or commentaries), science of *Ansāb* and *Rijāl* (scrutiny of genealogy and biography of the traditionists) which had evolved out of the *Ƴurān* and the needs of comprehending its true and many-sided imports. These were mostly in Arabic. The field of learning and investigation became wider and the prevailing curriculum came to embrace both religious and secular subjects, such as the grammatical themes of Etymology, Syntax (*Ṣarf-o-Naḥw*) and rhetoric (*Ma'ānī-o-Bayān*) logic, principles of Islamic law, philosophy, scholastic theology, poetry, politics, medicine and music.

That the pattern of educational institutions, the course of study, and the major subjects and books in vogue, and the method of teaching, widely existing and generally prevalent at different times in different regions including Bihar had many things in common is quite evident from a careful perusal of the sundry references in Amir Khusrau's *I'jāz Khusrawi*, certain observations in 14th century *Sirat-i Firuz Shāhī*, a *Qaṣida* in the *Diwān* of Muṭṭahar Karwi, and relevant metters in the *Malfūẓāt* of the Firdausi *Ṣūfi* saints of Bihar. The great traditionist of Delhi *Maulāna* Abdu'l Ḥaque (d. 958/1551) writes that he began with the alphabet, learnt how to read the *Qurān*, and also how to master *Sa'dī's Gulistān* and *Bostān*, and the *Dīwān* of Ḥāfiẓ were committed to memory. Thereafter, his father taught him the *Mīzān Miṣbāḥ*, *Kāfiya* and the *Irshād* (all on grammar). When 14 years old, he studied *Sharḥ-i 'Aqā'id* (on scholasticism) and translated it, too. Then he wrote a commentary in the Persian languages on *Kāfiya*. When 15, he finished *Mukhtaṣaru'l Ma'āni* of Taftāzānī and *Mutawwal* on rhetoric. After traditional and rational studies of the usual type was finished, logic and scholasticism followed.

geography, history, medicine, philosophy, scholastic theology, in fact varous branches of *Ma'qūlāt* and *Manqūlāt*, that is rational and traditional subjects, were pushed forward when the young scholar had nearly attained adulthood, when they ceased to attend the *Maktab* and went to the *Madrasa*. Generally, higher education extended to the age of 20 or even more. In medieval times sons of the better-to-do people had to be prepared for public offices, and also, therefore, they were trained in the art of war. Difficulties of the time and the exigencies of the situation demanded that they should learn riding, swimming and wielding the sword and arrow. Even some people of *Ṣūfi* circles felt the need of wearing arms as was the case specially with the *Ṣūfis* of Jaunpur and Manikpur in eastern U. P.

As in religion and society, so in education, there was very little new or original, specially among the conservative Brahmanical intellectuals, and *Ṣūfis*. Whatever differences existed between the preceding and successive periods were those of details and not of essentials. Muslim educational institutions in medieval Bihar, as elsewhere, were of several grades ranging from elaborate Colleges known as *Madrasas* or *Jāmia' a* (so-called because they were attached to *Masjid-i Jāmi'* or congregational mosques). Some *Madrasas* were equipped with libraries of hand-written books named as *Kitāb Khāna* and boarding-houses. Elementary schools were called *Maktab* or *Kuttāb*, which meant a place for writing or a school-house where, besides the recital and memorization of the *Qurān*, and *Tajwīd* and *Qira't* (art of reading) lessons were given in rudimentary knowledge of Islam for the discharge of religious duties, and also in grammar and glossary-writing, simple computation or elementary arithmetic. Side by side, went on the study of books of ethics and literature, such as *Pand Nāma* of 'Aṭṭār, *Gulistān*, *Bostān* of S'adī, allegorical story books of Nakhshabī and selections from the works of Firdausi, Ḥāfiẓ, Niẓāmī and Amir Khusrau, and the art of letter-writing or *Mulāṭfa* was learnt in Bihar through

into syllables, recitation of a few hemistiches or distiched repetition of that which had been read before, writing with reed pens on a piece of paper or on a wooden tablet. They learnt the words and passages of the *Qurān* by rote, memorized them by repeatting them again and again. Squatting cross-legged on the covered floor, or bench, while looking or pretending to look on the sheet of paper, book or slate, they rapidly swung their bodies backward and forward.

The *Bismillāh* cetemony has been referred to in *MM* and also in *Akhbaru'l Akhyār* of the 16th and *Ganj-i Arshadī* and *Ganj-i-Fayyāḍī* of the 17th-18th centuries. No detailed connected account is available about the course of studie or books prescribed for primary schools or *Maktab*. Ans obvious feature of the system of elementary education followed in those days has been referred to in *Manāqibu'l Aṣfiyā* and *Ma'danu'l Ma'ānī*. The students in a primary stage had to memorise the texts of some prescribed treatise including short lexicons and books of synonyms, so as to enable them to store up a copious vocabulary in the mind. *Makhdūm* Sharafu'd-Din deplored the system. According to him, it caused unnecessary labour and useless wastage of time. He writes, "When I was a child, my teacher got me to learn by heart a number of books like those which deal with infinitive or nouns and verbs (*Maṣādir*). They made me memorize the book consisting of 20 *Juzw* (each, perhaps, of 16 leaves) in one *jild* (volume) One of these was the *Miftāḥu'l Lughāt*, and every time I was required to repeat it word by word, withion their hearing. Instead of such books, they could have done better if they had got the *Qurān* fixed up in my memory". But perhaps this had sharpened his intellect, had given him a highly retentive memory, and also the power of facile, fluent, writing, as we find from his books. The early curriculum, besides the *Qurān*, appears to have consisted of grammar and some amount of poetry, traditions, Arithmetic and calligraphy. The study of science like astronomy, mathematics, algebra, geometry,

branch of literature which flowed trom the pen of Vidyāpati, for he rightly says that "Mithila was not governed by Muslim rules and regulations". Moreover, *Likhnāvalī* deals more with socio-economic matters which the Persian works on *Inshā* are largely taken as concerned with matters, cultural and historical. References to *Khudā*, *Sulṭān*, *Pargana*, *Rupya*, *Tanka Muqaddam*, etc., and the contents of letter no. 48 are not without some significance.

Of the two main pillars of Muslim education, the *Maktab* and the *Madrasa*, the first was the elementary school. The traditional age for the commencement of the *Maktab* stage is 5 years 4 months 4 days, but actually when a child was 5 to 7 years old his education began, some times at home of rich parents and more often in *Maktab* housed in small thatched mud-buildings. As they had first to learn the *Qurān*, practise *Qira't* (recitation) and memorize it, conbining it with instructive religious precepts and usages,and read lives of godly people. the mosque was not a fit place as school for all classes of children, lest they might defile its floor and wall. They might be taught near a mosque or a shrine of some saints. The boys had first to learn the *Qurān* and the rules of grammar and speech, and also rudimentary rules of arithmetic. When taken either to a *Khānqāh* (as in that of Biharsharif) under the great Firdausī saint, Sharafu'd Dīn Manerī, as we learn from his *Malfūḍ Ma'danu'l Ma'ānī* (*hereinafter MM*) or to a *Maktab*, the child was first made to commence learning to read with the phrase *Bismillāh*. Sounds of vowels and consonants, first separately and then combined, were uttered distinctly by the teacher to indicate just pronunciation. Letters of alphabet were written on a piece of paper or a wooden tablet or board called *Takhtī* for the child to be copied. The boy was made to put his fingers on each individual letter and imitate teacher in pronouncing and reading the from correctly. The elementary exercises for the beginners consisted of acquisition of the knowledge of alphabet, continuance or combination of letters, divisions

A boy was taken to the schools when he had attained his fifth or sixth year. The sounds of vowels and consonants, first separately and then combined, were taught to ensure correct pronunciation of words and sentences. Seated on the matted floor the young learner had to draw the character or the letters of the alphabets on a bed of fine sand spread out before them. They were given lessons in morals through little metrical tracts or treatises on ethics consisting of a series of maxims, intended to infuse religious feelings and ensure observance of duties due to God. The lead was given by a monitor who recapitulated the lessons and interpretations from the master to be repeated by all the boys, to fix the same upon their memory. The boys were also taught primary parts of Arithmetic consisting of numeration and land measures. They had to read bits of grammar, vocabulary of synonyms and metrical *Slokas* and *Sutras*. Roughly speaking, this was the six or seven years course of instruction in vogue in the Hindu system of education. The scholar was allowed to leave the school at 12-14, to seek some employment after undergoing a sort of test or examination of the lessons learnt. He might continue to pursue his studies in higher stages elsewhere in Sanskrit *Tols* or Colleges for specialist at Benares, Nadia, Mithila, etc.

R. K. Choudhary in one of the appendices of *Mithila in the Age of Vidyapati* has given translation of some selected letters from a very interesting work of Vidyāpati, called *Likhnāvalī*. To me it appears that he perhaps got a cue for such a work in simple Sanskrit in the form of letter-writing from the numerous works on *Inshā* in Persian under a special style of epistles called *Mulātifa*, of which there were various categories such as the highly ornate specimens in hyperbolic language embracing all sorts of themes and topics in *Risāi'lu'l A'ijāz* (hereinafter *RA*) of Amir Khusrau and the *Maktūbāt* of the *Ṣūfī* saints in simple intellegible language dealing with mystic themes and principles. R. K. Chaudhary may not find any such source of inspiration for this new

dary or college, stages, of the character and content of curriculum, the factors and forces at work in the development of education, and the important role played by the existing system in the social set up of the age, than to collect and sift the scanty and scattered materials as are still available in the works of authorities who were only indirectly concerned with education as a separate discipline. Such works are historical, biographical, literary and more specially religious and hagiological. The facts collected should be placed in due relation to the developments of thought and culture, learning and education. The few literary glimpses of social and religious life and of education in its social bearing that we can catch from the works of mystic *Ṣūfis* called *Malfūẓāt* and *Maktūbāt* and of the *Smriti* writers and also the prose works and versified effusions of some contemporary poets, show that education was thought then, as in ancient times, as a panacea for all evils and as a means of improving the moral and physical conditions of a fairly considerable section of population who formed the basis of the social pyramid. Education must have been widely diffused in the early Middle Age than is commonly supposed The Sultanate period was neither more nor less provided with elementary schools and institutions for higher instruction than any other period.

Education in the elementary and learned stages of both Hindus and Muslims was ordinarily meant for the acquisition of religious knowledge, to improve the physical conduct and moral efficiency, and then to develop qualification for profession, job and service. In the School system of the Hindus, with minor shades of differences in people of different parts of the country, teaching was done mostly in the mother tongue in open space or in teachers's house or in an institution called *Pāṭh Shalas* (Pāṭh = instruction, Shāla = hall) which existed in almost every village and was maintained by the members of the community. The teachers did not exact fees from scholars but accepted presents which had been established by custom.

subjects of study included many which were non-religious or secular, such as grammar, logic, philosophy, mathematics, astronomy, medicine, rhetoric and literature.

Besides the Europeans some Indian scholars have expressed their dissatisfaction at the state of things obtaining in India after the advent of Islam. Referring to the supposed intellectual and educational barrenness of the time, and writing specially about Sanskrit and Hindu learning, the Late Dr. Altekar had opined that it had fallen on evil days under the *Sulṭāns* of Delhi It cannot be denied that in the new political set up there was some palpable immediate harm to Sanskrit and Hindu learning and culture. As the writer in *Encyclopaedia of Ethics and Religion* says, the springs of princely liberality to the Brahman pandit were dried up; many of the sacred texts were ignored or even destroyed and temples and college in many places were demolished. There was a change in the life, thoughts, tastes and outlook of the people. Increased rigidity in caste system had made the scholarly people narrow-minded. It seemed that the days of highly scientific and philosophical works were gone. Astrology and ritualistic laws and regulations had eclipsed astronomy, mathematics and philosophy. But some changes, a narrow outlook and complaisant attitude, had already come long before the establishment of the Muslim rule in India as is evident from the testimony of Abū Raiḥān Aḥmad, more popularly known as Alberunī, the great 11th century Muslim Indologist.

Intellecutally, the Sultanate period was not as bad and black as it has sometimes been painted. As education, like practically all other departments of life amongst the Hindus, had been closely associated with religion, and Muslim education also in early Hindu age had been largely in the hands of theologians, jurists, and mystic *Ṣūfis* of different religious orders, there is no better way of forming a correct picture, and getting an intensive idea of intellectual life and educational system, both in the elementary primary and higher secon-

various *Ṣūfi Khānqāhs* both in the south and north Bihar fostered the cause of education. A Muslim child learned at home and in *Maktabs* reading, reciting and memorizing the *Qurān*, learning the rules of grammar and speech, some ethical or moral maxims, a few traditions and lives of saints. Those who entered the *Madrasas* attached to or situated near the mosques, carried on their higher studies. In early times people, Hindus or Muslims, thought it wrong to take pay for teaching. This was carried to extremes by Muslims in regard to the *Qurān* and religion. Though the devout were in favour of gratuitious religious instruction, there is vidence, of salary being paid to the teachers. It is a travesty of justice to say that the first rate *Madrasas* or Colleges, some two-storied and residential, like those of *Madrasa-i Mu'izzī* at Delhi, *Mu'izzī* school at Badaun, the College at Siri, at Firozabad, on Ḥauḍ-i 'Alā'ī and *Ḥauḍ-i Khās*, and the famous *Madrasa* of Maḥmūd Gawān at Bidar (Deccan) were not insti-tutions of public utility meant for promotion of learning and that the state shirked the respon-sibility/of teaching and did not exercise some supervision on what they had so richly endowed in cash and kind. While in Europe in the early Middle Ages there was no regular depart-ment of public instruction, India could boast of Colleges with adjuncts or boarding rooms and Libraries, and scholars were encouraged, respected and supported by State-grants and salaries. Evidences are not wanting to prove that education practically formed a part of state responsibility. Abul Faḍl refers to a *farmān* of Akbar which reads as follows : As far as possible the knowledge of arts and sciences should be spread so that men of merit should not disappear from the world. Their contributions must survive for posterity". This must have been the attitude of the Turk Afghan rulers of Delhi and of the provincial independent Muslim states which richly endowed the educational institutions they had established. The development of scientific knowledge under the Abbasids and the Saljuqs could not but have its effects on the institutions established in India. The important

.reatise on Education in all its aspects, character and tendencies, extent and institutions, subject matters in elementary and higher stages, etc. No such contemporary work has come down to us.

There are critics who say that public schools elementary or primary and secondary which in Europe were a part of a system of free school, endowed for general use of the public and maintained by public taxes, with prescribed courses of studies, controlled and supervised by local authorities, did not exist in India. There was no state department of education. The State did not trouble itself with the work of teaching, and the entire system of eduction was built up and run on a purely voluntary basis. European scholars opine that although learning was regarded with highest veneration in the East, specially in India, it never attained a scientific attitude. The spirit of the age in India and elsewhere was the spirit of authority, of blind faith and unhesitating obedience and allegiance to the teachers who were mostly theologians and of priestly order. The principle of authority had dethroned human sense and reason. Scientific matters were subordinated to theology, logic, rhetoric and law which were the chief subjects of studies. Mere book knowledge, reading without understanding, stress on cultivation of memory for memorizing stupendous sacred books, and lack of organization worth the name are some of the fault and deficiencies pointed out in the medieval system of education existing in both Hindu and Muslim circles.

Since there was no public education system, boys learned how to read and writer at home. There were also mosque and monastic education. Our state, Bihar, derived its name from *Vihara* which was a centre or seat of learning where a number of famous scholars imparted knowledge in various branches to earnest students of *Hinãyana* Buddhism. There were considerable educational activities in the traditionol Hindu and Muslim systems of learning in such centres as Maner, Biharsharif, Gaya and Mithila and Tirhut. The

in the form of his sayings and actions, inculcating the need, in fact the obligation, to acquire knowledge even by undertaking long and distant travels for the development of critical spirit and formation of character, and for acting and thinking in upright ways. One of the traditions, whether authentic or apocryphal, says that a father can confer upon his child no more valuable gift than a good education. On the other side, much is said about the lofty ideals and high aims and purposes of the system of educations prevalent in India since the time of the Guptas and even earlier in the Buddhist and the Brahmanical periods. We are told about educational institutions, famous centres or seats of learning, the subjects of study which are said to have embraced various branches of religious and secular education, and the noble character and high ideals of the teachers who taught the young scholars in their own abodes as a matter of duty, and not for payments. The renowned scholars occupied an important position in social life because of their selfless character, deep knowledge, Sastric abstruse studies and wonderful feats of memory. The Muslims also refer not only to the educational institutions for higher learning that had sprung up in various places of Islamic lands outside India and were source of inspiration and served as models of colleges and schools founded and patronized by Muslim sovereigns who ruled over India at various times and were eager to do something for their faith, and, as some of the adverse critics say, for the benefit of their souls rather than for public good. There were rules prescribing duties of, and relationship between parents and pupils, teachers and taught. The Three R's, Reading and Writing and instruction in simple Arithmetic, were regarded as the basic elementary studies and the foundations of education. Education in higher stages was characterized by grammatical exercises, letter-writing, poetic and rhetorical compositions, oratorical practices, debates, discussions and disputations. Significantly enough, however, nobody either amongst the Hindus or Muslims, realised the need even of a handbook and much less of a comprehensive

In *Ganj-i Lā-Yakhfā*, we get a description of *Samā'* as it was practised in Bihar *Khānqāh*. First, there was a recital of the *Qurān*. There were *Qārīs* (readers of the *Qurān*) and *Khwshkhwāns* (sweet-voiced minstrels called *Qawwāl* or *Goindagān*). First an *'Ashari* (ten verses, of the *Qurān* were read, and then the *Tutrib* (singer) sang some verses of a *Ghazal* in Persian, which were sometimes tuned on an instrument. The *Makhdūm* was often seen moved to tears, absorbed and overwhelmed. When he regained his form he uttered twice *Astaghfirullāh* (God, forgive me), and renewed his *Wuḍū* (ablution). He did all this for losing control over himself for the moment. If the mystic singer himself came or was brought by somebody, the audience were permitted to have the *Samā'*, for it was forbidden only to men of evil passions and not for good men. Once there was a *Samā'* on the conclusion whereof the *Makhdūm*, addressing the audience, quoted some verses "I bring to your ears two things from the tongues of *Samā'*. *Samā'* is a matter of moment for you, and you are an instant for it". Once when the mystic minstrel, in a garden outside the *Khānqāh* switched on from[32] Persian verses to those of *Hindawi*, and the audience were carried to the highest pitch of raptures, the Makhdūm suddenly ordered the break up of the assembly. When questioned sometime after by an attendant, Sikandar, the *Makhdūm* said that the *Hindawi Jakari* or *Chakri* songs were usually sung by women and they were very soft and lust-exciting which might have caused mischief for young men had crept in the assembly, and they were incapable of understanding or apprecating the true purpose and spiritual import of mystic songs.

IV Education.

Much has been laid down by theorists, both Hindus and Muslims, about the respect due to learning and about their respective educational ideals. Hindus savants have propounded the theory of education, and it has also been a frequent topic of Muslim traditions. There are traditions or *Aḥādīth* ascribing many things to the Prophet of Islam, both

Now we may turn to some other, informing, sidelights on matters of ethical and cultural interest found in the *Mulfūẓāt*. In their dress and diet the *Ṣūfis* of Bihar were very simple and sparing. The clothes worn at different times, and referred to here and there, consisted of ***Rīda*** (cloak or mantle), *Qamīṣ* (shirt of cotton), *Jubba* (a loose, wide-sleeved outer vestment), *Qabā* (a tight-fitted coat with buttons, loops and opening below the neck), *Pairāhan* (a loose vest or shirt) *Mirẓa'ī* (an under-jacket with big sleeves and open cuff) *Tahband* (strip of cloth worn round the waist and passing between the legs) *Izār* (trousers, covering the body to the middle of the leg, and even below that) *Dotahī* (a double-folded garment having two thicknesses or layers), *Bārā'inī* (a cloak which kept out the rainwater), *Do-patta*, *Dastār*, *'Amāma* (big turban of folded sheets) and *Ṭāqia* (fillet, specially worn under head-dress) have also been mentioned. The Sūfis said that silken clothes were forbidden to men.[81]

Samā' (mystic songs sung in audition parties).

Though not oblivious of the Islamic injunction against the tripple taboo (wine, music and painting of living being) specially of the edict, *Al-raqṣ wa'l Ghinā ḥarāmum*—(dancing and music are forbidden), the *Suhrawardiyas* and *Firdausiyas*, like the *Chishtiyas*, allowed music under certain conditions of *zamān, makān akhwān*, (time, place and people present), but they were more restrained and did not fall victims to the charms of Indian music, as was the case with the latter. As for the *Shaṭṭāriyas*, they had no fondness at all for the *samā'*, being immersed as they were in their own peculiar all-absorbing *dhikr* and *ashghāl*. There are frequent references to musical assemblies and ecstatic conditions occasioned by mystic songs sung in audition parties called *sama'*, but never could any one of the saintly personages in Bihar 'rotate on his legs' so as to be dubbed' "*Pīr-i raqqāṣ*, like those of the *Chishtiyas*."[82]

sion of obligatory duties, and was tinctured with corruption, superstitions and beliefs in charms and omens, witchcraft and trivialities. People took vows to do this or that if they got what they wanted in the shape of relief or aid, but when their purpose was served they backed out from their solemn promises. Some had devised clever methods of escaping from the obligatory payment of *Dhakāt*[29] (portions of Muslim property given in charity). They took recourse to *Ḥila-i Shara'ī* (legal fineness) which became *Ḥila-i Ḥarām* (forbidden fraud). They put the amount of *Dhakāt* in a tray and covered the silver with a quantity of grain, and offered it to an indigent person. When the latter was about to return he was called back and induced to return the tray for a few *dirhams* (silver coins) and in this way they got back what they seemed to have given way. Another ingenious way centred in what was technically called *Ḥaulān-i Haul* (passing away or turning round of one whole year). In the eleventh month, before the needed expiry of full year, they sold their goods and property which were liable to the levy of *Dhakāt* to their wives, and this gave them the aplea that they had nothing to pay *Dhakāt* for. Some time after they made a show of purchasing the same from their wives. The saint condemned such trickeries.

Again, though there were many *qāḍis* and *Muftīs* amongst the addressees and the audiences of the *Makhdūm* of Bihar, dereliction of duty and misuse of power on the part of some had made their office unpopular. The *Makhdūm* and his scholarly Balkhi successors[30] in their letters to intellectuals such as *Maulavī Hamīd* and Ṣadru'd Dīn, expressed their disapproval on accepting such office.

Men believed that burning of the crust of onions and garlic in the house, and sitting near the doorways caused penury, and use of common and broken combs and common towels led to poverty and separation. The Firdausiya and the Shuṭṭariya saints gave amulets (Ta'wīdh) asking protection from the Deity.

moved the saint Makhdūm almost to tears, and the other one ran thus,

> *"sagar kuwe patāl pani lakhan boond bikāye*
> *bajar paro teh Mathura Nagari Kānha piyase jāye"*

There are more intelligible, almost good specimens of *Khari bolī*.[23]

Social Customs :

The *Malfūzāt* tell us much about what happened to a Muslim from birth to death The *Ṣūfīs'* attitude in regard to some of the practices which had arisen without any express sanction appeared to be that they might be avoided but should not be interfered with as a large number of people had become customed to the same, and there was no *Nass* or manifest prohibitory text. Such were the practices of *Bāng-i-Adhān*, delivered to the ear of a new born child; lifting of two fingers,[24] kissing them and placing them on the two eyes on hearing the name of Prophet Muḥammad in the *Adhān* : ceremonial naming or clothing of the child on a particular day; using lime to flavour the betel-leaves made out of crushed oyster-shells[25] which had once caused a row at Sonargaon; each one present at a burial, throwing a clot of earth inside the grave[26] and rose-water on the shroud and flower on the tomb; the *siyūm* ceremony on the third day of death; observing the fast called *roza-i- Mariam*[27] on 15th *Rajab* and on *'Āshūra* or 10th *Muḥarram*; applying on the latter day collyrium to the eye and cooking *haft dāna* (now called *santanja*) out of seven cereals, in commemoration of what had happened with the survivors of *imām* Ḥusain's family at Karbala; fixing of 20,000[28] as dower for the bride; assemblage of a large number of men and women and excessive ceremonies 'carried to a high pitch' on the occasion of marriage.

Moral Standards, Superstitions, Beliefs :

There are also references showing that the prevailing atmosphere was charged with lying, cheating, deceitful eva-

with the Hindus. Adverse questions and protests raised by the purists and zealots were silenced. It was said that Muslim women imitating[19] the Hindus put vermillion on their heads, to which the *Makhdūm* replied that there could be no objection if they did so to beautify their person and please their husbands. There were many things, food and garment, water and oil, etc which all of us shared. The question of *Tashabbuh* (similitude) came only when something was done as obligation of faith and was opposed to the fundamentals of Islam. When asked about the great *Saturnalia*[20] of *Holi*, the saint said that it was treated by the Hindus as a religions obligation, and if so, should be avoided by Muslims.

That the impact of Hindu society was felt in many ways on the Muslims, and even the saintly personages could not help reacting or responding to diverse environmental stimulus is undeniable. The *Makhdūm* spoke of his great teacher as *Maulāna kākā* Seeing smoke coming out of his house in day-time he ran to his mother whom he called *Māmun*[21], and reminded her of the established convention of not lighting fire for food but once during night. We find references in the *Malfūzāt* to such sobriquets as *Khwāja* Gangu, *Khwāja* Mamman Multānī, Shaikh Langotī, also called Fakhru'd Dīn Dīwānā Shaikh Laddhu, Shaikh Ghulāti, Malik Nāthan, Rāja Kalwānī, etc. There were also men of lower order such as Chajju Gawa'ī, and Jojan Khwush Khwān (one who read or sang sweetly).

Evidence is also not wanting of assimilation of local languages and use not only of simple words, such as *bhang, bhāt, khatt, khirkī, khaddī, dol, badhna, hal, dhakka*, etc. but also of the occurrence of more than half-a-dozen *dohras* (couplets) in the *Maktūbāt* of Muzaffar Shams Balkhī,[22] of which one, when recited by a wandering *faqīr*, playing on his one-stringed *ektāra*,

"ekat kandi bedha bahutar bharke gā'in
chinta heen man ichcha maran tetahi nāhin"

the officials and nobles of Bengal to the plight of Darwesh-like businessmen fallen on evil days who would never open their lips before others. In the *Khwān-i Pur Ni'mat* we find the Makhdūm saying, "When I was in my old cell[17] (apparently, Rajgir) the ruler of the place was a *Malik*, and the poor and the indigent of the region pestered me so much that I began to feel tired of writing papers of recommendations. He was however reminded by a *Shaikhzāda* of Chishti of his great ancestor, *Khwāja* Maudūd Chishtī, who despite repeated repulsions and humiliations continued to approach even personally the ruler of the area for redressal of grievances and rendering help to the needy ones. The *Ganj-i Lā-Yakhfa*[18] of Husain Mu'iz Balkhī records that among those who attended the 18th *majlis* there were Malik Badh *Kotwāl* and Saiyid *Saiyidu's Sādāt*, the *Kātib* (official, secretary). Addressing them, the Balkhī saint said that a Hindu had come and complained that the authorities of the *Dīwānī* were demanding from him *rusūm* (customs duties or taxes) which he had not been called upon to pay at any time. He asked them to give him relief and protection, and exempt him from new demands. He observed that infidelity and faith, orthodoxy and heresy, were technical terms and should not be stretched to apply to men of religions, sects and schisms, and did not come against care and consideration There is no real enmity in anything and against anybody. Profane or superficial enmity was largely occasioned by selfish desires and interests. He cited the traditions about Prophet Moses who was warned up by God for not responding to the call for help from a repentant Pharaoh when he was in a drowning stage, and about Prophet Abraham for denying shelter to a creature of God on the ground of being a non-believer.

Indian Cultural Influences :

Some practices and customs and ways of life essentially Indian and Hindu had crept into Muslim culture due to long and close proximity and neighbourlines of residence

which was a Semitic interpretation of mysticism to the Aryan mind found favour with the Indian Aryans. There was no question of any element of compulsion pressure or even of persuasion. Conversion of non-Muslims was no part of their mission and they spoke seldom about it, and yet *Ṣūfi* saints were largely responsible for the peaceful penetration of Islam in India. The desire to escape from social oppressions or to raise themselves to a higher social, moral or cultural level or conditions had undoubtedly drawn many of the down-trodden Indians to Islam. There were fewer cases of men of higher strata, specially the intellectual classes accepting the simple faith of their alien rulers. We, however, learn from the *Malfūẓāt* that an eighty years old Hindu came to the *Khānqāh* and voluntarily embraced Islam. Another *Yogī* of handsome appearance felt so inspired on seeing the Manerī saint that he called him *Rūp Kartār*, and afterwards became a Muslim. Yet another entered into an argument with the saint, and used some harsh words and turned back. The saint gave him a patient hearing and assured the audience that he would come and become a Muslim. The tombs of the two *yogis* near the saint's (Makhdūm Sharafud Dīn's) tomb are pointed out to this day.

Ventilation of Public Grievances :

There are instances of various kinds of responses of the *Ṣūfis* to their environment. The *Ṣūfis* in general, and specially the Firdausiya *Ṣūfis* of Bihar, were large-hearted latitudinarian in their views and very liberal in their attitudes, of sympathy and understanding. There are many references to their written recommendations for help to the poor and deserving people to] the kings and nobles. They would not accept jobs and *Jāgīrs* from the high and mighty, but would go out of their way to help the poor, and never ignored them. It would suffice to refer to the letter which the *Makhdūm* wrote to Fīruz Shāh Tughlaq and to *Malik Mufarriḥ* and to the many letters of the Makhdūm's Balkhī successor, Muẓaffar Shams Balkhī, calling the attention of

happen if this city becomes denuded of *naddāfs* (cotton dressers, carders)." This show an awareness of the importance of the artisan class. The *ṣūfis* thought that the relation between members and society was with reference to the sphere of action, and it was one of social co-existence.

References are not wanting to women. Sufism had provided many with opportunities to give themselves up to a life of devotion, and some had attained a state of conscious spirituality, perhaps far ahead of male members. But is was not permissible for them to assume the position of a religious guide or *pīr*, and initiate a neophyte by the usual method of giving or placing hand on hand (*dast bar dast*) in compact, cutting a few hairs of his head with scissors, giving a khirqa a *ṭāqia* and a *shajra*. In this connection, a letter of the 15th century saint Abdul Quddus Gangohī addressed to a pious talented Afghān lady, *Bābā Khatūn*,[14] found in his *Maktūbāt*, forms interesting reading.

Once *Makhdūm* Sharafu'd Din observed that the things which are prescribed in law include what is done as a habit for love of wife and children. But he warns that some women were *rahbar* (guide) while others were *rāhbur* (highway robber), the former encouraging and helping their husbands to pursue the path of truth devotion and submission, and the latter intercepting the road of truth and leading the husbands astray from the right way. There might be *Khula'* in the case of the latter, setting them free or resigning the marriage settlement, as was *Ṭalāq*, permissible for men.

Missionary works, Peaceful Conversions to Islam :

Some Muslims may have been intolerant, but Islam and Sufism were not so. True, there were some cross—currents of thought, one advocating puritanic aloofness from non-Muslim idolatory, while many others believed in toleration and sympathetic intercourse. The *Ṣūfis* were quite conscious of the socio-moral aspects of the situations which without any effort and necessary activities on their part might bring many into the fold of Islam. Sufism

barbers, etc. These earned their bread by lawful means and had catered to the needs of mankind since olden times. The saint condemned beggary and advocated *kasb* (earning), or the conception of vocation or calling, that is doing manfully the work to earn bread for himself and his family, and not to accumulate wealth. *Kasb* or labour for earning bare necessities of life was substituted for the old ascetic ideal of renunciation of the world. *Kasb* was an indispensable precept (*Farḍīat*), but with conditional conjunction of necessity. There should be no hoarding, and the means must be lawful.

As practical people, the *ṣūfis* dealt realistically and sensibly with every-day works and activities of the labourers, poor women, and pious persons earning their bread by hard work, and also of honest men urged by the promptings of sex. The *Kanīzgān* (slave-girls) who had to soil their hands and feet with dirt and mud when they thronged round the wells to draw water could not be expected to complete purificatory wash before sitting down to cook and eat their food. Workers in the field and labourers (*Kām Karān*) who came barefooted were allowed by the Prophet to enter and offer their prayers in the mosque. Impurity did not lie in the dust trodden by the feet, and *fatwa* or religious decree about such dirt and nastiness would be oppressive to many people. *Maulāna* Muẕaffar was very glad to know that his disciple in Bengal, *K͟hwāja Ḥamīd*[12] had at least performed *Nikāḥ* which was a Divine Command. He had advised a disciple to purchase a slave-girl (*Jāria*) as to avoid sins.

The *ṣūfis* often quoted the two dicta of the Prophet; "Give to men what were their rights", and "Place men in their proper ranks"; and *Makhdūm* Sharafu'd Dīn cited an instance of different ways in which 'Āyesha, the Prophet's wife, received a simple believer and a *muḥtasham*[13] (grandee) and he said that, "some rose to be rulərs, some *Wazīrs* and high officials, *K͟hān*, *Maliks*, *'Ālim*, yet the people of lower orders had also their role to play What would

non-Muslims, and also lower classes of people that surrounded them. The social constitution of the Muslims recognised two broad divisions, *Ahl-i Saif* (men of the sword) and *Ahl-i qalam* (men of the pen) Besides the rulers and members of the military aristocracy, such as *amīrs, maliks, sipahsālār, maqta' kotwāl,* etc., who ran the local administration, there were *imāms, qāḍi, Khaṭībs, muḥtasib, 'ulamā and mashaikh,* who were in charge of the ecclesisstical and judicial functions and looked after the moral and religious as well as educational needs of the people. The oft-quoted Arabic expression, *La Rahbāniata fi'l Islām* means that there is no priesthood in Islam, and Muslim society was theoretically casteless, but the democratic fraternity could not escape the contagion of social distinctions in its Indian environment.

The Saiyids who claimed descent from the Prophet of Islam, and the *saints* called *Shaikh, Pīr, Makhdūm,* etc. were so highly esteemed and even venerated that a critical Muslim writer has described them as 'the Brahmans of Islam'. The respect paid to them is evident from the way in which they have been frequently referred to in the *Malfūẓāt*.

There was another element, the commonalty of Muslim society, consisting of various classes of people, such as artisans, craftsmen, petty-traders, clerks, domestic servants and slaves, and a large section of the converted Muslims. The student community appears to have been a vocal section, often agitating and demonstrating against what it considered to be unlawful and heterodox practices.

It is occasionally that we come across such people as *chākars, nafar* (servants, attendants) *Jāria, Kanīz,* (slave-girls and female servants), *pārah doz* (tailors) and *na'lain doz* (shoe-makers, etc.). In his commentary on *Adāb, Makhdūm Sirāju'd Dīn* refers, besides *Kushawarān,* (argiculturists) and *Ahl-i Ḥirfa* (artisans) to many type of workers, such as carpenters, workers in leather, carriers of burden, tailors, sack-makers, fullers, boot-makers, spindle-makers black-smiths,

(*malāmat*) and *kitmān* (making orthodoxy a veil for piety) could never commend themselves to him.

Now a word about the *Makhdūm's* attitude towards *kashf* and *Karāmat* (manifestation of things marvellous and miraculous wrought by inspired people). He said, *Masha'ikh dar ḥaqqi-i-khud Karāmat rā bar makr hamal kunand* (saintly personages charged *karāmat* ascribed to them to be nothing but fraud and deception).As regards, *Shaṭah* (or meretricical words uttered in a flashy way in ecstatic conditions, such as *Ana'l Ḥaq* of Manṣur and *Subhānī Mā Ā'ẓam Shāni* of Bāyazīd Busṭāmī. They were, according to the Makhdūm, outwardly blasphemous but they were due to inward spiritual purity. But such things should not command confidence nor should they be dismissed outright.

We may take a passing notice of some strange bits of trifles and *trivialities* accepted by many as realities. Sometimes things happened by their contrarieties. Could anyone imagine that the great scholar and philosophical-minded intellectual who disclaimed all that was ascribed to him as contrary to nature, would suggest that certain verses of the *Qurān* should be recited as a cure for snake-bite; worse still, offer a diagramatic figure[9] with letters of *jamal* (*abjad*, an arrangement of the Arabic alphabet according to their numberical value from 1 to 1000) and inscribed on two earthen vessels which had to be taken in hand, gazed at and then pressed down (so as to relieve the pangs of child-birth), and would impose his implicit belief in *seḥr*[10] (enchantment), *afsūn* (spells and incantations) *Fāl* (augury), including *Fāl-i Muṣhaf*, and *Ta'bīr-i-Roya*[11] (interpretation of dream of which the earliest expert, according to him, was Ibn-i-Sirrin).

Aspect of Social Life as revealed in Hagiological Literature; Social Groups :

The *Ṣūfi* literature available throws some light on the relations between the *Ṣūfis*, on the one hand, and the Court, the different Muslim social groups, ascetics and

Rajgir as a *Jāgīr* for the upkeep of the *Khānqāh* which had to be built for the saint of Bihar Sharif. The saint would not accept the *Jāgīr*, and he preferred to deliver his sermons by sitting under the "*Do chapra*" Niẓāmu'd Dīn *Maula* had set up for his weekly sermons out of his legitimately earned money or *māl-i-muzakka*. He had, however, to relent on the personal entreaties of the governor, who told him what he was likely to expect from the despotic *Sulṭān* if his orders were not carried out. It is not a fact, as stated in *Mūnisu'l Qulūb*, that he had to undertake the streauous journey to Delhi, where he arrived after the death of the *Sulṭān* and the deed of the *Jāgīr* was returnêd to his successor, Fīruz Shāh Tughlaq. It was only once that he went to Delhi, and the *Jāgīr* was returned fifteen years later to Fīruz Shāh when he, on his way to Bengal in A.H. 754, stopped in Bihar and paid a visit to the great saint. The valuable information is found in the *Maktūbāt* of Ḥasan Mu'iz Balkhī, and we can infer the date of the establishment of the *Khānqāh* (754) from it.

The *Makhdūm* sometime spoke about people known as *majdhūb*,[8] *qalandar* and *mūlahān* whose ways, habits, and atti-tude he did not approve of. The *qalandars* were a group of ever-itinerant *darweshes* with shaven heads beards and eye-brow, who abandoning everything of the world, led a vagrant life. The first to be called a *qalandar* was Yūsuf, belonging to one of the *Bektashi* orders. He flourished in the 14th century A.D. These perpetual wanderers sometimes led boisterous life, were rude fellows addicted to intoxicants. Unlike them, were the *muwallahān*, or a group of attracted, struck and dis-tracted people suffering from love, grief or fear. These along with the people called *majdhūb* were all unorthodox in their doctribal position. The *Makhdūm* and other *Ṣūfīs* had no sympathy for those who thought that the rules of religion and obligatory duties of *shara'* existed for others and not for themselves, and for these who posed to be wedded to spiritual purification in retirement (*'uzlat*). The doctrine of blame

But the ways of his friend, the renowned saint of Bihar, were different. His *Maktūbāt* contains letters written in reply to emperors such as Muḥammad Tu<u>gh</u>laq, and Fīruz <u>Sh</u>āh Tu<u>gh</u>laq, princes such as Dāwar Malik, governors such as Mufarriḥu'l Mulk and Ḥesāmu'd Dīn and officials and nobles too numerous to mention. The learned *Maulāna* Mrẓaffar <u>Sh</u>amsh Bal<u>kh</u>ī, who had given up his job in Fīruz <u>Sh</u>āh's Arabic College, situated in *Kūshak-i-Lal* at Delhi to become the disciple of the great saint of Bihar, was so puritanical in his outlook as to shun all worldly things and give away in charity even his books. He tied his *Izār* or close-fitted trouser with a 'munj' string, and gave up even his wife, divorcing her and himself arranging her marriage with another, least his growing affection towards her should affect his devotion to God. Yet he was also on terms of correspondence with *Sulṭān* <u>Gh</u>yāth<u>u</u>'d Dīn of Bengal. Ten of his letters, addressed to the *Sulṭān*, of course relating mostly to religious matters, are found in a voluminous work left by him. Thus, these saints had no aversion towards rulers and men in power and recognised the utility of their high offices and position. Yet, they would never bow before them, nor would accept anything at their hands. At times the great saint of Bihar would recommend genuine cases of poverty and piety for favour and help and was prepared even to suffer personal discomforts and humiliation to relieve the wants of the helpless and the needy. But he would have nothing for himself and in his admonitions to kings and officials he was qnite frank and did not mince matters. This is evident from the letters he wrote in reply to that of Muḥammad Dāwar Malik the *Dāmād* (son-in-law) of Muḥammad *bin* Tu<u>gh</u>laq.

When Emperor Muḥammad *bīn* Tu<u>gh</u>laq learnt that on the eutreaties of his followers the great saint of Bihar had condescended to descend from the Rajgir hills and travelled on foot every week to Biharsharif, he sent a Bulgarian prayer-carpet as a present and ordered Zainu'd Dīn Majdu'l Mulk, the *Maqṭa'* or governor of Bihar to bestow something from

the *Gawālas* (milkman) who was named Ṣādiq and about Dariyā Khān Nūḥānī who at first refused to interfere in the matter, but later ordered for building of a resting-place for the saint-preacher.

The Maḍāriya order was also active in Bihar. The greatest of the four disciples or *Khalifas* of Khwāja Badru'd Dīn' Madār of Makanpur, near Kanpur, when he died in 1440, who gave some lesson in *'Awārif* to Balkhī saint, Ḥusain Mu'iz, was the extremely pious and ascetic personage, Jamālu'd Dīn Hurmuzi, popularly known as *Jaman jati* (*yatī*), who lies buried at Hilsa within a domed mausoleum which was built in 950/1593 by Jaman *Madārī* of Darbhanga. Shāh Kangan *Dīwāna* who lies buried in Bihar town was also a disciple of Shāh Badru'd Dīn Madār. The Madāriya *Qalandars* have their own peculiar practice of performing their devotion. Some of them walked on fire, and wore iron on their arms.

The Firdausī *Silsila* stands midway between the Qādriya and the Chishtīya Orders, whose saints were indifferent towards politics and shunned all connections with royalty and men of noble rank and position, and the Suhrawardīya and the Shuṭṭarīya, who did not abstain from all kinds of associations with kings and nobles, and felt no scruples in accepting not only such ecclesiastical jobs as those of the almoner but even *jāgīrs* and favours which they used for the benefit of the people. They held that high position does not do harm to those who know its antidote. The well-known Suhrawardīya saint, Saiyid Jalāl Bukhārī known as *Makhdūm Jahāniyān Jahān Gasht* of Uch in Sindh was held in high esteem not only by the greatest saint of Bihar but also by Emperor Fīruz Tughlaq. and his capable *Wazīr*, Khān-i Jahān Maqbūl. Powerful governors like 'Ainu'l Mulk and displaced rulers of Sindh, like Jām Khairu'd Dīn Jām and and Jan Babinia sought his intercession. He used to come very often to Delhi and his recommendations for favours for the poor and the needy was always accepted by the king.

Ashrafiya *Khānqāh* of Bitho (Gaya), founded by Saiyid Abū Sa'yeed *Katha nawāz* is linked with Akhī Sirāj and 'Alau'l Ḥaq of Pandua through Ashraf Jahāngīr Simnani of of Kachchaucha (district Faizabad in U. P.).

The Chishtiyas of Bihar were also connected with those of Jaunpur. For example, 'Abdul Malik of Ushri, (district Saran; d. 911/1505), the father-in-law of Saiyid Ḥasan, the ancestor of *Pīr* Damariya Saints of Husanpura, Hajipur, Patna and Khalifa Bāgh (Bhagalpur), was himself the disciple of Muḥammad 'Īsa Tāj Ṣiddīqī of Jaunpur. Quṭbu'd Dīn *Binadil* of Jaunpur (d. 925/1518) was not only spiritual guide and father-in-law of Faḍlullāh Gosā'in of *maḥalla* Daira in Bihar town, but also the inspirer of a large number of Chishtiya, Qalandriya, Madāriya, and Qādriya saints of Bihar. Khwāja Zainū'l 'Ābedīn *alias* Saiyid Zāhid Sāranī, the father in-law of the aforesaid *Qāḍin*-'Ola Shuṭṭārī of Vaisali, was the author of *Khazāna-i Zāhidī*, which is a commentary on *Tafsīr-i Qaiyyam* of Maliku'l 'Ulama Shihābu'd Dīn Daulatābādī of Jaunpur (d. 848/1494). Shāh Ḥāfiẓ Naṣiḥī was a Chishtiya saint of Saran, and the spiritual guide of Shāh Daulat of Maner. He was the disciple of *Miyān* 'Abdullah, son and successor of the well-known Jaunpur saint, Khwāja Jalālu'l Ḥaq *Qāḍī* Khān *Nāṣiḥī* of Zafarabad (d. 944/1537).

As regards the Qadriya Order, it was introduced in Bihar in comparatively later times. The first important personage of whom we have a contemporary account by his companion, 'Alī Sher, who lies buried at Kutumba in Aurangabad subdivision of Gaya, was Saiyid Muḥammad of Amjhar, a direct descendant of the celebrated 'Abdul Qādir Jilānī (d. 561/1166). We get from *Manāqib-i-Muḥammadī* of 'Alī Sher that Saiyid Muḥammad Qādrī came to argue with the Kol chief of Kutumba, Domra and other places in Aurangabad region on the injustice and oppressive activities of Karman, a brother, and Chandar, son of Jowan, the Kol *Rāja*. We are only told about the conversion of the chief of

what is called *Choti Dargāh*. His sister is said to have been married with Shaikh 'Alāu'l Ḥuq of Pandua (d. 786/1384). Shaikh Badru'd Dīn Badr 'Ālam had first married a Rajput lady of Bihar who became the mother of Abdu'l Zāhidī a female saint of Bihar whose descendants call themselves Abdālī. His son, Shāh Shihābu'd Dīn *Pīr Qattāl* Zāhidī, the founder of Qattalpur Chowki in Saran, Shāh Abū Sa'yeed Zāhidī, Shāh Sulṭān Zāhidī all of whom lie buried in *Choti Dargāh*, were important personages. *Pīr* Badr had later entered into matrimonial connection with the ruling house of the Sharqis of Jaunpur. Some of the notable personages of Soh Dih, near Bihar town, belonged to the Zāhidī family, such as Ḥasiru'd Dīn Jayan, 'Alāu'd Dīn, Shāh Badr and Shaikh Fakhrūd Dīn Zāhidī. *Sulṭān* Sikandar Lodi during his stay in Bihar very often paid reverent visits to the last-named and was very particular in performing his Friday prayer along with Fakhru'd Dīn Zāhidī.

Pīr Badr 'Ālam travelled in East Bengal and stayed for a long time at Chittagong. He is reputed to have converted a large number of Hindu sailors to Islam. His place of *Chilla* in the western part of Bhikhsu Bazar in Chittagong was visited by Hindus and Muslims alike. The sailors and boatman class of Chittagong invoked his name as *Pānī Pīr*, while plying their boats on the water.

A disciple of 'Alāu'l Ḥaq of Pandua, Farīdu'd Dīn *Ṭawaila Bakhsh* (d. 897/1491) lies buried at Chandpura in Bihar which has a mosque of an earlier date (710/1310). He was the son of Ibrāhīm Chishti, who was the son of Jamāl *Auliyā*, a cousin of Nizāmu'd Dīn *Auliyā* of Delhi, and married a sister of the wife of 'Alāu'l Ḥaq of Pandua. After practising severe austerities under his spiritual guide, Nūr Quṭb 'Ālam of Pandua, (d. 818/1515) Faridu'd Dīn came to Bihar along with two others, specially Shāh Sa'ādat of Banauliya *maḥalla*, and 'Aṭāullah Baghdādi of Mariam tola. *Dīwān* 'Abdul Wahhāb (d. 1095/1681) of *Choti Takia*, Bihar-sharif, was his direct descendant. The Chishtī *Sislsila* of

at Delhi but had given up the job, came to Bihar and accepted the celebrated Sharafu'd Dīn Yaḥyā Manerī as his spiritual guide, prefering the Firdausi to Suhrawardi Order. Shaikh Sharafu'd Dīn never adressed him but as *Maulāna* and *Imām*. Shaikh Muẓaffar was a poet, but theology and mysticism were his special subjects.

The collecting of his *Letters* by his nephew and successor Shaikh Ḥusain Mu'iz Balkhī is very important for the development of the mystical themes, and also historically, for there are ten letters–some very long–addressed to the Bengal ruler Ghiyāthu'd Dīn Āẓam Shāh, son of Sikandar Shāh of Ilyās Shāhī dynasty. Shaikh Muẓaffar performed pilgrimage to Meccam and died in Aden.

We may now revert to the Chishti saints of Bihar and the links connecting them with those of Pandua, Bengal, and Jaunpur. Abu'l Fattāh Chishti, the founder of Qazi tola hospice at Danapur (b. 887 1482, d. 993 1585) was seventh in direct discent from Saiyid Mubārak Raḍvi, who is said have come to Bihar with his cousin, Mīr 'Alī Sher trom Jajnair in the time of the Khaljis 'Alī Sher died fighting with natives and lies buried in Barh town, but Saiyid Mubārak went to Bengal, became a disciple of *Akhī* Sirāju'd Dīn 'Uthmān of Gaur (d. 743/1342), a disciple of the famous Niẓāmu'd Dīn *Auliyā* of Delhi. He returned to Bihar and built a mosque and a *Khanqāh* at Danapur at a place where his *Pīr* had once stayed. Many of his descendants worked as *Qāḍī* till the end of the 17th century.

A remarkable personality much venerated both in Bihar and Bengal was that of *Pīr* Badr 'Ālam of *Junaidi* Order, who originally belonged to Meerut (d. *Rajab* 844/22 Dec. 1440). He was the great grandson of Fakhru'd Dīn Zāhidī (d. 704/1304) and grandson of Shaikh Shihābu'd Dīn *Ḥaq-go*, who was killed at the orders of Muḥammad bin Tughlaq for questioning his claim as *'ādil* or just king. He had been invited by Makhdūm Sharafu'd Dīn, but came to Bihar long after his death in 1380, and he lies buried at

of the *Sharqī* dynasty of Jaunpur. The fame of Shaikh *Qādin* Ā'lā spread far and wide. His *Malfūzāt*, edited by his son-in-law, Khwāja 'Alī Rājgīrī, and named *Ma'danu'l Asrār*, have come down to us. Shaikh Zahūr *Haṣār* Ḥamīd *Haṣār* (b. 835-1431) who was the spiritual guide of the two famous brothers, Shaikh Phool (murdered at the orders of Prince Hindāl) and the renowned Muḥammad Ghauth of Gwalior (d. 970/1562) and mentioned by Babar and Abu'l Faḍl) was the chief *Khalīfa* of the saint of Tunkol and he lies buried at Ratan Sarai in Gopalganj subdivision of Saran. Ghauth Gwāliārī was the *Murshid* of the scholarly and saintly Wajīhu'd Dīn Gujrātī of Ahmadabad. Shaikh 'Alī, son of the above-mentioned Owais *Shahīd*, was the founder of the *Khānqāh* of Jandaha, and his son Shaikh 'Alāu'd Dīn, and latter's great-grandson, Ruknu'd Dīn Abdul Bārī (d 1117/ were important figures among the *Shuttārī Ṣūfīs*. Khwāja 'Alī Manjhan *Dānishmand* of Rajgir, the son-in-law of Shaikh Qāḍin A'lā and his son, Mīr Shihābu'd-Dīn (d. 985/1577), and the latter's descendant *Maulānā* Manṣur *Muḥaddith*, the founder of the Rajgir *Madrasa*, and the son of the latter's brother, the famour *Pīr* Saiyid Imāmu'd Dīn Rājgīrī the author of many works, including *Manāhiju's Shuṭṭār* (completed in 1115/1703) deserve special notice.

Then we come to the most dominant of the *Ṣūfī* Orders in Bihar, which eclipsed all others and is still flourishing and is held as most respectable largely because of considerable mystic literature left behind by Makhdum Sharafu'd Dīn and his Balkhī disciples and followers, *Maulānā* Muẓaffar, his nephew, Ḥusain Mu'iz, and the latter's son and grandson Ḥasan, and Aḥmad *Langar Dariyā*. Their lives and works are too well-known and need not be dealt with here. Muẓaffar Shams Balkhī the highly intellectual and scholarly *Ṣūfī* Shaikh of the Fairdausi Order was born in Balkh but had migrated with his family to India and settled down in Bihar town and had accepted the Suhrawardī Order for himself He had acted as a principal of the Firuzī *madrasa* or college

married to Sulaimān *Langar Zamīn* Suhrawardī, the father of the famous famale saint, *Bībī* Kamālo of Kako (Gaya) and of 'Aṭāullah of Kujawan, and the fourth was the wife of Hamīdu'd Dīn *Ṣūfī*, son of Ādam *Ṣūfī*, and father of Taimullāh *Sufaid Bāz*, who lies buried in Bihar Sharif near the *Dargāh*.

The Chishtiya and the Suhrawardiya were eclipsed in the early medieval period by the Firdausiya and the Shuṭṭāriya, both off-shoots of the latter. The towering personality in the religious histoey of medieval Bihar was that of Makhdūm Sharafu'd Dīn, son of Yaḥyā and grandson of Isrā'īl, the eldest son of *Imām* Tāj *Faqīh*, the progenitor of a long line of saintly personages of Bihar. The great theologian of Jerusalem had gone back leaving three sons, Isrā'īl, Ismā'īl, and Abdu'l 'Azīz, to carry on the works of the faith in both south and north Bihar. Ismā'īl, his son Ṣalāhu'd Dīn, and grandson, Sulaimān, sent across the Ganges, had to fight against the Hindus who had opposed their missionary activity. *Mullā* Taqiya says that Ismā'īl had to fight thrice with the *Rāja* of Tirhut during the time of the Khaljī (perhaps 'Alī Mardān Khaljī, the murderer of Bakhtiyār Khaljī who was eventually killed by another Khaljī). Eighth in direct descent from Ismā'īl, was the celebrated saint of Bania Basarh, near Vaisali, named Shaikh Faḍlullāh[a] *Qāḍin*, bin A'lā ('Alāu'd Dīn) Shuṭṭārī. (d. 901-1496), the pioneer of the *Shuṭṭārī* Order in India. *Qāḍin* Ā'la was the ancestor of a long line of Shuṭṭārī saints. Of his three sons, Makhdūm Owais *Shahīd* (martyr) was killed by a Cheru Chief while attempting to build a mosque in Bania Basarh, where he lies buried. The tomb of the second son, Abdu'r Raḥmān, is situated in *maḥalla* Saraiyaganj of Muzaffarpur town, and Abu'l *Fatḥ* Hadyatullāh *Sarmast*, the third son, worked and died at Tankol on the bank of the Gandak at Hajipur. The Tankol saint (b. 882/1477, d. 946/1539) was seen observing his *Tai* fasting at the age of 14 by Ḥusain Shāh, the last king

a leather-garment...." An inspired *Ṣūfī* transported on the wings of mystical fervour, he became at times immoderate in his pantheistic utterances so as to expose himself to the charge of blasphemy. The *Wujūdī* (Unitarian) were orthodox Muslims alive to the needs of restraint. The Shaikh, Aḥmad *Chirmposh*, himself wrote, "At times Aḥmad felt inclined to disclose the secrets; but *Shara'* became the arguer and preserver; It behoves you, O'Aḥmad not to reveal the Secrets of Truth". He was a clear-headed poet and ascetic, a latitudinarian, very liberal and even patriotic in his views. "Islam and *Kufr* (infidelity) become one and are of the same hue through love to those who are swimmers in the Divine Ocean. Regard all religions as one and look on them all as one, for Divinity. is one and unitless. There is no duality in my religion. I regard the whole world as one."

Besides his *dīwān*, consisting of 1280 poems, of which five are interpolated, reminding us of the thoughts of Rumī, 'Irāqī, Aḥmad Jām, Niẓāmī, Maghribī, Anwarī, etc., there is a small book in verse containing his sayings. The booklet comprising nine chapters styled *Ḍiyāul Qulūb*, and it was composed by 'Alāu'd Dīn 'Alī *bin* Ibrāhīm *Ṣūfī*. The saint of Ambair was a disciple of 'Alāu'd Dīn *Chirmposh* of Puraini (Bhagalpur). *Sirat-i-Firuz Shāhī*, and *Rafīqu'l 'Arifīn* of Hesāmu'd Dīn Manikpurī tells us in details about the interview between the Tughlaq Emperor and the saint of Ambair.

Some of the earliest personalities of the Suhrawardī Order were closely connected with Shihābu'd Dīn *Pīr Jagjot*, a *Qāḍī* of Kashghar, who came to preach his faith in Bihar, settled down and lies buried at what is still known as *Kachchi Dargāh* in Jethuli near Patna City on the bank of the Ganges. He died on 21 *Dhiḥijja* 664/15 September 1266 in the time of Balban. Of his 4 saintly daughters, one, *Bībī* Raḍiya, called *Barī Būa*, was the wife of Yaḥyā Manerī, son of Isrā'īl eldest son of *Imām* Tāj *Faqīh*, the other was the wife of *Mūsa* Hamadānī, the father of Aḥmad *Chirmposh*; the third was

As a strict adherent to the Islamic law of ***Shari'at***, the Shaikh could appreciate much of the genuine religious experiences of the Hindus, but he was critical of their doctrinal views. When a wayfarer told him that he had seen clouds appearing and pouring some showers at the prayer of a venerable Hindu ascetic on a hill, while admitting the spiritual powers of some Hindu ascetics, he gave two or three possible explanations and set his mind at rest. The great Shaikh could not keep himself aloof from the Hindus, he knew much of their practices. At Rajgir a centre of Buddhism, Jainsim, Pauranic Hinduism (Brahma-Shankar) and also an important place for ascetic practices, he spoke of the above *siddhas* and *yogies* who had acquired inner qualities by their severe austerities.

To revert to *Makhdūm* Sharafu'd Dīn's father, *Makhdūm* Yaḥyā Manerī, his tomb called *Barī Dargāh* at Maner lies near the magnificent Mausoleum of Shaikh Bāyazīd, more well known as *Shāh* Daulat, eighth in descent from Imām Tāj *Faqīh*. *Makhdūm* Badh Seistānī, originally named *Mīr* Saiyid Aḥmad, who lies buried in Kāghzī *maḥalla* in the large domed mausoleum, built in Tughlaq style of architecture, was probably also a Suhrawardīya saint. According to *Ganj-i Arshadī*, Makhdum Sharafu'd Dīn held the Seistānī saint in very high esteem and for 12 year he paid annual visits to his *Rauḍa* to offer *Fātiḥa'*.

Next in importance was the poet-saint of Ambai in Biharsharif, Aḥmad *Chirmposh*[6], (leather-clad) the spiritual disciple of Shaikh 'Alāu'd Dīn *Chirmposh* of Puraini (Bhagalpur) who was linked through Shaikh Sulaimān of Mahsun to *Maulāna* Taqīu'd Dīn Sahrawardī. *Ḥaḍrat* Aḥmad *Chirmposh* (d. 775/1373) was the first cousin (son of mother's sister) of Makhdum Sharafu'd Dīn. He was a gifted poet and a divinely attracted mystic, representing the awe-inspiring (*jalālī*) rather than the amiable (*jamālī*) attributes of God. He wrote, "I am a ray of the light of Divine Power.... sometimes I wear the mendicant's habit made of patches and sometimes

Liberalism and latitudinarianism were the characteristic features of all the *Ṣūfis*. Firmly fixed in his faith in Islam Shaikh Sharafu'd Dīn, like other *Ṣūfis*, was very catholic and broadminded in his attitude and views towards the non-Muslims. In his discourses and letters he quotes with approval from the great mystic *'Ainu'l Quḍḍāt* Hamadānī, who had profound admiration for the founders of all religion who formed their views on the basis of religious experiences. Their followers failed to grasp the real significance of the original teachings and turned their meanings. When asked about the *yogī* who said that one who wished to live should know how to die, the Shaikh said, that they did say so but did not believe its true significance. Ignorant transmitters missed the deep religious spirit behind such statements. Referring to Islam, the Shaikh said that it came in all perfection, but its commands were not observed and there had been deviation from its original ideology. People blindly followed the faith of their ancestors and had become conventional in their belief and practices. Practical religion is different from its metaphysical and doctrinal aspects. The chief features of the religion of the Hindus were faith in, knolwedge of, and love and devotion to, God. The *Firdausī* saint had unstinted admiration for the supreme expression of love in the Hindus, evinced through self-immolation which he had witnessed on several occasions in Rajgir. He tells us of a man who had killed himself when a stone image he had in his left hand fell down. He had been standing on one leg, and his nails had grown so long as to be entwined around his hand. It is love which inspired his action. There are references to widowed women who had abandoned the world and took recourse to self-immolation by setting fire to their clothes soaked in naphtha oil. Such emotional ascetic practices evoked keen appreciation but not commendation from the saint of Maner. Genuine asceticism, according to the saint, results in great liberty and the purification of the soul, and this liberty can be acquired either by a believer or an infidel. Through practising asceticism, one gains great lustre.

he went to Bengal and Sylhet where his *Chilla Khāna* is still found. He has been mentioned by Makhdūm Sharafu'd Dīn in his discourses. *Maulāna* Aḥmad Damishqī, one of the *Khalifas* of the celebrated Bahāu'd Dīn Zakariya Multānī was the spiritual guide of *Maulāna* Taqīu'd Dīn Suhrawardī of Mahsun (Dinajpur, Bengal), the author of *Multaqiṭ* which is an abridged version of Ghazzalī's *Iḥyāu'l 'Ulūm.* Taqīu'd Dīn was the inspirer of many Suhrawardī saints of Bihar, including Makhdum Yaḥyā Manerī, the father of the celebrated Firdāusi saint, Makhdūm Sharafu'd-Dīn Manerī.

Makhdūm Sharafu'd Dīn[4] Manerī (c. **1263-1381**) :

After having his preliminary training at home he went with Sharafu'd Dīn Abū Tawwāma, one of the greatest scholars of the time, to Sonargaon (Bengal). He stayed there for about three decades, being so engrossed in his studies and his severe austerities with extra fasts as to endanger his health. Marriage was the proposed remedy for these. He had a son, Zakīu'd Dīn, whom he placed under his mother, when he returned to Maner after his father's death. The traditional chronology of his birth, death of his father, his visit to Delhi in search of a spiritual guide, has been challenged. Certain it is that at Delhi he met the great Chishtī saint Niẓāmu'd Dīn *Auliyā* and Sharafu'd Dīn of Panipat before their death in A. H. 724 or 725, but finding no spiritual solace from them he betook himself to the eminent *Ṣūfī* Shaikh Najību'd Dīn Firdausī, who invested him with discipleship and spiritual successorship shortly before his death in 732 (1332). The duration of his stay in Delhi, his wanderings in the jungles of Behea (Shahabad area) and the hills of Rajgir, his ascetic practices in the cave or *Kund,* the period of his movement to and from Bihar Town, as also the time of the issuance of the *farmān* of Muḥammad bin Tughlaq, offering him a Bulgarian praying-carpet and a land-grant, for the upkeep of the newly-built *Khānqāh* for him, and its return, are also disputed points.

of the *Dargāh* at Maner to Tāju'd Dīn *Khandagāh*, and another one, to the west of the tank, to Momin 'Ārif, said to have been an associate of *Maulāna* Muḥammad, better known as *Imām* Tāj *Faqīh*, the traditional conqueror of Maner, probably a *Mujāhid* in the army of Muḥammad bin Bakhtiyār, cannot be summarily dismissed.

Ṣūfi Orders; Some Eminent Ṣūfis

Almost all the *Ṣūfi* Orders of highest repute, the *Chishtiya*, *Suhrawardiya*, *Firdausiya*, *Qādriya* and *Madāriya*, were represented in Bihar, and each had a great share in the spread and development of Islam in the area. Among the earliest to come to Bihar were the *Ṣūfis* of the Chishtiya order. We can mention only a few of the large number of the early Chishtī saints of Bihar. The earliest were Shāh Maḥmūd Bihārī and Saiyid Tāju'd Dīn of Danapur, the disciples of Quṭbu'd Dīn Bakhtiyār Kākī (d. 633-1235), *Maulāna* 'Alī Bihārī, a disciple of *Bābā* Farid *Ganj-i Shakar* (d. 644-1246), Makhdūm Ādam *Ṣūfi* (d. 686-1287), son of Saiyid Ibrāhīm Chishtī of what later became Hajipur (d. 657-1258), and his son Makhdūm Ḥamīdu'd Dīn (d. 771-1369) and the latter's son, Taimullāh *Sufaid Bāz* (d. 790-1388) the spiritual guide of Shaikh Faiḍullāh of Kurji near Patna (d. 831-1427); Shamsud' Dīn alias Shāh Saman of Arval (Gaya) and Ṣufi Ḍiāu'd Dīn of Chandhan's (Bihar-sharif) (d. 820-1418). Taimullāh *Sufaid Bāz* had settled down in *maḥalla* Chishtiana of Biharsharif which was adjacent to *maḥalla* Bhaisasuı where lie buried a large number of Chishtī saints, including Aḥmad 'Īsa Tāj, the younger brother of the celebrated Chishtī saint, Muḥammad 'Īsa Tāj, a son-in law of Saiyid Jalāl Bukhārī Makhdūm Jahāniyān of Suhrawardī order.

Bihar felt the influence also of the Suhrawardī Order. Shaikh Jalāl Tabrizī, one of the chief disciples of the celebrated author of *'Awārifu'l-Ma'ārif*, Shihābu'd Dīn Suhrawardī, came to Bihar *via* Delhi and Badaun, and from there

Chandra of Qannauj granted to a Brahman of *pargana* Maniari in 1183 *V.S.* or 1126 A.D refers, among other obligatory payments, to that of *Turushka Danda* or Turk's Duty. Tarānāth, the Tibetan historian of the 16th century, would have us believe that a minister of the *Turushka* king of the *Kerna* land in the west came to Magadh to plunder it before its conquest by the Khaljī adventurer. Referring to the latter, called Chandra of Antervedi, he says that by means of several *Bhikshus* who served as his messengers he with other smaller rulers of the *Turushka* living in Bengal and other parts of the country raided and conquered the whole of Magadha. This cryptic and confused statements need not be taken seriously. But there is, however, some historical evidence about the Ghaznavi generals having extended their raids upto Benaras. and there is a colony of Muslims who rightly or wrongly trace their line to such raiders.

Mirat-i-Mas'ūdī and *Mirat'ul-Asrār*, 17th century works, refer to the lightning sporadic raids of *Sālār* Mas'ūd in eastern India and his eventual death at the hands of *Rāja* Hardua or Sahdeva, on 18 *Rajab*, 474 or 1033 A. D. He lies buried at Bahraich. The authority quoted by the writer, Abdur Rehman Chishti, excites suspicion for no one else ever heard of it and he does not give even a single extract from it. Muḥmmad and Fīruz Tughlaq of Delhi, and *Ḥājī* Ilyās of Bengal, paid reverential visit to Bahraich tomb and Von Graff, the Dutch traveller saw from his boat in 1661 the celebration of the popular and picturesque annual festival at Maner. Earlier, *Sulṭān* Sikandar Lodi tried in vain to stop the fair of Ghāzī *Miyān*, and singing and dancing of Hindus and Muslims, particularly a set of *Qalandar* mendicants, round a long bamboo pole wrapped in coloured rags with horse-hair tied on its top, for the whole thing smacked of practices contrary to orthodox beliefs. It it just possible that the legend of *Ghāzī Miyān* was the outcome or had become mixed up with the earlier raids of the Ghaznavid general, Aḥmad Niyāltigīn. The ascription of a tomb near the western gate

over by the *Kols* and was killed by some fanatical local people at the orders of Jeevan, the Kol *Rāja*.

A precursor of the great *Sūfi* saint of Ajmer, the pioneer of the Chishtī order of Sufism in India, was Saiyid Husain *Khingsawār*, who was killed by the Hindus and lies buried at Taragarh Hills near Ajmer. Local tradition, supported by later documentary evidence, says that three of his relatives came to Bihar. One of them, Saiyid Hasan, a direct ancestor of *Diwān* Saiyid Ja'far, the saint of Barh of Shāhjahān's time, has a tomb ascribed to him at Neora, in Patna district, while the two others, Saiyid Aḥmad and his sister's son, Saiyid Muhammed, popularly called *Māmūn Bhānja* (Uncle-Nephew) are said to have been killed and buried at Jaruha, near Hajipur. Their mausoleum which had remained intact till the earthquake of 1934, is said to have been built much later with the help of *Raja* Shiva Singh, Brahman ruler of Tirhut, and the patron of Vidyāpati. *Mahārāja* Mān Singh, one of Akbar's governor of Bihar, granted in 999 A. H 15 *bighas* of land for the upkeep of the mausoleum and the facsimile of his bilingual *Sanad* containing one of the earliest and most genuine specimen of Hindustani prose then used in Bihar, and written in *Kaithi* Hindi script, was published long ago.[8] Traces and evidences are also available of others who also lost their lives for preaching their faith and who till sometime before received homage even from the Hindus of the locality. Such was Shaikh Fattu and Shaikh Barhan who came to Bihar during the reign of Fīruz Tughlaq and were killed and buried in a place known as Bargazar in North Bihar. The legend of *Salār* Mas'ūd or Ghāzī *Miyān* appears to have some truth behind it, though he had become a legend in the 14th century as is evident from a question put to Makhdūm Sharafu'd Dīn and the reply given by him.

The impact of Islam on Bihar and Eastern India must have been felt long before Muḥammad bin Bakhtiyār effected its conquest in 1199. The Maner copperplate of *Rāja* Govinda

race. They fought a war (*jihād*) against the flesh and carnal desires (*nafs*).

As spokesmen of Islam which is a proselytizing religion, prompted by a sincere desire to serve God and His Creatures, imbued with democratic spirit of Islam, proclaiming and practising equality of all believers of the faith, they set out to preach Islam by gentle persuasion and by the infectious examples of their character and devotion rather than thorough dialectic disputation and argumentation. It is the *Ṣūfis*, not the *Mullahs* who proved to be the best missionaries of Islam. It is a fact that there was a large number of conversions under the spell of *Sufism* in Bihar and elsewhere, although it is very seldom that one comes across some references in the mystic literature produced in Bihar to the role they strictly played in the process of Islamization.

There was no organised church or single authority, no ordained priestly class in Bihar and elsewhere. All that happened was on individual basis. *Ḥaḍrat* Sharafu'd Dīn and his Balkhī disciples believed that a *Kāfir* (infidel, non-believer) unlike *Mushrik* (polytheist) could be a *Muwaḥḥid* (unitarian). *'Ainu'l Quḍḍāt* Hamadanī, was quoted to the effect that all religions or most of them, were in essence the same, wedded to truth which is at the bottom of all religions, but ignorant followers, being unable to understand the real significance of the original teaching, turned their meanings. They deemed it, however, as their duty to show to others what in their view was the straightest, smoothest and safest path. For this, they left their homes and relatives, undertook long and arduous journeys, penetrated into inhospitable regions, worked amongst people alien to them in race, religions, traditions and culture, and some had to pay with their lives for their labour of love. There is a tradition recorded in a later document which refers to Momin 'Ārif of Maner but a more authentic and contemporary evidence is available about Shaikh 'Alī who worked for his faith in the wild tracts of Aurangabad bordering on the Chotanagpur region ruled

theism of orthodox Islam, emphasising upon eternal distinction between transcendental God and man, the Creator being separate from the Creation, was directly opposed to absolute Monism of Shankracharya's Vedantic thought of "I am Brahman", and stressing the identity and unity of God the phenomenonical world. Though the *Ṣūfi* thinkers traced the origin of their doctrine to the *Qurān*, and to the mystic tendencies and to life, sayings and actions of the Prophet, the Monistic trends in the mysticism of the *Ṣūfis* were looked upon by the orthodox Muslim as a class as heretical innovations, opposed to the spirit of Islam. But the lives and writings of the early *Ṣūfis* of Bihar show that whether they belonged to one or other of the chief orders, Chishtiya, *Suhrawardiya*, *Qādriya*, *Firdausiya*, *Shuttariya*, orthodox, ***Bā-Shara'*** (with law) and *Bē-Shara'* (without law), they followed the *Qurān* and the *Sunnat* (tradition), accepted all the cardinal principles of Islam, denounced all innovations and devotions in the sphere of dogma and practices and *Bid'āt* (heresy), insisted upon the strict observance of obligatory duties of their faith, and discarded all that was obviously antagonistic to the fundamental teachings of Islam. Of course, they could not see eye to eye with, and even challenged, the dry scholastic, theologians, the *Mullah*, and clung not to the letter but went to the spirit of the faith. They preferred a mystic and spiritual interpretation of the *Qurānic* law to its more literal sense. Their interpretation of the relationship of the Creator and the Creation, tended to make them monistic rather than dualistic. They had reconciled religion with philosophy, like Junaid Baghdādī, Ghazzālī and others. They made Islamic theology mystical. For them 'Everything is Him' (*Hama ast*) was not far different from 'Everything is from Him' (*Hama az ast*). They considered service to God's creatures and fulfilment of their duties and responsibilities towards their fellow-beings as essential for their discipline. They put aside their own desires, to render themselves agreeable to all, irrespective of caste, creed, status and position. They were free from all complexes and shackles of colour and

Islam emerged as a religious and political phenomenon and had a tremendous success in the known world. But it could not keep up its solidarity and unity, for not long after the death of the Arabian Prophet, it was torn asunder by sects and schisms, divisions and subdivisions, which very soon exceeded the well-known and oft-repeated number of 72 or 73, of the two major groups. The largest in the world of Islam and the most dominant section of Muslim population in India and Bihar throughout history was made up by those who call themselves *Ahl-i-Sunnat Wa'l Jamā'at* or the people of *Sunna* and the Community. They are known as the orthodox Muslims, as they accept the traditionary part of the Islamic law and revere equally the first four immediate successors of the Prophet, the "pious caliphs", Abū Bakr, 'Umar, 'Uthmān and 'Alī, as opposed to the *Shī'ahs*, who are called partisans of 'Alī and keep the *Imāmat* or religious leadership for the family of 'Alī and Fāṭima the daughter of the Prophet. The official Islam in Bihar and India has always been Sunnite Islam and of its four juristic schools, *Ḥanafī*, *Ḥanbalī*, *Mālikī* and Shāfi'ī, the first has always been recognized and acted upon. None of the chief Shiite sections, the *Imāmīs* or the Twelvers, the *Ismā'īlīs* or the Seveners, the *Zaidia*, who are nearest akin to the Sunnite, has been known to exist in Bihar in pre-Mughal period. The *Fatūḥāt* and the unique work, *Sirat-i-Firuz Shāhī*, refers to the *Ghullat* or the extremist Shites and their reprehensible practices in and around Delhi, but the danger was nipped in the bud by their leaders being executed and their books being burnt. Bihar was immune from such people.

Fortunately, in early medieval Bihar, Sufism was practically identified with Islam, and there were no schisms and sects worth mentioning among Muslims. The entry of Islam in India had been followed by that of Sufism which lay midway between two dissimilar systems of Aryan Pantheism and Semetic Islam, tending at times towards, and being associated with, each. The absolute mono-

Another unnoticed source of quite a different kind is a lexicographical work in Persian, *Sharaf Nāmah-i-Manerī*[2], written in Bengal in about 1575 by one who had close connections with Bihar and was a devotee of a Bihari *Ṣūfī* saint. It contains a large mass of unrelated facts and descriptions of objects of social import. The staggering number and variety of things, objects, and articles dealt with in the book are important in their own way, and along with what we get in hagiologies, they constitute a quarry to pick, select, arrange and interpret, so as to give some intelligible coherence.

Islam is a historic religion and also a social creed. It has had its own concept of society, particular type of social order, a certain outlook in life, and a religious ideology which with its ethical and moral law and code of conduct, and above all its strong and rigid monotheisic belief in the unity of God, constitute its philosophy. Then there was the egalitarian basis of its social order, equality and brotherhood, and its teaching that every individual is born with a spiritual status and can claim social freedom as its birth right. We can get some idea about these matters expressive of kind feelings of humanity in Islam, such as love, charity, liberalism, disposition to think favourably of others, and to do them good, and some other socio-religious aspects and ideals religious teachings, ways of living, thoughts and movements and cultural side of things, from the mystic literature of the Firdausiya and Shuṭṭāriya orders of Bihar in the Sultanate period. A critical study of such genre of *Ṣūfī* literature as *Tadhkira*, smaller tracts and treatises dealing with principles and doctrines of the faith and ritualistic practices, and above all *Maktūbāt* and *Malfūẓāt*, which meant letters addressed to distantly-placed disciples and followers, and discourses delivered in the assembly or *Majlis* or *Khānqāh*, will yield valuable source materials. One, however, should not expect to have a connected, well-integrated systematic account. Hagiology is not history.

However unsatisfying, the task has to be undertaken to reconstruct the picture from incomplete accounts of men's doings and writings on special subjects, filling up empty spaces on an objective basis, and piecing together the scattered information, allusions and references to contemporary men, and events, special episodes of social and religious life, in contemporary literature, religious or otherwise. One has to deal with records and to tap all accesible sources so as to see what happened, how people acted and behaved, and came to be what they were; and to view the problems as interpreter of the value and meaning of such facts and evidences as are available.

One has to consider the life as depicted in Persian religious literature of the 14th-15th centuries, such as the *Malfūẓāt* and *Maktūbāt* of the mystic *Ṣūfis* of Bihar of the Firdausiya and *Shuṭṭāriya* orders, and also in the works of *Nibandhkāra*, *Smriti* and Digest writers, and of the versatile literary genius, like Vidyāpati, and Jyotishwar Thakur, and specially *Varṇa Ratnākara*, an early 14th. century work in Maithili by the latter. Such works provide us with important contributions to the social history of north Bihar. Even earlier than these, and in fact, the first in the field of literary sources, is the travel book, a biographical account, of the Tibetan monk who has been given the name of Dharmaswamin,[1] who visited several places in Bihar, such as Simraon on the Nepal border, Vaishali in Tirhut, and Bodh Gaya, Nalanda, and Rajgir in south Bihar, during his two years' stay in India (1234-36). Much valuable additional light has been thrown by the subsequent writers of the 14th. century on various facets of society and religion, and also on conciliation and concord between various cultural and religious groups, which was the need of the time and without which there could be no peace and tranquillity. Evidences are available of the interaction of religious and social forces due to long contact and association of the alien and the natives.

Socio-religious history of Bihar, though fascinating and important, is a very complex subject. Our knowledge of religious and social conditions of Bihar in early medieval period remains inadequate, uneven and at best fragmentary. It is difficult to write a full and connected account of developments in all its aspects, facets and phases. One has to consider the diversified elements constituting the general population of the land with multiplicity of faiths and convictions, contrasted degrees of cultural advancement attained by each people with differing and dissimilar religious ideals, social conceptions, and grades and strata, organisations, institutions, habits and manners, modes and behaviour, etiquette and decorum, diet and dress, festivities and festivals, rites and rituals, and other features and bearings in general.

The fundamental basis of socio-religious life and cultural patterns differed from area to area. The two main social elements were the subject people, who, on the whole, viewed the world, including human life, as an illusion, and the foreign ruling classes, who believed in an egalitarian society, and to whom such socially autonomous groups and forms as caste system and untouchability were an anathema. The main difficulty however arises from the paucity of concrete data and documentary material. The historical position of Islam in eastern India, particularly in Bihar, on the socio-religious and cultural side has yet to be established. There is not much of reliable contemporary evidence in recorded form, and the incidental and enlightening items that one can glean from the Persian chronicles of Muslim writers are too scanty and insufficient to be helpful for reconstructing the picture of the past. The Persian chroniclers were mainly concerned with matters of war and politics, interminable struggles, conquests and expanding power of the world of Islam, and not with peaceful penetration in India.

Islam and Muslims

in

Medieval Bihar

man's arms (you have become prematurely attached to worldly things). You have, Oh lady (soul)! forgotten yourself. You were one that did not feel tired on land and water.

75. God's way is good but it is narrow (difficult); the City (of God) is excellent, but is far off. The Lord is good but subtle and,therefore,the body (soul) becomes extremely tired in attempting to attain Him.

76. Water is deep down in the narrow well but still lakhs of drop of it are sold by those who strive for it. Fie upon the city of Mathura (where Jamuna flows) whence Krishna has gone away thirsty.

77. What to speak of my house which is but a weak structure of mere bamboo frames,and yours too is also without a strong support? The house is leaking right in the centre of the abode and drops are falling in great number (i.e. our body is frail and life in transitory; death can distroy it at any moment).

78. I wish to burn the net of deception as well as your curved scimitar. When you do what you say, the dawn will show you the life.

79. Manaqib-i-Muhammadi.

80. These lines have been quoted by Maulana Abdul Haque in "Urdu ki Nashvanuma Men Sufian - Karam ka Hissa". But so far as this particular specimen is concerned, a more authentic and detailed version is found in Muqt-abs-ul-Anwar. When Amir Khusru visited Baba Qalandar of Panipat, the latter asked him ´Khusru Pheri Kotra' and asked him to recite his verses. In his turn the Baba also uttered some verses, composed off hand. Amir Khusru was moved to tears, at which Baba asked him in Hindvi ´Runda Hunh kucch Bujhanda Hunh'.

form interesting reading.

46. The Maktubul-i-Maulana Muzaffar quoted in writer's paper entitled the Correspondence of two 14th century saints of Bihar with the kings of Delhi and Bengal (J.B.R.S. Patna)

47. Isharat -- Letter 25.
48. Bahr-ul-Maani
49. Khan-i-Pur-Niamat.
50. Muktubat-i-Sadi - letter 69
51. Muktubat - letter 132.
52. Ibid letter 113.
53. Ibid letter 169.
54. Ibid letter 132.
55. Bahrul-ul-Maani
56. Manaqib-ul-Asfia. Munis-ul-Qulub.
57. Malfuzats.
58. Malfuz-i-Rukni.
59. Munis-ul-Qulub.
60. Maadan-ul-Asrar or Manahij-us-Shuttar.
61. Munis-ul-Muridin.
62. Mukh-ul-Maani.
63. Khan-i-Pur-Niamat.
64. Bahr-ul-Maani.
65. Khan-i-Pur-Niamat.
66. Ibid.
67. Ibid.
68. Ganj-i-La-Yafna.
69. Munis-ul-Muridin.
70. Ibid.
71. Ganj-i-La-Yafna, Munis-ul-Muridin, Bahrul-Maani and other Malfuzat.

72. The one perfume seller pervades all the universe. If one loves and meditates upon Him he is freed from worries, meets his death according to his desires and the soul becomes absorbed in love.

73. What sort of bird (soul) has entered the body, making its old jungle (habitation) lone and desolate? The bird (soul) picks up the pebble and drinks the water which is free from dirt or bad smell(or does not feel agitated and has no desire to dwell in it permanently ("Na Cho'u Na Pas").

74. Although the month of Jaith and Asarh have not come, still the leaves have grown up to the length of a

Delhi on Taimur's invasion. His younger brother, Ahmad Isa Taj, came to, and lies buried at, Bhainsasur muhalla of Bihar Sharif.

14. Ganj-i-La-Yafna.
15. Maktubat.
16 . Ms of Fatuha Khanqah.
17. Munis-ul-Qulub by H. Ahmad Langardarya
18. Vide second lecture in Current Studies, Patna College.

19. Maadan-ul-Maani
20. The military governor of Bihar named Zainuddin Majdul Mulk.

21. Malfuz-i-Rukni, compiled by the saint of Rajgir named Pir Imamuddin.

22. See the writer's paper on this saint of Ambair in Patna University Journal.

23. This is perhaps the Khawaspur,a parganah mentioned in the Ain-i-Akbari.

24. Fawaid-i-Rukni.
25. Khan-i-Pur Niamat
26. Ganj-i-La-yakhfa.
27. Ganj-i-La-Yakhfa; Mirat-ul-Asrar.
28. Manaqib-ul-Asfia; Ganj-i-La-Yakhfa.
29. Munis-ul-Qulub.
30. Maktubat-i-Maulana Muzaffar Shams Balkhi.
31. Maktubat etc.
32. Maktubat-i-sad-o-Pinjah-o-Do
33. Ibid.
34. Munis-ul-Muridin.
35. Mukh-ul-Maani.
36. Munis-ul-Muridin.
37. Superintendent of Audit and Accounts.
38. Manaqib-ul-Asfia.
39. Maktubat -- letter 132.
40. Ganj-La-Yafna
41. Munis-ul-Qulub.
42. Maktubat-i-Maulana Muzaffar. Letter 139.
43. Ibid, letter 129.
44. Maadan-ul-Maani.
45. See the writers paper on the 15th century Saint, the grandfather of Akbar's Sadrus Sudur, Shaikh Abdun Nabi. His letters to Babar, Sikander Lodi and Humayun

References

1. Regard all religions as one, and look at them as the same ---- Divinity is really Infinite.

2. When I saw faith and infidelity as of the same Complexion ----- I got-out of the snare of both faith and infidelity.

3. When I discovered all the secrets of the heart, I found myself as an idolator in Ka'ba.

4. Islam and disbelief or infidelity are one and the same in the path of love-for him who is a Swimmer in the sea of Divinity.

5. Both Adam and Satan may prostrate themselves before Husain --- If I were to remove veil of illusion from the face of things.

6. In one's view Adam and Satan will not appear to be different.

7. Biography of Dharmaswamin, Patna, 1959, pp. 90 ff.

8. The first-two of these Sir Abdullah Suhrawardi lectures delivered under the auspices of the Calcutta University, have already been published in the Current Studies of Patna College.

9. Tuhfa-i-Ghaibi; Bahrul Maani; see also Sirat-i-Sharaf by Maulvi Zameeruddin.

10. See the 33rd letter of the Maktubat-i-Sadi Dafter-III. It is to be noted that several copies of Irshad-us-Salikin consulted by the writer are free from what is alleged to have emanated from the great saint of Bihar.

11. Abu Bakr bin Sirin, the physician of Basra, who flourished under the Umayyads (660-750 A.D.) and died in 116 A.H. or 728 A.D. He has been frequently mentioned by the saint of Bihar in his Maktubat and Malfuzat.

12. Mentioned by Sh.Qutban in his Hindi poem,Mirgavati.

13. A well-known saint of Jaunpur where he came from

Although they did more than any other group of people for the spread of the faith they have not cared to set on record the extent of the success they achieved in this connection. An old and learned 'Yogi' came of his own accord to parley with the great saint on religious matters and after some time became a Muslim. 'Shahbaz urf Gorakhnath' to whom 4 letters are addressed in the Isharat was obviously a convert. An 80 years old Hindu came and voluntarily embraced Islam at his hands (Maadan-ul-Maani). A Yogi at Rajgir had discussions with him and he was told in the end "Tu Bar Hal-i-Khesh Bash" (you remain in the state you are).

Once Qazi Ashrafuddin reminded the great saint of what he had said that "the Yogis say that if you want to live, you should know how to die". He replied that the Yogis may not have understood the true significance of this expression which must have emanated from the original preachers of his religion. He quoted Ain-ul-Quzzat approvingly who had said that all the religions or majority of them have the same true basis, but foolish transmitters brought about deviations from the original teachings. He added "Religion is a very difficult affair. Even if I exhort a Hindu a thousand times, to become a Musalman he will never turn away from his wrong path - Do not think that there have been changes and deviations from the originals in the religions of these people only. The ordinances of Islam have also suffered from such changes and inversions. A time may come when the childish people who enter the mosque will take Mihrab (the principal place in the mosque where the priest-prays with his face turned towards Mecca) to be an object of worship" (Mukh-ul-Maani)

(Inspired and acquired knowledge). The Prophets and holy sages were gifted with the former and it was called 'Wahi' or 'Ilham' (Divine revelation or inspiration) and the rest had to cultivate knowledge. The look at the face of the scholar was as much an act of worship as to see the face of one's parents. The Ulemas were the heirs of the Prophets. One who served a scholar served God. "There are many traditions on the virtue of the learned". To Shaikh Umar of Ingli he writes "The Farman is 'Seek knowledge, even if it be in China", but the position of affairs these days is as if they say "Seek the worldly things, even if it be in China". If you are asked tomorrow that you had been told "to seek knowledge is the obligatory duty of every Muslim, male or female, why did you not acquire it, I don't know what you will say to that. Will you advance the plea of the solicitude for your wife and sons or the anxiety about your food and drink? O brother! the Shara says that action without knowledge is impossible and it is of no use and you cannot realise your chief aim without action. Hence the need of acquiring knowledge". There are references to the great saint performing the 'Bismillah' ceremony of a child, of the lessons imparted on theological subjects, to Jamaat-i-Mutaallimin (body of students), and to "Kutub Khana-i-Muazzam" (the respectable library of the saint), and discussion took place on "Ilm-i-Janwaran" (Zoology), Riyazi (Mathematics), Ilm-i-Najum (astronomy), Falsafa (Philosophy), Kalam (Scholasticism), Ilm-i-Nahv (Syntax, grammer) etc. Referring to Syed Alauddin of Jaunpur, the great saint of Bihar said that 'he was well-versed in all the branches of learning and he had also a Sajjada (spiritual office). My Shaikh read 'Tafsir' and 'Hadis' under him. He used to devote each day of the week to a separate subject. One day he lectured on 'Fiqh', another day on 'Nahv' and 'Mantiq', yet another day on 'Usul' and 'Kalam' and on the following days on 'Tafsir' and 'Hadis', and so on and so forth. He would never go to a king which other Ulamas did (K.P.N.). The saint showed his bitterness against the worldly Ulamas by describing them as "highwaymen', the dogs and the followers of Satan and Sultan" (Mukh-ul-Maani K.P.N. etc.)

Unfortunately the saints refer very seldom to the Madrasas and their Curricula and to their own contributions to the advancement of knowledge.

Bhali Par Sankri", the great saint added "Des Bhala Par Dur". Once during the course of his usual wanderings, the great saint had to pass a chilly dark night by taking shelter under a heap of straw in the outskirts of a village where a theft took place. The villagers ran after the thief and caught hold of the saint on suspicion and were about to belabour him when someone intervened on hearing his words 'Mannho Tarak Channo Na Bhati' (leave me, I do not like to be vexed). This is referred to in Ganj-i-Rashidi of the celebrated 17th century saint of Jaunpur. The eighth century saint of Uch, H.Syed Jalal Bukhari, who never set his foot beyond Delhi has been quoted by the 9th century saint of Bihar, H. Qazin Ola Shuttari, who never went beyond Mandu, in his book, Maadan-ul-Asrar, when a person asked Makhdum-i-Jahanian as to why when he read and wrote to the addressee his prayers did not prove so effective as that of the saint, the latter replied that he must develop God's consciousness "Khanda Hai, Phanda Kahan" [the pit is there, but where is the net? (God's consciousness)].

What a beautiful, clear and genuine specimen of Hindustani? The auxiliary verb "Hai", so characteristic of Khariboli,and absent from all other sister dialects of later Prakrit and Apabhramsa of this period is of special significance and shows its widespread use in saintly circles throughout northern India. This is not the only specimen for there are others, such as "Poonon Ka Chand Bala Hai"of the 13th century Baba Farid of Pak Pattan and (Khair-ul-Majalis) "Tu Ka kuch Samujhwa Hai"(80) ascribed to H. Bu Ali Qalandar Panipati, and the spontaneous utterance of Makhdum Qutub Alam of Gujarat "Loh Hai Lakar Pathar Hai Kiya Hai". It is significant that in the Indian edition of Hafiz's Diwan there is a line "Saqi Agarat Hawa-i-Ma Hai - Juz Bada Mayar Pesh-i-Ma-Shai".

The early Sufis of Bihar laid great stress on the acquisition of knowledge and contributed much not only towards the spread of the faith but also towards the progress of learning. The Khanqah and the mosques were the centres not only of religious instructions attracting thousands of visitors from places far and near, but also the nucleus of educational advancement and ane can gather many references to the works of the saints in this respect. The great saint of Bihar differentiates between 'Ilm-wahbi' and 'Kasbi'

and biographer of the 15th century saint of Amjhar tells us that the latter had learnt the language of India and he himself appears to have taken pains to learn the indigenous language. His conversation with his spiritual guide about the respective capacity of the Indians and the foreigners to learn the language of others, and the saint's reply about the superiority of the Indians in this respect reminds us of what Amir Khusrau, the "parrot of India" says on the subject in his Masnavi, Nuh Sepahr. The part played by the Sufi mystics in the evolution of the mixed language, Khari Boli or Hindustani which,according to the statistics, compiled, a few years back, by National Geographical Society of U.S.A., is spoken by an estimated 160 millions,and as such holds the second or third place in the world can-not be overemphasized. We get genuine specimens and authentic evidences of linguistic assimilation in the writings and utterances of the saints recorded by their immediate disciples. The marginal notes in a contemporary copy of Maktubat-i-Sadi in Fatuha Khanqah owned by apparently Maulana Muzaffar, include this --"The Makhdum, May God the Most High preserve him! said Bazaban-i-Hindavi "when one goes from "Chaukath" (frame of a door) to "Chaukath" etc. The said Maulana saw his great Shaikh in a dream at Aden and reported his utterances in the morning "Ayeen Rat Sohayi, an-Jin Karan Dhiyan Khayi, an" (the pleasant nights have come for which I had suffered so many kicks" (Munis-ul-Qulub, written by the compiler himself in Islampur Khanqah).

We get significant Indian words such as : Khat, Bhat, Khirki, Khilli (betel leaf made up of different ingredients) Thakkar, Jigri, (Kajri?) Bhaunra, Phul, Champa, Munj, Chapper, Do-Chapra, Dola, Langoti, Badhana, Siddha, Jogi, Kartar, Roop, Bade Bhang, Hal (plough) etc., and also numerous Indian names such as 'Rajan' "Shaikh Langoti" (epithet of Mohiuddin Diwana), 'Shaikh Chulhai, Shaikh Kaka Zafarabadi, Shaikh Laddhan, Maulana Nathan, Bibi Piyari, Bhikan Piyara, Lad,Sufi, Maulana Raja Maabari, Shaikh Badh Nur, Mian Kalu, Khwaja Mamman Multani, Shaikh Badh Taiyyab, Khwaja Gangu etc. More important than these are the utterances containing full sentences which may be taken as good specimens of Hindustani. Maadan-ul-Maani tells us of a Majlis in which one Jalaluddin Multani remarked that a "Hindvi" poet had also said similar things, and as soon as he quoted "Bat

There is a learned discourse in letter 93 of Maktubat-i-Sadi on the problem of 'Sama' (audition of songs), 'Wajd' (thrill of emotion or ecstacy) and 'Raqs' (Movement of body like rotative dances) which had become a subject of controversy among the early Sufis. Shaikh Abdur Rahman's work 'Kitabus-Sama' which declares audition to be permissble has been drawn upon and emphasis was laid on the requisite essentials of Makan (place), Zaman (time), and Akhwan (companions). As for Mazamir (instrumental music) which was generally tabooed, there is one significant reference in letter no. 121 of M.Muzaffar Balkhi. Just when the Kamanchi (fiddler) began to play upon his Kamancha (a bow like one-stringed instrument) and sang this 'Dohra' "Ekat (72) Gandi Bedha Bhootar Bhar Ke Kaayeen-Chinta Heen Man Ichcha Maran Tatahi Nehayeen". His Holiness Makhdum (H.Sharfuddin) was so much moved that tears began to roll down his eyes and he fell in an ecstatic mood. The saint, unlike us, understood the significance of such Hindi lines and appreciated Indian music, vocal or instrumental. In letter 173 on what is a Sufi and how to fight against 'Nafs'or ego, other Dohras have been quoted "Ayee Kaun (73) Tan Pankherwa Jangal Karanh Udas-Kankar Chunh Jal Peenh Dhani, Na Cho'u Na Bas" and "Jaith Asadh (74) Na Ayeean, Pataan Bhar Bhar Banh - Taiyee Bheri Bisar Dhani, Thakayee Jalthal Nanh". In the earlier letter No.(172) we get the following "Bat Bhali (75) Par Sankri, Nagar Bhala Par Dur-Nanh Bhala Par Patla, Nari Kar Har Chur; Sankar(76) Koai Patal Pani, Lakhanh Bund Bikayai - Bajar Paro Tah Mathura Nagari Kanha Piyasa Jayai; Kaha Yun (77) Apan Ghar Thathar, Kaha Yun Nisat Tahar - Bich Palandiya Ghar Chuway, Bund Pare Ratan Bimbhar Jalun Tore Chal-kain, Jalun Bokat Katar - Jaheen Karot so Tas Bhakain, Tehee Bhayo Bhinsar"(78).

It is better to leave for the Hindi scholars to give the correct reading and rendering of these 'Dohas' and to say something about their linguistic importance. Their occurrence in the Maktubat of the 14th century saint of Bihar, specially the lines about Lord Krishna going thirsty in Mathura appears to be very significant. Among the ways and methods adopted by the Sufis, in fact the very first thing they did to find an entrance into the heart of the teeming population of India, was to acquaint themselves with their language so as to make their views intelligible and acceptable to them. Ali Sher Shirazi (79), the disciple, campanion

were very fond of 'Sama' or audition which stirred the heart to seek God. He used to listen frequently to the verses, in Persian or Indian languages, sung by 'Goindagan' or Qawwal in chorus or singly. But he did not allow sensuous songs, specially in mixed assemblies. In a Majlis held on Sunday, 14 Shaaban, 759, in which Amir Musa Mahjub, brother of Sepahsalar, Shahabuddin Kobi was present among others, "the sweet-tongued Khaujan" was permitted to recite verses from the Asrar Nama of Attar. Once after prayers the Saint was sitting on the upper floor of the "Ambar Khana" alongwith others, including the high officials, Malik Mahmud Iwaz and others. There were 12 'Qawwals' who opened the 'Sama'. They switched on to "Hindavi" and then to 'Farodast'. At this the saint said "In Parsi (Persian) they use similies and metaphors while in 'Hindavi' the expressions are often open, loose and exciting, and these are likely to breed mischief. Consequently it is difficult to listen to such things, specially in assemblies in which young men are present. They can not go into the reality of things and understand the spiritual meanings. Once Mir Sikandar, one of the attendants, asked the great saint as to why he had suddenly stopped the Qawwals when they had switched on to the "Jigari Hindavi" song, and he replied that such things are usually sung by women and that even mystical songs, couched in exciting language, are likely to do harm to the people for they cannot discern the reality" Once, in 757, the Saint was questioned by 'Nasrullah Malikzada' who was sitting alongwith Malik Muizzuddin Ghori, the Muqti of Bihar, about the propriety of falling into a dancing mood on the hearing the sound of drums as was the case with Baba Farid of Pak Patan. The saint replied that in the 'Sama' of saintly personages even apparently trifling things become changed into glory of God, but he doubted if a thing unbecoming to the great saint had actually happened. In the Majlis of 8 Ramzan, 760, the saint told the story of the pious emperor, Sultan Iltutmish and of Haji Rababi the ministrel. The Haji's Rebec or violin having gone wrong, the Sultan advised him to give up his profession and think of God and of the next world. In this very assembly of the saint of Bihar "Chajju Gawai", a songster, was present and on the advice of the saint he gave an undertaking to follow the example of Haji Rababi and he also became a mystic (71).

considered a good sign if the patient could sip that. People avoided burning onion and garlic in their houses and they also considered it bad to sweep house at hight, and to sit on the threshold of the house. Some people abstained taking curd (Jughrat) in the night of the 25th of the month. All these had no sanction of the canon law (67). In a Majlis,held on 4th Ramzan,760, such practices as testing a witch, Kaftar, by immersing her in water and ascertaining theft by causing a 'Badhna' (water pot with spouts) to revolve after reciting texts of the Sura-i-Yasin on grain of rice under the belief that the grain would stick to the throat of the guilty, were condemned (68). Many of these superstitious beliefs and practices are still traceable in Bihar, specially among certain sections of the Hindus, from whom they were apparently borrowed by the Muslims.

There are many references to the social catholicity and liberal outlook of the mystic saints of Bihar. The compiler of Ganj-i-la-Yafna once asked the great saint as to whether the charity distributed by disbelievers would be taken into account by God and he replied in the affirmative. Qazi Shamsuddin of Khokhar asked the saint if Muslims were justified in addressing a non-Muslim as Thakkar (Thakur) and he was told that the word meant 'Khundkar' and 'Khudawand'(lord and master) and not God, and there was no objection to a Muslim protege or vassal addressing his Hindu superior or master as such (69). In the 12th Majlis, held on Saturday, 13 Shaaban, 775, Syed Qutbuddin of Ghazipur said that the author of Rauzat-ul-Islam had considered the use of 'Shangarf' (vermilion) by Muslim women in imitation of the Hindus as 'Kufr' or infidelity. To this the saint replied that it was not so if the women used the red powder on their heads to beautify their persons so as to please their husbands. But when questioned about the use of red powder in the fashion of the Hindus on the occasion of the annual Saturnalia of Holi, the saint replied that as the practice appeared to be an article of faith among the Hindus, the Muslims should not indulge in the same (70).

That the early saints of the Chistia and Firdausia orders had fallen victims to the charms of music, Indian and foreign, can be shown by numerous references in the Malfuzat. The great saint and his successors

have been referred to. Rather sarcastic references (60) are found to the habits of the so called Darweshes such as 'Muraqqa', Hazar Mekhi, Mush dandani, 'Zhanda' Gudri, i.e. closely stitched clothes made of patches and threads. Bhat (Bhat) 'Kak' (biscuit), Kichri, and Nan (Bread cooked in oven), Jughrat (coagulated milk or Dahi), Sarid (bread soaked in meat soup) and rice gruel were largely used by the Sufis and only occasionally they indulged in the use of such luxuries as honey, Faluda (a kind of flummery) 'Shir-i-Biranj or Khir', Halwa (a kind of sweetmeat made of flour, ghee and sugar) and fruits like mangoes, melons etc. Khat (Khat) and Boria (mats) were also in use of the Sufis. The word 'Kanduri' has been very often used for table cloth and also for feast.

The practice of fixing 40,000 Tankas (61) as the dower money for the bride, cooking food consisting of 7 cereals called "Haft Dana or Satanja" to break the fast with on 'Ashura' (10th) day of Muharram (62) and observance of "Mariam Roza" or the fast on the 15th of Rajab, still current among some Muslims (63) have been referred to, and commented upon. So is the case with Shab-i-Barat, the two 'Ids' and Moharram, especially 'Ashur' day. Apparently the great saint did not approve of the fixing up high amounts of dower money. When Sepahsalar Ali Usman referred to 40,000 Tanka accepted by his newly-married son, the saint exclaimed "God be praised! Matters have reached to this extent!" He then related how Caliph Harun-ul-Rashid ordered his daughter's dower to be fixed at 100 Dirham less than that of the Prophet's daughter,Fatima. There should be no idea of 'Nam-o-Nang' (Name and prestige) and the saint smilingly said to the C-in-C that when his son would have a daughter they would say that her mother fetched 40,000 Tankas (64).The Saint disliked the ways of the people who went to extremes in marriage ceremonies (65).

The custom of bowing the head on hearing the name of the King, showing respect to rulers and nobles,taking lime prepared out of oyster shells which had occasioned some disturbance among the students of Sonargaon, might be permitted, if people had become accustomed to the same (66). No day of the week was inauspicious, but the last Wednesday of 'Safar' was considered by some to be bad. In snake bite a Quranic text was read out on water three times and it was

engrossing-and when he was asked if the Sufis used medicines he replied in the affirmative and added that even the Prophets made use of medicine in their illness. He cited the case of Moses who would not accept the suggestion of the Israelites to use a certain herb for the cure of his malady, and immediately came the warning from God "you want that by your 'Tawakkul' you should make my 'Hikmat' (mystery) futile. So long as you do not take the herb suggested by the Israelites I would never grant you a cure"(55).

References in the contemporary mystic literature give us a glimpse into the social conditions of the times, and throw some light on the manners and customs, diet and costumes, conveyances and furniture, festivals, superstitions, beliefs and other practices of the age. H.Sharfuddin was very fond of essentially Indian betel leaves and a tray full of these was laid before him at Delhi. He chewed some and placed some in his turban (56). He was frequently conveyed in the 'Dola' to the tombs of his mother, sister and dead devotees to offer 'Fatiha'. There are reference (57) to the ceremony of the 'Third Day' (Suyum) after death when friends and relatives gathered to recite the Quran and offer the Fatiha for the benefit of the departed ones. At the close of the ceremony rose water was sprinkled and betel leaves and 'Sharbat' were distributed. We get one instance of flowers being laid on the grave. After the recital of the Quranic texts and 'Fatiha'a tray with flowers, oil and perfume (Argaja) was placed before the 17th century Shuttari Saint of Jandaha who took some flowers, dipped them in the oil, read the 'Darud' after which 'Sharbat' and betel leaves were used by him and the whole audience (58). H.Sharfuddin Maneri sent his Pairahan (long shirt) and Kulah(cap) to Zafarabad (Jaunpur) so that out of these the garment of the newly born babe, Hasan Balkhi, should be prepared and put on his body on the 'sixth Day' (59). This was the "Chatthi" ceremony, still observed. 'Izar' (trousers) 'Juffa' (a kind of long vest), 'Quba' (a kind of long gown) Mirzai (a jacket with sleeves), Lungi (a cloth worn between the legs), Dotai (a double shirt used in winter), Barayani (a kind of overcoat), 'Rida' (Wrapper), 'Dastar' (turban) 'Sarband' (head dress), 'Taqia' (a fillet worn under the head dress). Latiba (a cap sticking to the head), 'Kafsh' (shoe or slipper), 'Naalain' (pair of shoes with wooden soles) and blankets of black wool

caused;(b) gave them peace of mind which was helpful to meditation and concentration on God, (c) made them realise that everything belongs to God and people were only controllers or custodians (50). It was meant only for the chosen ones and knowers of God who had reached the highest level of trust in God and had become free from the anxieties of livelihood. But the view that the earning of livelihood was against absolute reliance on God (Tawakkul) is erroneous for the prophets and holy sages who has greater trust in God worked for their livelihood.

M. Muzaffar writes "if one works to earn 'Nafqa' (things to support life such as food, clothes and lodgings, sometimes confined solely to food) for his family so that he may not throw his wants and burdens on others and have so much of the worldly things as might leave him to devote himself sincerely to God and the Faith, I hope, with such intention, his 'Kasb' (gains) would be treated as the work for this and the next world" (51). There is no such divorce or deep gulf between religious life and worldly life as has been supposed by some. There is no complete renunciation of the world to attain the true aims of man's exertion, no celibacy, no exclusive priesthood in Islam, nor did the Sufi encourage their devotees to lead idle, passive and profitless lives. M. Muzaffar wrote (52) that not only the 'Hajis' and the Ghaziz (warriors) but also those who are of service to the distressed ones, give food to the hungry, provide water on the roads, erect mosques, run for the 'Nafaqa' of their family to whom they have to do their duty and do similar things, follow the path of God (Sabi-lillah). He felicitated a young devotee, Khwaja Hamid, on the birth of a son, and felt surprised at those who considered it 'shameful' to be a householder. Nikah is 'Sunnat' (Command which must be obeyed). Know that the religion of the vain infidels (Gabran-i-Hawaparast) is different from the faith of God-worshipping Musulmans (53).He wrote to Qazi Zainuddin "Oh my son! You are still very young and you should not discard the slave girl (Jariya). I am glad such things become necessary in the season of youth, and there is no fault in this either for this world or the next (54). "During the course of an interesting discussion on 'Kasb' and 'Tawakkul' in a Majlis of 757, the great saint of Bihar,H.Sharfuddin,said that there was no harm from the former to the latter provided it was not all-

is incumbent on us that we should listen to the divine command and cast aside our weak judgement. God says "Wadduna Ma Anittum" (They may only desire your ruin). When you make them intimate with yourself they will love to involve you in evil deeds. An unbeliever may be entrusted with some work but he should not be made "wali" (Chief Supervisor or Governor) so that he may have control over and impose his will and authority over the Muslims. There are several warnings in the Quran the Hadis, and the biographical works (seyar) to those who have given power and authority to unbelievers over the believers. There is an authoritative promise of provisions, victory and prosperity. The vanquished unbelievers exercise their power and authority and administer the lands which belong to them. But they have also been appointed (executive) officers over the Muslims in the lands of Islam, and they impose their orders on them. Such things should not happen"(46).

The Bihari saints discouraged people from living upon their faith and making Sufism a means of livelihood. They stressed the need of 'Kasb' (earning). In a letter to Mirdad (47) the great saint H.Sharfuddin, wrote that nothing great can be achieved with the help of others and unless one develops one's own inherent qualities one cannot attain a high position. "If you do not exert yourself the deeds of others will do you no good". One is reminded here of Sadi's Couplet "Haqqa Ke Ba Uqubat-i-Dauzakh Barabar Ast-Raftan Ba Paye Mardi-i-Hamsaya Dar Bahisht (I swear by God that it is better to go to the hell than to enter the heaven with the help of one's neighbours). Once the great saint was told about a student who had no means of subsistence, not even paper to write on and he replied that instead of begging it was possible for him to devote half of his day to earning his bread and another half to his studies. But if he was too engrossed in his studies he might accept something preferably from 'Bait-ul-Mal' (State exchequer). Begging came only after earning (48). A Darwesh is permitted to express his bare necessity only when he has failed in his efforts to satisfy his hunger or if he is too engrossed in his mystical and ecstatic devotion (Ashghal-i-Hal). Even those who were assiduous in prayers in Mosques (Mutakif) could carry on his art and trade (49). The earlier Sufis were prompted to begging because it (a) helped them to control their ego owing to the humiliation and disgrace it

Being devoted to God, the Saints of Bihar were generally indifferent towards worldly affairs including politics and works of administration. But this detachment did not mean that they were not cognisant of the actual conditions of the time and did not realize the value of Kingship and Government. "Be with the world but not of it" was their motto. They did not withdraw themselves from the world but had to work amongst their fellow people. They had their own ideas about rulers and state-craft and about the relation of the ruler with their non-muslim subjects, coloured of course by their religious ideologies. In Fawaid-i-Rukni it is said "each man ought to work according to his position in life". In Munisul-Muridin the justification of the classification of people and kings, Wazirs, Khans and Maliks has been shown, and in Ganji-la-Yakhfa the importance of the role played by Kings, despite their shortcomings, in the social and religious scheme of the community, has been emphasized upon."Though the Kings and the several deputies or agents (Nuwwabs) whom they appoint in the various cities may be called to account on the "Day of Judgement" for their oppressive deeds and the innocent blood they may have shed their good work and liberality may outweigh and counterbalance their misdeeds for they are instrumental in maintaining the peace of the world, and but for the fear of their swords, the unbelievers and thieves might have indulged in their nefarious activities of plunder and rapine. In this very city, where we are, if the 'Muqti', 'Kotwal' and the cavalry and infantry had not been functioning on behalf of the Kings, the plunderers and highwaymen who are so numerous would have become active and the peace of the people who are engaged in prayer and the reading of the holy Book would have been disturbed.

That Maulana Muzaffar's views,which though shared by a few others like the Chishti saint, H. Abdul Quddus Gangohi (45) could not be put into actual working by Muslim rulers is indicated in the longest of the letters that he wrote to Ghyasuddin Azam Shah of Bengal. "The faithful should not make the unbelievers and strangers their favourite friends and ministers. If they say that they do that for the sake of expediency, the reply is that it is not expediency but the cause of trouble and sedition. It has been said that they will not fail to corrupt you, and will not hesitate to spare themselves in creating troubles for you. Therefore, it

most devoted followers of the saint. As regards the Qazis and the Muftis of the time their number is too large to be mentioned. The 'Shahna' of Rajgir, the Kotwal of Bihar, the Qazi of Arval and many other places in Bihar and the Sepahsalar or the military commander and general have also been referred to. The Governors of distant provinces such as Malik Mufarrih, the Amir of Combay, and the Muqti of Gujarat who had replaced Shamsuddin Damghani and Malik Husamuddin of Awadh were greatly devoted to the saint and they were exhorted to do good to the people and show kindness to the poor and the needy. In fact, besides common people and Shaikhs we find many high personages, officials and men of rank and positioin among the audience or the addressees.

There are other things incidentally mentioned in the religious and mystic literature of Bihari saints which may be of interest to a student of history. Referrences to 'Musalla-i-Bulghari" (38) and to the receipt of "Musalla-i-Misri" through Khwaja Hamiduddin 'Bazzaz' (Cloth merchant) by Maulana Muzaffar, while he was at Delhi (39) imply some commercial intercourse with south-east Europe and Egypt. One gets a glimpse into the economic condition by a reference made on 27 Ziqad, 775, to the things having become scarce and "the prices shooting up on account of which people in every city become distressed (40)".M. Muzaffar was given a 'Jital' and an old 'Izar' (trouser) when he set out for Delhi (41). A 'Jital' was a small coin, equivalent perhaps to a modern 'Paisa'. In Akbar's time this small coin was 1/25 of a Dam 40 of which were equal to a rupee. Dang (a small denomination of money) has also been referred to. The Maulana, when in Arabia, received 30 'Tanka-i-Nuqrai' (silver Tanka) from his great 'Pir' whose "favours were open to all the creatures of God". But the writer, "the old mendicant", would have preferred prayers for his faith and his reforms for the next world to things which spoil one's character (42). The Maulana exhorted a young devotee, Qazi Zainuddin, to develop the habit of contentment and avoid extravagance in matters of food and raiment. "If you can get a 'Jama-i-Khadi' (Khadar garment) for 3 'Jitals', more or less, clothe yourself and your family with that and you should abstain from the habits and manners of others (43). Referring to a "slave worth 20 Tankas", H. Sharfuddin says "he has become a king"(44).

against the deception of 'Nafs' (desires or ego).

The great saint of Bihar condemned worldly men and worldly ulemas who "ate the bread of kings and made the threshhold of kings and Maliks their Qibla". He denounced the corrupt officials, spoke disparagingly about the"Qazis of these days", distinguished between 3 types of Qazis, and opined that "the Qazi who is given to bribery has his place in hell"(34). Once he said "Oppression is worse than infidelity. It is forbidden to look at one who practices oppressions and injustice but not at one who is an infidel". In letter 58 and 44 to Sadrul Ulama M. Hamiduddin and M. Sadruddin of Sonargaon he expressed his surprise at their accepting the posts of Qazi and Naib Qazi. He did not spare even Sultan Muhammad (Tughlaq), "may his sins be pardoned by God" "of whom the Khans and Maliks were so mortally afraid". "Though sitting in the morning on the Masnad they were exposed to the risk of being put in chains and thrown into the prison on the strength of the report received in the night"(35). But he had very good words to say about Sultan Shamsuddin (Iltutmish) and prince Kutlugh Khan who were men of piety and learning and fond of learned men. He referred approvingly to the justness of the remark of Wazir Arsalan (a new name) of Sultan Shamsuddin Firuz of Bengal about the requisite qualifications of a ruler and illustrated it by the example of the King's two sons, Hatim Khan, the ruler of Bihar, and Ghayasuddin (Bahadur Shah) of Kamroo (Assam) who both proved eventually as a failure, the one because of his excessive generosity, mildness and benevolence, and the other because he was too overbearing, despotic, and lacking in mildness and affability (36).

One gets, at places, other information of historical value through such incidental remarks of the saint as that in the time of Sultan Shamsuddin (Illtutmish); the first Muqti of Bihar was Malik Nathu who was replaced by a better (by implication an incorruptible) Governor, Malik Alauddin. The other Muqtis mentioned in the Malfuzat of the saint and his successors were Malik Zainuddin Majdul Mulk, Malik Muizzuddin Ghori, Malik Abdur Rahman. Malik Mahmud Iwaz, "the Mutasarrif (37) of Bihar" who was sent by Firuz Shah to supervise the finances of the province figures prominently in the Malfuzat. He lived long in Bihar with his family and relation and was one of the

jealous in point of honour. He preferred giving something to receiving anything. But sometimes circumstances became too compelling and he had to accept things. What could he give in return? Of course his blessings were there, and also his long letters full of religious instructions. In one of his letters to the Sultan of Bengal he refers to a coveted relic of his deceased Shaikh which was a mirror shown to him by the barber. "This cherished object of my heart was missing. My heart wished to have it. After years this mirror was brought by a certain person to me. I regarded it as a boon and a blessing. I have sent it to you, the king. It is in return for the cloak (Barani) and the turban (Dastar) which I had put on, on Friday. May your affairs be set right" (31).

Maulana Muzaffar's letters to the Sultan of Bengal are of considerable importance. Besides what is mystical and religious we can glean something of political and cultural interest from their contents. There are letters also of his great Murshid, H. Sharfuddin, addressed to nobles and officials, governors, princes and kings, many of whom were among his devotees at a distance. Instruction about religious mysticism had to be imparted through letters. To Muhammad Tughlaq whose real character was brought out in a Majlis and who requested the great saint for his blessings and for some special religious instruction, a characteristic reply was sent. The best prayer for him was that God might set right all his affairs in this world and the next. Men did not understand wherein lay good or evil for them. The Maktubat already in his hands might suffice for him. Nothing more could be written on such intricate matters as those of mysticism and Sufism (32).To Dawar Malik, "the Sadar"and "son-in-law of Sultan Muhammad" who wrote in highly eulogistic terms about the greatness and noble virtues of the great saint H.Sharfuddin, the reply was given that it was difficult to know who was what from his outward appearance. He disclaimed the greatness attributed to him and referred to himself in highly humiliating terms such as a wretched hypocrite, a 'dog of the court', as one resembling an idol-worshipper and wearer of Zunnar (Brahmanical thread), i.e. the worshipper of other than God. Satan was more widely known and exact things would be known only when the end came (33). Similarly Malikzada Mubarak who had chosen to give up the worldly pursuits for service and devotion to God was warned

They abstain themselves from all that is reprehensible for their way and they are always looking towards the Reality. The devotees and the pseudo- Sufis cannot realise the state of the mind of the Sufis who are the epitome of manners and discipline, and whatever they do they do correctly and they consider it to be right".

There is nothing on record that any one of the great saints of the Firdausia Order received grants of lands and villages for themselves or even for their hospices, but there is mention of gifts and presents (Nuzur-O-Futuh) received gratuitously from the devotees. We learn from the 15th century Shuttari Saint, H. Qazin Ola and Hussain Balkhi, that a Hindu grocer had his shop adjacent to the Khanqah of H. Sharfuddin who used to supply grain for the use in the Khanqah. When the amount became so big as 1000 'Tankas', he sent the information to the Saint. The dues were paid out of 'Nuzur' and 'Futuh' on the direction of the saint (27). The personal expenses of the Saint were few. Once his aged mother received a near kinsman from Maner as her guest and forgetting the injunction of her saintly son lit the fire in her house in daytime. The sudden appearance of the saint on seeing the smoke awakened her to the reality of the situation and she sent out the things alongwith the guest to some one else (28). Maulana Muzaffar, the ex-professor of Firuz Shah's College, was incharge of the kitchen of the Khanqah and his soiled and tattered clothes were a sight to see (29).He also refers in his letters to Sultan Ghayasuddin Azam Shah's presents voluntarily offered in the shape of clothes and also money for covering the expenses of his journey to the holy lands of Arabia. In one letter he writes "This helpless one has neither an issue nor power nor position, nor wealth nor rank. And all these voluntary offerings which had been received from the king were given away to the creatures of God. This only adds to the felicity of the king and the future rewards of virtue for him. The very little that yet remains out of the gratuitous gift would, according to the Divine saying, "For him who relies on God there is sufficient", suffice for the way charges of pilgrimage. This poor wretch has taken a vow that to whatever holy place he would go he would pray for an increase in the king's life and prosperity (30).

The saintly and puritanical Maulana was very

asked him as to why he did not give him a letter of recommendation he said that the needy man had said that his personal visit was necessary for the fulfilment of his desire (K.P.N).

In helping others the saints made no distinction of creed or colour. On the occasion of the annual 'Urs' or death anniversary of H. Sharfuddin Maneri, celebrated by the Balkhi saint, H. Husain Balkhi, Badh Kotwal, Syed Piyara and many others were present. A Hindu came to ask for his blessings and had a talk with him. Addressing the Kotwal and Syed-us-Saadat, the Katib (Secretary), the Saint said "The officials of the Diwani have demanded from him the 'Marsum' (prescribed fees or taxes) from which he had hither to enjoyed protection. Take up his case and secure exemptions for him'. When the Hindu had gone away, the Saint observed "Infidelity and faith, orthodoxy and heresy are all technical terms of differentiation;for after all, there is no such thing as absolute opposition or antagonism; these are relative terms". He added further "All are God's creatures", and related the stories of Prophets Moses and Abraham who, each in his own time, received warning and was rebuked by God, one for not responding to the call of help from Pharoah, the enemy of God, in the most critical hour of his life, and the other for refusing to accept as his guest an unbeliever (26).

Exceptions apart, the Qadria and the Chistia saints were comparatively more indifferent towards politics and shunned all connections with royalty and men of noble rank and position. The Suhrawardia, the Shuttaria and the Firdausia saints had no such aversion and were not so uncompromising in their attitude towards those who held power in their hands. There are instances of some having accepted offices and position in the State for they held that they did not do harm to those who knew the reality of things and did not become attached to them. The saintly author of Manaqib-ul-Asfia, observes "although it is not harmful to the perfect ones to mix with the people and have villages (grants) and Khanqahs provided they have no attachment to these. They allow these means and resources a place in their discipline, and yet whatever leads to distractions and remoteness (from God) is called by them idols and idol-houses. These do not cause distraction and remoteness as long as they do not become attractive and interfere in their contemplation.

saint in one of his long letter (71.M.S.) tells us about the virtues of service-of the learned to the seeker of knowledge, of the rich to the poor, widows, orphans, wayfarers etc., of the rulers to God's creation which are greater than worship and devotion. It was said that the chief of a certain town spent the whole night in prayers and the saint replied that the poor fellow had missed the way and undertaken the work of others. On being questioned again he added that the man's path of duty lay in feeding the hungry, clothing the naked, comforting the distressed ones, and fulfilling the wants of the needy men, and that keeping up whole night in prayers was the duty of a recluse. Each man ought to work according to his position in life (24). It was said about Khwaja Mamman Multani, a devotee, that he was very helpful in meeting the needs of the Musalmans. He said that service to a believer was more important than a 100 prayers and fasts (25).

Here we are told something which shows that the saints were the medium of contact between the masses and the rulers and they lent their services for ventilating public grievances. H. Sharfuddin observed that service to God's creatures was a great virtue possessed by the Prophets. The sages and holy men ought to respond to the summons of kings but they should not go to them unless they were called upon to do so except when they realised the impossibility of securing something from the kings for others. A Prophet who had helped a king ride his horse said, when questioned, that he did that so as to incline him towards himself for that was the way of making him set the affairs of others in order. At this, referring to himself, he added "At the time I used to live in the old cell at Rajgir, the ruler of the place was a Malik who had little contact with God's creatures. People used to come to me and requested me to do their work and write to him my recommendatory letters. I used to do so. Such cases became so numerous and so many people crowded in upon me that, human as I am, I began to feel disgusted. The Shaikhzada-i-Chisht happened to be there and seeing me in such a condition reminded me of my duty of taking up the troubles of God's creatures upon myself. He cited the example of Makhdum Maudud Chishti (d. 527=1132) who though rebuffed once when he had personally approached a ruler to recommend a case felt no hesitation in rising up from his 'Musalla' and repeating his visit twice to the ruler. When some one

loss of his property owing to the 'oppression' of somebody, perhaps an official. The very title of the letter "On Justice and Equity and the help to the oppressed ones" is suggestive of its contents. Quite significantly two incidents have been mentioned from past history of Islam, one of which was about the Prophet of Islam going to his enemy, the infidel leader, Abu Jahl of Mecca, and compelling him to restore the goods of a Christian, and the other was about 'Umar, the second Caliph, and Abdur Rahman-bin-Auff, a companion of the Prophet, voluntarily took up the duty of watch and ward at night on a carvan the members whereof were fast asleep and were unaware of the danger surrounding them. Moreover, three traditions of the Prophet have been quoted to the effect that (i) one who helps an oppressed person earns remission of 73 of his sins,(ii).One hour of justice done is better than 60 years of prayers and devotion. (iii). God will facilitate the passage through the 'Sirat' bridge on the Judgement Day of one who helps an oppressed person, but one who deliberately avoids redressing the grievances of an oppressed person will receive 100 lashes of fire in his grave". The concluding words are "God be praised! Today your exalted and benevolent self is the refuge of the oppressed and the down-trodden ones. The justice and equity of your court has become a lesson to the world". There is no mention of Zafarabadi nor the nature of the help sought for him.

All good and true Sufis, includding the great saints of the Firdausia Order,stood for social justice and were fully imbued with a sense of humanity. It was a part of their discipline to serve the needy and the oppressed ones. There are numerous references to the saints of the Firdausia Order trying to render what help they could to others. The great saint asked his devotee, Qazi Husamuddin of Daulatabad, to help a struggling and deserving person, Haji Mosul who was going there with his family. Maulana Muzaffar wrote to Khwaja Behram (L. 192) that Khwaja Siraj, an old, pious and God-fearing person, who was a Darwesh in the garb of a merchant and whose house was like a Khanqah for the paupers and the needy ones, was being harassed by the "Diwani Officers" of Khaspur (23). The addressee was not to go by appearances and do what was necessary to remove the just grievances of the old man and his dependents". A Sufi regards one's powers and possession as intended for the use of others. The great

any second visit to Delhi. On the other hand, there are definite evidences of the Sultan paying visits to the Saints of Bihar perhaps on the occasion of his first expedition to Bengal in 754=1353. Rafiq-ul-Arifin, a work of H. Husamuddin Manikpuri (d.856=1455) refers to the Sultan visiting H. Sharfuddin, saying his prayers behind him, and asking his blessings for his undertaking. The rare historical work, 'Sirat-i-Firuz Shahi', gives the details of the interview between the Sultan and the Suharwardia saint of Amber, H. Ahmad Chirmposh, at the latter's place in Bihar. In Malfuz-uz-Safar of 762=1360, there is a reference to the panic owing to the movement of Firuz Shah's army near Bihar, and the saint advised the devotee,in the night of Sunday,23 Safar, 792=January 3, 1361 to remain confined to his house. There is no evidence of the emperor stopping at Bihar Sharif on the occasion of his second expedition to Bengal. The Malfuz (21) of the 17th century Shuttari saint of Jandaha, Diwan Rukunuddin, says "when Sultan Firuz came to Bihar he first called upon Makhdum Ahmad Chirmposh (22) who did not show the respect due to him. When he went to Shah Sharfuddin Ahmad the Makhdum gave him due reception. The Sultan taking the hands of the Makhdum hinted that he should walk in front of him. The Makhdum, with due himility, kept himself behind the Sultan and made the latter walk ahead of him. At this Sultan Firuz recited this couplet "Gar Pesh Rawam Tariq-i-Hajib-war Pas Berawam Chunist Wajib" (If I walk in front it would be like a chamberlain, but it is incombent upon me to keep myself behind). The Makhdum immediately replied "Gar Pesh rawi chiraghi Rahi-War Pas Berawi Jahan Panahi" (If you walk in front, you serve the purpose of a lamp-but if you proceed behind,it would mean that you are the refuge of the world). There are other references to Firuz Tughlaq in the Maktubat of Maulana Muzaffar and in many of the Malfuzats of his great Shaikh; but we need not consider them here.

In the Maktubat of the great Saint we find a letter addressed to Sultan Muhammad Tughlaq, another to Firuz Shah, and a third to Maulana Yusuf alias Dawar Mulk, the son-in-law of Sultan Muhammad (Tughlaq). The first and the third were written in reply to the letters of the addressees requesting him to write something separately for them, while the second was a letter of recommendation, written at the request of one Khawaja Abid Zafarabadi, who had suffered from the

was 'at their instigation' that the Sultan sent a Farman summoning him to his presence. In the meanwhile the attendant of Syed-us-Saadat Syed Jalal Bukhari came to the Sultan to convey his benedictory presents (Tabarrukat) to him. The Sultan asked him for the reason why His Holiness the Makhdum had chosen to remember him after a long time. The attendant said "The Makhdum had received the Maktubat of Shaikh Sharfuddin Maneri after which he had gone into the 'Khilwat' (private closet) and was busy studying the book, and he would not see anybody for many days. This is the reason why so much time has elapsed". The Sultan repented at his orders and sent a fresh Farman asking his officials in Bihar to desist from sending the saint to Delhi for he said 'It is not advisable to make such a holy man move from his place'. The saint of Bihar had himself told his people of the interest taken by 'Makhdum-i-Jahanean' (Syed Jalal Bukhari) in getting the earlier Farman cancelled. Each of the two saints admired and respected the other and exchanged presents. We read elsewhere in the same book that once the devotees of Syed Jalal Bukhari asked him as to what he was particularly engaged in towards the end of his life and he replied that he had been busy with the Maktubat of Shaikh Sharfuddin Maneri They again asked him as to what this Maktubat was like and he replied "Even now something in it has not been fully comprehended (19)"

The Tughlaq Sultans were great admirers of the renowned Saint of Bihar. Muhammad Tughlaq sent a Bulgarian carpet and a Farman granting some villages in Rajgir for the up-keep of a Khanqah which also had to be built at State expense. "The eccentric Sultan" had also written that the Saint should be compelled to accept the gift The saint accepted the 'Musalla' but not the document about the Jagir. But the earnest personal entreaty of the devoted 'Muqti' (20) made him relent and keep the paper to save the Governor from the wrath of the despot. The author of Manaqib-ul-Asfia says that after the death of the Sultan the villages were returned to his successor, Firuz Shah. But we learn from Munis-ul-Qulub of H. Ahmad Balkhi that the saint went to Delhi for the second time in his life and after taking a promise from Firuz Shah that he would accept his request returned the Farman of his predecessor.

returned without doing anything. The Maktubat, Malfuzat, books of Aurad etc. of the Firdausia saints of Bihar are replete with quotations from the standard works on 'Hadis'. The Aurad-i-Dah Fasli of H. Husain Balkhi who had received his 'Sanad' in Hadis from his great uncle, Maulana Muzaffar in Aden, in 842=1435 entirely based on the 'Sahihain' of Bukhari, Ibn-i-Muslim and the works of Tirmizi, Nisai, Ibn-i-Daud, Inb-i-Maja, Baihaqi, Hakim Mashariq-ul-Anwar and Sharh-i-Masabih were very popular in Bihar and a Sharh on the former was compiled by Maulana Muzaffar. In the Majlis of 4th Zulqa'ada, 760=28 September, 1358 there was a detailed discourse of the great saint of Bihar on such types of 'Hadis' as 'Mursal', 'Musnad', Maruf, Majhul, Gharib, Mutadawal (14). Maulana Muzaffar wrote (L. 139) to his venerable Shaikh "I have heard that Maulana Zainuddin of Deva has brought Sahih-Muslim and the standard works on Hadis for the Makhdum, and on this science a large number of books has been already collected. If the Makhdum is gracious enough to send some volumes through a reliable relation I would return them after perusal and if permitted I may also transcribe them (15). " In the 'Ijazatnama' 9, dated 842=1438 he says "My son, Maulana Husain, has taken the Sanad of 'Hadis' from me, the poor man. and he has critically studied the Bukhari from the beginning to the end". H. Hasan Balkhi had committed the whole of 'Masabih' to memory within six months and earned the good will of his father H.Husain Muiz (17). Evidently long before the rise of the 16th century Maulana Abdul Haque, the Muhaddis (Traditionist) of Delhi, the illustrious sons of Bihar had taken up and popularized this branch of Muslim learning.

A very interesting fact indicating the estimation in which the great saint of Bihar and his works were held by his eminent and saintly contemporaries has been mentioned by the author of Manaqib-ul-Asfia. Reference has been made elsewhere (18) to the affair of the two Bihari followers of H. Sharfuddin Maneri who paid with their lives for their ecstatic utterances at Delhi and to the observations of the saint on the episode. We are told that when Sultan Firuz Shah heared this remark from interested persons, he summoned the Ulemas and people of repute and asked them why, when he had acted on their 'Fatwa' Shaikh Sharfuddin Maneri had spoken so. All were unanimous in advising the Sultan to summon him to Delhi to ascertain the reason from himself. It

Shaikh Abdul Ghafur Azampuri, says that the latter was an official and a soldier by profession. One day while standing in the 'bazar' he saw some fragments of the Maktubat of Shaikh Sharfuddin Yahya Maneri in the hands of some one. When he borrowed it from somebody and studied it, specially that portion which inculcated the abandonment and condemnation of the world, the effect was so great and immediate that he detached himself from the world, gave out all that he held in charity, became a recluse, and devoted himself to the service of God We shall discuss this aspect of his views later in connection with the question of 'Kasb' or acquisition and renunciation.

H. Abdul Quddus, himself a great saint, writes in letter 117 of his widely read 'Maktubat' which was addressed to the great Lodi noble, Masnad-i-Ali Haibat Khan Sarwani, "If somebody feels interested in the subject of dream, he should seek its interpretation like that given by Ibn-i-Sirin (11). I heard from the lips of Shaikh-ul-Mashaikh Shaikh Badhan (12), and the latter got it from his own Shaikh, the Qutub of Qutubs, Proof of God, to the people, Shaikh Muhammad Isa (13), may God sanctify his secrets, that the business of interpreting dreams ended with His Holiness Makhdum-i-Jahan, the Qutub of the age, Shaikh Sharaful Haq Waddin Maneri may God sanctify his secrets!" Allusions to dreams and their interpretations are found in many places in the Quran. The oldest work on Ilm-ul-Taabir or the science of dream interpretation, one of the highest in Natural Philosophy, is ascribed to the Sixth Imam, Hazrat Jafar-as-Sadiq. He was followed by Ibn-i-Sirin and a host of other writers on the subject. The question of dream and its interpretation was frequently raised in the Majlis as we find in the Malfuzat, and the Saint referred to Ibn-i-Sirin and others. A 'Falnama' in Hindi ascribed to him is also found in an 18th century manuscript which belongs to Khanqah-i-Imadiya in Patna City. Other copies include one in Asiatic Society Library, Calcutta.

That the great saint and his Balkhi successors were amongst the first in India to contribute much towards the diffusion and dissemination of the 'Hadis' literature will have to be admitted. Barni says that in the time of Muhammad Tughlaq Maulana Shamsuddin Turk came to India laden with 800 books on 'Hadis' but hearing of the ways of the Sultan he turned back and

than he who knows Him less and is less detached from the world (9).One can reasonably suppose some sort of connection, though unacknowledged, between the mystic thinkers of the Punjab, of Sarhind and Bihar. Syed Ahmad Sarhindi is credited with having been the first to effectively challenge the validity of rather pantheistic interpretation of Divine Unity given by the Spanish savant, Ibn-i-Arabi. But H. Sharfuddin's works had already been in the field for a long time, and were eagerly read by those who could count, and contained his views about those aspects of Ibn-i-Arabi's teachings which were repellent to orthodox Islam. That the great Sarhindi author of the theory of 'Zil' or shadow held the celebrated saint of Bihar in high esteem is evident from his respectful reference to some of his views even when he differs from them. For instance he has mentioned H. Sharfuddin's views while dealing with the problem of 'Mauzatain' In a letter (10) he has tried to satisfy a questioner. Mulla Shams,about a paradoxical statement of "Shaikh-ul-Mashaikh Shaikh Sharfuddin Yahya Maneri" which occurs in his booklet 'Irshad-us-Salikin'

As for others there is positive proof of their admiration for this great son of Bihar. Abul Fazl says in Ain-i-Akbari "How beautifully has Shaikh Sharfuddin Maneri said" what can be done with a man who is not satisfied with a lamp, when the sun is down? Every flame is derived from the fountain of Divine Light (the sun), and bears the impression of its essence. If light and fire did not exist, we should be destitute of food and medicines; the power of sight would be of no avail to the eyes. The fire of sun is the torch of God's sovereignty". Abul Fazl might use this extract for dilating on the splendour of his great luminary, Akbar, and the Parsis might find in it a justification for their veneration for the sun and fire, but the great Saint of Bihar had nothing to do with all these.

That H. Sharfuddin was an all-India figure, and so were at least two of his Balkhi successors, H. Muzaffar Shams and H. Hussain Nausha-i-Tauhid, is abundantly proved by the way in which they and their works have been mentioned in the standard biographical dictionaries of the mystic saints of Islam. H. Abdul Haque, the greatest 16th century traditionist of Delhi, while noticing a well-known saint of the Chistia Order H. Abdul Quddus Gangohi (d. 945=1537) and his disciple

realised that the renowned saint, H. Sharfuddin, was not only well-versed in scholastic theology and the theosophy of Islamic mysticism, as already propounded by his predecessors, immediate or remote, but was himself a speculative thinker of a high order, and the pattern of thought that he set became a model for his contemporaries and for the succeeding generations. The most striking thing in his teaching is that despite his sympathy with the conception of the Unity of Being (Wahdat-al-Wujud) he disdained pantheistic beliefs and did not depart from the uncompromising Monotheism of the Quran and he tried to solve, in his own way, the problem of the One and the Many, the Unity of God and the multiplicity of the phenomenal world. This harmonising of the mystic and Islamic ideas has been the prevailing feature of the Sufistic doctrines not only in Bihar but elsewhere. Very few realise the far-reaching influence of H. Sharfuddin Maneri's life and teachings, therefore, it is worth while to consider in this lecture how the theoretical and practical sides of mysticism as presented by this great Saint and his immediate successors influenced others and moulded the life and thoughts of the people in Bihar.

Many people in modern Bihar and elsewhere have begun to show a tendency of veering round the views of the Naqshbandia and Mujaddadiya school. Khwaja Bahauddin Naqshband, the founder (d. 751=1389) held that outwardly one is with the world, inwardly he is with God (Azzahir Lil Khalq, Al-Batin Lil Haqq). Khwaja Baqi Billah's (d. 1603), theory of Mayiyat (association) arising from the Quranic verse "Wa Huwa Ma'akum Aynama Kuntum" (He is with you wherever you are) is virtually the same as that of H. Sharfuddin Maneri though expounded in his own difficult way and phraseology by the Naqshbandi saint. As regards Baqi Billah's disciple, Syed Ahmad Sarhindi, entitled Mujaddid Alfasani (Reformer of the second Millenium), who died in 1034=1625, his theory of Wahdat-i-Shuhud (Apparentism) , when carefully examined is, not very different from the theory of Unity of Being as interpreted by the great saint of Bihar. Both say that God is everywhere and with everyone and is free from 'Urz' and 'Jawhar' (accident and substance); that association does not mean union of body with the body, substance with substance, but it implies intuitive contact; and that one who knows more and detaches oneself more from others than God stands nearer to Him

hoped, give some idea of the philosophical and theological aspects of Islamic mysticism as they were understood and developed by them. It may be remarked that while the sufis of Bihar, specially the renowned Hazrat Sharfuddin Maneri, show a great deal of originality in the presentation of the views as well as in the interpretation of mystic experiences, they are very guarded and circumspect, and always take the fundamentals of Islam into account. None of them can be said to be a systematic metaphysician or the builder of a new and original system of philosophy like the great theosophists and theorists such as Ibn-i-Arabi, Ain-ul-Quzzat, Shihabuddin Suhrawardi, Maqtul, Imam, Ghazazali and others. But they all evince a remarkable quality of mind and are endowed with great spiritual gifts. Hazrat Sharfuddin and the Balkhi saints, whose views are not different from the former, were possessed of an exceptional balance of mind, sobriety of judgement, depth of insight, and sincerity of purpose. They were all great Divine and scholars, besides being great saints. Pre-eminently Hazrat Makhdum Sharfuddin Maneri had a width of knowledge, profundity of thought, lucidity of expression, and logical vigour in his arguments which are not often combined in one person.

An attempt will be made in the next lecture to throw some light on the distinctive position of the early Sufis of Bihar and the insight they give us into the life and culture of the people of their time.

III

An attempt was made in the second lecture (8) to give some idea of the outstanding figures among the Sufis of the Firdausia Order, the mystic literature they produced, and the distinctive characteristics of Sufism which one finds in the works and teachings of the greatest of the Bihar Sufi Saints, H. Sharfuddin Ahmad Yahya Maneri of the 14th century. He wrote and said so much on such a vast variety of Sufistic doctrines, beliefs, and practices, and h's worthy successors, the Balkhi saints, have also left so much of their views and teachings in a recorded form that it was impossible, at least for me, to give within the small compass of a lecture, the skeleton-outline even of the essentials of their multifarious teachings. From the little that was considered it may have been

all obligatory duties. The disease of the heart lies in lustful desires and appetites. One who does not restrain oneself from such desires, but knows it to be sinful endangers one's life; but he who does not regard it as harmful runs no such risk, for he is already dead.

Then there are those engaged in "Reyazat-i-Badani" (physical abstinence, austerity or self-discipline) and they think that they can at once purify themselves from lust, anger and other evils condemned by 'Shara' or law. When they fail after taking pains and practising self-discipline for a long time they think that the task is impossible. They argue that man as he is constituted cannot become completely pure, just as a black blanket cannot be turned into a white one, and, therefore, it is no use trying what is impossible. It is ignorance and foolishness to think that the Law enjoins complete freedom from lust and other impulses inherent in human nature for the Prophet has himself said, "I am a man and may be angry" and very often signs of anger were visible in him. God praises one who controls anger, not one who is devoid of anger. The Prophet had nine wives and he encouraged marriages and begetting of progeny so as to perpetuate the race and good name. But he said that anger and lust should be kept under control as the horse is controlled by the rider, and the dog by the hunter. Anger and lust are like horses and dogs which are so useful but which, if not trained and controlled, will set upon and throw down the rider and the hunter. The game of felicity in future would require them, but they should not be allowed to gain ascendancy over us so as to destroy us.

There is again a fourth group of people who in their foolishness proudly declare that everything is preordained...There is no use or need for exertions...When the prophet told his Companions of this (Divine Will) they said that they would depend on the eternal law and would refrain from exertions, the Prophet replied, "you shall exert and then what has been ordained will be given to you. You should not abstain from world...Good and evil hinge upon Virtues and Vices, in the same way as health and death hinge upon food and starvation"

The few points picked up at random from the writings of the greatest saints of Bihar will, it is

acts. Though they admit that a man has acquired the power to act, yet he is so engrossed in the guidance of God as to be oblivious of his acts. His choice is controlled or restricted, (Istarari) for whatever God wills happens. "You can not wish anything which is not willed by God". 'A´inul Quzzat illustrates this by saying that particles of dust fly in the whirlwind due to storm and not by themselves". After this the saint tries to meet the criticisms arising from the thesis that a man does what God wishes and can not do otherwise. A disbeliever and a sinner is free in his choice of action but just as the Law of Nature will take its course, so does the 'Mashia´t' or the will of God and Man can not escape from his responsibilities. Secondly it is said that when a man did what God wished, he must be taken as obedient to God. This is not so, says he, for God gives him the power and capacity (Istata´at) to be rightly guided, to be believer, sinner or obedient. Obedience means the carrying out of orders given and not doing according to wishes. It is characteristic of man that the same power which induces him to devotion makes him commit sin.

In letter No 18 on "Misconception of men" Hazrat Sharfuddin refers to four types of men who fall owing to their doubts and wrong notions. Some say that God does not require the worship and service of His Creatures and is un-concerned with their Virtues and Vices This is due to ignorance and wrong notions that the Laws are for the sake of God, whereas they are for the sake of man himself. A physician prescribes medicines not to please himself but to cure the patient. Others transgress the Canon Law, trusting in the Divine Mercy. But God is not only Merciful and Gracious, but also a severe Chastiser. One who takes poison and depends on Divine Mercy may die. Many people are in pain, poverty and distress inspite of God's unbounded Grace and Mercy and unlimited Treasures. Not a single grain of wheat can be grown without taking great pains in cultivating the fields, and no man can be healthy without bread, water and medicine. Such is the case in the sphere of the other worldly things or futurity (Akhirat). Denial and ignorance are poisons to the soul, and idleness is a disease which, if not treated, will lead to destruction. There is no antidote for the poison of infidelity and ignorance except knowledge and wisdom, and there is no cure for the disease of idleness except prayer and performance of

all initiation and creation to the Divine will and hold that man has the limited freedom of Choice in action through 'Kasb' or acquisition. The Ash'arite thinkers make a distinction between the freedom of man's choice in acquiring a certain form of conduct or undertaking certain actions as such, and their power of bringing into existence or creating a certain form of conduct or giving rise to or initiating certain actions. The Jabarites or the Muslim determinists believe that human actions are determined by an external agent which they identify with God. The Bihari saints do not favour the doctrine of Jabr in the sense of compulsion imposed on the individual from outside and also deny that the man is the maker of his own destiny. The question of determination and free-will involve the ethical problem of good and evil and of the Responsibility and Moral Obligations. Some would not encourage such discussion. But H. Sharfuddin did not shirk the responsibility of satisfying the enkquiries and his Malfuzat contain much on the subject. Maulana Muzaffar advises one of his addressees (L. No. 30) to tread the path of 'Shara and not to bother himself about Fate or Destiny. His great Shaikh explaining why a thing desired by the slave does not happen but whatever God wills happens, says that the secrets of fate and predestination are very subtle and "this path is very narrow". On the whole the Bihari Sufis hold like the Asharia thinkers; "Al-Iman Bainul Jabar Wal Ikhtiyar" (Faith lies between compulsion or necessity and choice or freedom).

They believe that man is both 'Mukhtar' (endowed with power of choice) and 'Majbur' (controlled and restricted by Divine will) and he is in some sense free and not free at the same time, for his freedom is limited by his restricted power of choice. He has a certain share in the divinely ordained act which the Ash'arites call 'Kasb' (acquisition). The limitation of man was exemplified by Caliph Ali who asked a questioner to raise one of his feet from the earth which he did but when ordered to lift up the other also he could not do that.

Hazrat Sharfuddin Maneri, while discussing this quertion in Ma'dan-ul-Ma'ni says "The explanation of the Sufis attributing an act to God and not to themselves lies in the belief that whatever happens is due to the guidance of God. They are so immersed in this guidance that they are not conscious of their

love. The lower stages of 'Tauba' (penitence), 'Zuhd' (austerity) and likewise lead to knowledge of love, while the knowledge of love, once attained, directs the traveller to the higher stages of 'Shauq' (Desire) Uns (affection), & 'Riza' (satisfaction or resignation).

The complex question of man's freedom and power to act and the relation between the human and the Divine will had begun to exercise the minds of the Muslims from very early times and discussions on the problem of 'Jabro-e-Ikhtayar' (determinism and freedom) or 'Qaza-o-Qadar' (predestination and power) had already given rise to four distinct schools of thought in Islam. We need not consider the disputed question of foreign and indigenous factors influencing the rise and development of the views of free will of the 'Qadarites', of self-determination of the .'Mu' tazilites' or the rationalists, of determinism of the 'Jabarites' or the Necessitarians, and of the qualified admission of freedom with the limitations prescribed by the orthodox Ash'arite theologians who were supported by the great Ghazzali and held that there is nothing over which the Omnipotent God has no power and that Man's acts are subject to the will, knowledge, guidance and favour of God. The question as to whether omnipotence and omniscience of God leave any room for man's freedom and responsibility for his acts, good or bad, has always worried thinkers, mystics and poets of Islam. A Persian poet wrote, "Har Nek-o-Badi ke Dar Jahan Miguzarad-Khud Mikunad-o-Bahana Bar Am Nihad''. 18th century Urdu poet, Mir Taqi Mir, said the same thing - "Nahaq Ham Majbooron Par Yeh Tuhmat Hai Mukhtari Ki- Chahe Hain so Ap Karen Hain Hamko Abas Badnam Kiya" (It is very unjust to call us a free agent when we are really helpless-He does whatever He wills and we are held responsible for nothing). These lines seem to express the 'Jabaria' view.

The early Sufi saints of Bihar were quite familiar with the views of all the schools. They disagree with the views of the Qadarites and the Mutazalites who advocate the theory of human freedom and say that man is endowed with power of initiation, is the creator of his deeds, both good and evil, and is therefore deserving of punishment or reward. The Behari Sufi thinkers are in sympathy with the views of the orthodox 'Asha'rites' who assert the Absulute omnipotence of God the creator of man and all his actions. They attribute

(believer) without realising (meeting) God. This stage can not be realised without complete detachment or severance from everything other than God. One who considers himself attached (Mausul), on account of devotion (Ta, ʿat) and detached (Mafsul) due to his sins, is guilty of attributing 'Wasl' (Union) and 'Fasl' (separation) to something other than God and there he commits duality. That is to say, the slave does not become perfect in 'Iman' (faith) unless his qualities are all to all, from God', 'with God', 'for God', and 'towards God'.

On Divine love (Muhabbat-i-Haq), after laying down that the object of the Khawass (chosen ones of God) is not paradise or reward in heaven but love (Muhabbat) and Deep knowledge (Maʿrifat) of God, he explains that a majority of the Sufis do not go to perform 'Haj' (pilgrimage to Mecca) because they are not sure of the knowledge or love of God in their hearts and because they think that visiting any one in his house is good only when one has known him and loved him. The Makhdum says further that the sign of the love of God is that there should be no place for anything other than God in one's heart. He illustrated this point by citing the example of Rabia Adawiyya of Basra who, when asked whether she also treated the Satan as her enemy, on the ground that he was an enemy of God, replied that she had no time to look to it on account of her love for God. The Makhdum thought that this story referred to the condition of the inner self (Batin) or soul which could be externally (Dar Zahir), judged only by the extent of one's observance of the commands (Awamir) or prohibition (Nawahi) of God. To illustrate this point the Makhdum related the story of a certain Darwesh of some influence (Tasarruf) who allowed his concentration to be disturbed by the damsels of paradise who were to be his share. They appeared before him one night. He simply cast a glance on them and was immediately punished, next morning.

Elsewhere, in letter No. 74 of Maktubat-i-Dosadi, M. Sharfuddin writes that love of God is the aim and object of the devotee in all stages and is superior to all the grades of 'Suluk' (path) and that there is no stage which is not a fruit from among the fruits of love. He explains that all the stages in the Path are either those that lead to love nor those which are attained through love and are fruits or products of

other is to cease to care for the morrow. The one is the renunciation of the world and its concerns, while the other is the renunciation of self. Another duty of the seeker is 'khilvat' (retirement or seclusion) outer and inner. Outer seclusion is to separate oneself from the people so as to die at the Divine threshhold, while the inner seclusion is to cleanse the heart of all thoughts external to God and wash off all dusts of this world and the next. The third duty of the disciple is to be One in thoughts and speech, and the fourth is little eating, little talking and little sleeping, for these things help the 'Nafs-i-Ammara (the imperious Nafs or concupiscence). Too much talking makes one busy with other than Dhikr (remembrance or recital of God's name). Excessive eating causes heaviness and lethargy and too much sleeping interferes with 'Fikr' (or meditation). Purity of body as well as of mind is always necessary in order that God by His attractions may elevate you to a stage unattainable by all efforts and austerities of men and genii put together....In short, when the disciple realises the Majesty and Greatness of God and knows that "Who gains Him, gains all, who loses Him, loses all", he can dispense with all save God and attains "Tajrid" and "Tafrid"

Letter No 44 is on 'Shirk-i-Khafi' the meaning of which, we are told, is the attribution of benefit or loss, good or harm to some one other than God (Haq-Reality). Hanging of one's hopes or fear of some one other than God are also 'Shirk-i-Khafi'. In the same way, the minutest traces of show and affectation, hidden pleasure (with one's own action) and satisfaction and disgust with other peoples' praise or disapproval are all included in 'Shirk-i-Khafi'. 'Iman' (faith or belief) is compared with gold the value of which depends on its absolute purity. Just as the value of gold is destroyed by mixture (even of silver), in the same way 'Iman' also loses its value by the mixture of hidden 'Shirk'. And 'Iman' which is absolutely pure and free from the slightest trace of duality is much superior to that where there is the least trace of duality. The disciples are specially warned against 'Shirk-i-Khafi'. It creeps in as stealthily and invisibly as the creeping of an ant on a black stone in the dark night. Perfect Iman has been described as seeing everything as truth and reality all Existence as Him. One who sees anything else than God is guilty of believing in duality. There is no rest for the Momin

obligations while he is in this state of ecstacy.

About 'Tajalli' which has been described as "the manifestation of the sun of 'Haqiqat' of God out from the clouds of humanity", the great Saint of Bihar says that the manifestation is both of Divine Essence (dhat) and of Divine Attributes (Sifat). He says further that the Divine Attributes are of two distinctive types_ Jalal (Grandeur, glory and force) and Jamal (beauty, mercy, grace and blessings). They have their characteristic effects just as 'Khauf' (fear) from Jalal and hope (Raja) from Jamal. To the question of Mubarak Qasuri whether manifestation of Divine Essence would be for the soul only, the Makhdum's reply is in affirmative, As regards the soul on which there is a long discourse in letter 79 (M.S) the great Saint points out and discusses the views that have been expressed by different groups of people on it whether it is body or essence or accident or whether it is eternal or created, and he says that the orthodox Muslims (Sunnis) believe in what is laid down in the Quran "Qul-ir-ruh-o-min amre rabbi" (Say that soul is the command or amr) of my Lord. Khawaja Junaid and all the jurists and the Imams told that the Prophets were not commissioned with the task of dealing with its nature, quality and condition. Much have been said about 'Ruh' 'Qalb' 'Nafs' and 'Aql'. But neither the Quran nor the Shariat tells us about their reality. It is only their effects, action, and attributes that have been indicated.

Elsewhere in letter 81 he writes, "Know that man who is the epitome of the whole Universe, is composed of the 'Ruh' (soul) 'Nafs' (essence, spirits, or carnal Desire) and Qalib (body). The soul leads the believers to heaven, being its image, while the 'Nafs' (carnal spirit) leads him to hell, being its image...The 'Nafs' is the essence (Aim), not quality, though it is endowed with qualities which are apparent. It should he brought under control by austerities or ascetic practices, though its essential nature cannot be destroyed completely. When the seeker has got mastery over it, there is no fear from its existence.

In letters Nos 61 and 62 on 'Tajrid' (outward separation) and Tafrid' (inward solitude), so indispensable to a disciple, the great saint writes that one means giving up what one gets to-day while the

Negation and Affirmation are both 'Shirk', that is, abrogatory to the conception of Absolute Unity. In true Affirmation or Negation three things are essential (a) one who affirms, the Being affirmed, and the act of affirmation, and (b) the act of Negation, one who negates and the thing which is negated. If one who calls these two acts of affirmation and negation different things he is a polytheist and an atheist, how can one who takes them to contain six distinct entities be like a sincere believer and a Unitarian? How shall one who has no existence negate God, and similarly, when you are yourself not you (i.e. do not exist), how can you affirm the existence of God. Shaikh Harvi has hinted at this in his verse There is a Plain (world) beyond 'Nafi' and 'Ithbat' which these people become enamoured of. When the lover reaches there, he becomes non-existent, and there remains neither 'Nafi' nor 'Isthbat' nor is there any place for his entity (There can neither be denial of that which is non-existent nor can a non existing entity make a denial for you only think that you exist when really you do not exist, and when you do not exist, how can you affirm any thing? It follows logically that the seeker of God is not in a position to deny the existence of anything other than God, or affirm the existence of God as such).

Much has been said about the Sufi conception of 'Fana Fillah' (Effacement unto God). It is not synonymous with that of 'Wasl' in the sense of identification with God for union with God can never be attained even after the separation of body from the soul after death. Fana Fillah, according to the real Sufis, means self effacement to such an extent that nothing exists except God is one's eyes. If you will not annihilate yourself and lose consciousness of your entity you can not realise God (Isharat). After the realization of God, there is no 'I ness' or self consciousness. A critic may say that when a man loses all sense of his attributes it is not incumbent upon him to follow the religious ordinances. The reply is that God Himself makes him so and he has not becomes so of his own accord. So long as he retains his personal qualities or consciousness of his separate entity he is under the obligation of observing what is lawful and abstaining from what is prohibited. But when he is lost to himself and is handled by God he is free from the clutches of 'Nafs' and God will not find fault with him if he is not able to carry out the religious

God's Existence is eternal (Qadim), while that of the world is contingent (Hadith) To the question posed as to how can the world be a mere reflection or appearance when we are susceptible of happiness and sorrow, pain and comfort, and so on, the reply is given that in dream one imagines to be intimidated, afflicted or honoured and yet these have no existence in reality. Though they are mere ideas or appearances, they indicate or imply some Reality. It is the business of the interpretor to take him from surmise or idea to Reality which is the Reality of God's Existence. This is the Unity which is the aim and object of the Traveller. When the Traveller reaches this stage he realises the Real Existence of God. Consequently multiplicity disappears 'Shirk' (polytheism) Hulul (Descent or incarnation) and Ittihad (Identification) vanish and the question of nearness or distance, separation or union, does not arise. The traveller is relieved of all such ideas and he realises and finds through 'Ilm-ul-Yaqin and 'Ain-ul-Yaqin' (certain knowledge, true insight) that there is only one Existence and that is the Existence of God. Verses. "There is no room for duality in the court. The whole universe is thine and thy power. The Existence of the whole creation (Kaun) is thy shadow. And all is manifestation of thy work and power". Ghalib, the Urdu poet says _ "hasti ke mat fareb men ajaiyyo Asad-A'lam tamam halaqa-i-dam-i-kheyal hai; han khaiyyo mat fareb-i-hasti-har chand kahen ke hai nahin hai; sabza-o-gul kahan se aye hain_abr keya cheez hai, hawa keya hai; yeh parichehra log kaise hain_ Ishwa-o-ghamza-o-ada keya hai; Jabke tujh bin naheen koyee maujud_Phir yeh hangama-ai-Khuda keya hai".

One of the characteristic methods of devotion of the Sufi mystic is 'Dhikr' or the concentrated and continual recitation of 'La Illaha Illa Allaha' (There is no God except God), i.e. the negation of all that is not God and affirmation of God's Existence. About the significance of the utterance and its two parts, Negation (Nafi) and Affirmation (Ithbat) we are told that they are relative terms and they are attributes of humanity. So long as the traveller has not crossed over the condition of humanity, he will not arrive at the world of Unity". We read further in letter No. 40 of the Maktubat-i-Sadi._ "In lexicon Affirmation follows Negation, but in the opinion of the Jurists it precedes that; while, according to the knowers (Arifin),

discriminate between 'Tajalli' (manifestation) and 'Hulul' (penetration or incarnation). Without the guidence of the 'Pir' there is danger of many people going astray at this stage. And yet there is another stage of Fana-ul-Fana wherein the Murid has lost consciousness of his effacement and even forgets the knowledge of his identity with the Lord of Beauty and Power. Consciousness implies separation. He loses the very consciousness of his effacement. But one who is lost in God is not God. In the case of the mirror and the face there is neither union (Ittihad) nor incarnation (Hulul).

In this letter, it may be noticed, while discussing the fourth stage wher Makhdum Sharfuddin makes a distinction between "Nabudani" and "Na Didani", or nonexistence or invisibility, he does not assert the non-existence of all that becomes invisible to the sufis in his state of ecstatic illumination, and thus the existence of the seeker as worshipper of slaves of God is affirmed & maintained. In fact, even Ibn-i-Arabi who is a thorough-going monist, and holds that man is the microcosm in which all the Divine attributes are united does not identify man as an emanation, existing in the world of appearance as a Vicegerant of God, the Ultimate Unity and the only Reality.

Considering the importance of the conception of the Reality of existence in Sufi theosophy it is worthwhile to quote only two extracts. In 'Tuhafa-i-Ghaibi' the great Saint writes "There is no entity which exists Italics except the existence of God the reflection in the mirror has no reality. This is the case with the entire creation which is inherent in the existence of God. Everything besides God is like the shadow to the Sun. There is no shadow when there is no Sun". On ff. 12 b 13 a of Sharh-i-Adab-ul-Muridin we get "The affirmation of two 'Maujuds' (Existing realities) is as much an infidelity in the estimation of the unitarians as that of two 'Ma'buds' (Divinities to be adored) is in 'Shara' (Law). The Unitarians speak of the existence of two kinds of existence, real and apparent. Real Existence is that of God. The world of appearance as such has no real existence". But due to the innate disposition of the Real Being, that is, God's Existence, it takes shape as in water, mirror or dream. But these forms (reflection) have no real existence and are mere appearances. They also say that

and efface themselves in the Reality of the Ultimate Reality. Having lost the self, they exist in the true one, and rising above the lower nature they are at one with the Truth or one True Reality. Another class of men, 'Salik' or seekers of God is that of the 'Mutasawwefin' who are similarly in quest of the above standard through Mujahidat (earnest striving after mystic life) and Reyazat (spiritual exercises and austerties); and the third group is that of Mutashabbihin who for the sake of position wear the garb of but are still unaware of the virtue of the above two. It is hoped that they and the Qalandria and the Malamatia, by observing and preserving Ikhlas (sincerity) and rules of Sidq (truth) and gaining freedom from the evils of Nafs (carnal desire) may become qualified to attain the stage of self-effacement in God like the other two.

The very first letter of the Maktubat contains a discussion on the Unity of God. There are 4 grades (1) A verbal assertion of the 'Kalima' without accepting it from the core of one's heart. This is the way of the hypocrites. (2) Oral recitation of, and also sincere belief in, the 'Kalima' which is the method of scholastic theologians who take pains to support their contention by convincing arguments. (3) Then there is the Tauhid of the knowers (Arif) whose faith is unlike that of the Muqallids (followers) or imitators and Mutkalliman (scholastics). This is achieved by the appearance of the inner light (Nur-i-Batin) which makes him see that all things have one origin, there is not but God, as the doer, and everything has emanated from, or is a manifestation of, Him. In this stage one can say 'Hama-azust' (4) Next is the display of the inner light in the fourth or higher stage to such a degree that all forms of existence are hidden from the eyes in that illumination just as particles of air and dust are not visible in the rays of the sun. This does not mean that the slave becomes God for non-existence. (Na Budan) is something and invisibility (Na Didan) is another. When you look into a mirror you do not see the mirror as you remain engrossed in yourself but you cannot say that that mirror has become nonexistent. This is called 'Qudrat Dar Maqdur', that is, the liberty or power which is enjoyed by that which is itself determined by the superior will. This stage is that of 'Fana Fit Tauhid' (self effacement in the Ultimate unity, wherein the Sufis are unable to

'Arif' (knower) he does not stand in need of the observation of the obligations of the Shariat'.

In letters 25 & 26 (Maktubat Sadi) Makhdum Sharfuddin writes that the 'Shariat' (the canon Law) is a way laid down by the prophet for his followers. All the prophets who have had one faith, one mission, and one God, have first called attention of the people to Divine Unity, and secondly, to service & devotion. They, as spiritual physicians of humanity at all times, prescribe for the followers the rules according to the exigencies of the situation. There was no difference or contradiction in the essentials (teachings) of their missions. The law of 'Shariat' consists of a series of injunctions and prohibitions, the observance of which means Islam, and it deals with the belief in Divine Unity, bodily purification, prayers, fasts, pilgrimages, the holy war, charity & command about other transactions. 'Tariqat' (the path of God) follows from 'Shariat', and consists in the seeking of the reality or essence of these transactions, investigating the things prescribed by law, adorning actions by purifying the heart and cleansing the moral nature of impurities such as hypocricy, lust, violence or injustice, polytheism, and so on and so forth. "Shariat" deals with the external conduct & bodily purification, while 'Tariqat' implies innner spiritual purification. 'Wazu' (ablution) before prayers is 'Shariat', while to be always with 'Wazu' is 'Tariqat. While "Shariat' is the soundness of external condition, 'Haqiqat' (Truth) is the soundness of the inner condition. The law is liable to change or modification for it is the work of man, but Truth is immutable and the same from the times of Adam to the end of the world, and is in the Divine Sanctuary. The one is like the matter or body, while the other is like the spirit or soul. it is only the heretics who allow or countenance one without the other, and it is they who say that one who attains 'Haqiqat' is absolved from the rules of 'Shariat'. The real Sufi never abandons the rules of the 'Shara' as regards commands and prohibitions, or neglects the prescribed laws of Islam.

In an earlier letter (No. 22) he wrote about 3 classes of mystics or theosophists. There are the Sufiya who draw upon the 'Shariat' so as to find their way from 'Tariqat' to 'Haqiqat'. They detach and disentangle themselves from every thing other than God,

beliefs and conventions, ways, methods, and practices of Sufism as also about the manners, morals, conduct and behaviour of the Sufi mystics. He warns us against adopting their ways and methods and following the path chalked out by them without fully comprehending their cardinal beliefs and principles, the true significance of their external and internal rules and conduct, meaning of the technical terminology they use, and indeed the real spirit of their teaching, for "there is an abundance of hyprocrites who in the garb of 'Tasawwuf' have drawn the veil across the condition and observation of the really authoritative Sufi mystics". In Majlis 4 on Friday 1st Ramzan, 775 or Feb. 14, 1374, the question of the "Mushaikh or Dervishes of these times" was raised and the Saint said that the occupant of the Sajjada (carpet) must be aware of the significance of, and follow, the Paths of 'Shariat' (observance of the Canon law as well as the obligatory rules and duties of Islam) 'Tariqat' (Purification of the heart with the insight in the nature of) 'Haqiqat' (Realization of truth or the ultimate Reality), and one who was not in the know of their significance and did not tread all these paths was not a 'Sahib-i-Sajjada, but was a Satan unto himself, and his carpet was not a 'Musalla' but an idol and a Brahmanical thread. Such men were seekers of position and traders in the faith. He warned the audience to beware of such 'shopkeepers' who were not 'Rahbar' (guide) but 'Rahbur' (highwaymen). The Sufi becomes the wearer of the green cloth and a shawl and a keeper of 'Chilla' but he may not become a Musalman. He was eager to be called a Shaikh (holy man), Zahid (a man of austerity) and 'Abid (servant or worshipper of God) but the did not try to attain the true and perfect faith". This reminds us of what the 15th century Shutari Saint of Bania Basarh says in Madan-ul-Asrar' about the pseudo saints who posed as learned recluses and used to wrap themselves in "Hazar Mekhi" or "Mush Dandani" garbs, and also of Maulana Rumi's couplet, 'Aye Basa Iblis Adam Ruway Hast-Pas ba Har Daste na Bayad Dad Dast' (there are many Satans in the garb of Adam. Hence you should not place your hands in those of every one and follow him).

A Sufi, however high he might stand and whatever stage he might have reached, is never absolved of the behests and prohibitions of Shariat (Awamir-o-Nawahi). H. Sharfuddin denounces those who think that when the traveller reaches the stage of 'Haqiqat' and becomes an

the city and a party of his followers called him a God. One of his disciples affirmed that a God had appeared in Delhi, that is Ahmad Bihari. When these facts were proved against them, I ordered them both to be confined and punished with chain''. The emperor does not refer to their execution (Elliot II. 518). It seems that the Sultan was misled by the official Muslim clergy. We are told by Hazrat Shuaib, that when the great Saint of Bihar heard of this he felt pained and exclaimed that he would be surprised if a city where the blood of such 'Buzurgan' (sages) was shed remained populous and prosperous. The pious writer gives his own reactions by regretting that there was none among the assemblage of the Sufi Saints and Divines at Delhi who could secure the release of these two saintly but frenzied people by pleading their ecstatic condition. He ascribes the misfortunes of the sons and successors of Firuz Shah and the havoc wrought by the Mughals in Delhi to their unjust execution.

It is significant that H. Sharfuddin expressed a similar regret that no one could save Mansur-Al-Hallaj. Ajwaba-i-Kakavi, a mystical tract, mentioned in Manaqib-ul-Asifa, was addressed to one of these frenzied people by the great Saint of Bihar. Such utterances as those of Mansur or of the Bihari victims, delivered in ecstatic fits, we are told, must not be taken as models and there is a danger of falling into heresy if there is no guide to save the 'Ravindagan' (travellers or pilgrims of the Path). An extract from the fifth letter in Maktubat-i-Sadi will bear quotation here: "The pilgrim may pass, on the way, through certain spiritual conditions, and the soul may put off the physical garment, catch the reflection of the Divine Light; display superhuman power, as a Divine Agent, during the continuance of that experience, test the relish of 'I am God the Holy', and become proud of having reached the goal but he may not understand this intellectually; and if the soul, during the continuance of these experiences, is not helped by a spiritual teacher, he may, it is feared, lose faith and fall a victim to false notions of unity, incarnation, and identification".

The great Saint of Bihar, in his numerous works, especially his Maktubat and Sharh-i-Adab-ul-Muridin, has written in great details and in a quite lucid language and with convincing arguments, about all the

H. Sharfuddin refers frequently, and not disapprovingly, to those whose utterances cost them their lives. Referring to Khwaja Junaid Baghdadi he says "The expressions which might lead to his execution did not emanate from him and that he was the more acceptable leader of the people of the 'Path' than others. He was a man of 'Sahav' (Sobriety) as distinguished from 'Sukr' (ecstatic condition). Although thousands and thousands of extra sensory things occurred to him he did not give expression to them. H. Junaid supported Hussain Mansur Hallaj because he thought that his utterance, 'Anal Haq', meant that he was nanifestation of the Truth, but he is said to have signed the Fatwa of his execution in 992 A.D. out of regard for the 'Shariat'. He said 'Mansur and I are one and the same, but madness has saved me and reason has ruined him'. H. Sharfuddin considered Mansur as one of those who could not contain the truth that dawned upon people like him. He frequently quotes from the letters and the Tamhidat of Ain-ul-Quzzat-Hamadani, and says that his observations help one in solving many of the difficult problems. But one should discover and comprehend the expressions and the meanings in accordance with the rules and principles laid down by these people, otherwise it is not proper to speak out about certain of their expressions which apparently do not suit the rules of the faith. He was burnt to death for such expressions".

A much more interesting case for us is that of two Bihari counterparts of Mansur, Hamadani, and Abul Fath-Suhrawardi 'Maqtul' a leading light of the 'Ishraqin' or the Illuministic Sufis, who was executed in 1181 A.D. Shaikh Aaz Kakavi and Ahmad Bihari, according to the saintly author of Manaqib-ul-Asfia, went from Bihar to Delhi and were condemned to death by the orders of Firuz Shah Tughlaq at the instance of the orthodox Ulema there for what was considered to be their strange unorthodox mystic utterances about God. The actual words are 'in Diwana sifatan dar asrar sukhnan-i-farakh wa shattha dashtand dar alam-i-diwangi, khalq fahm-i-an na dashtand' (these inspired or infatuated madcaps, in their madness, talked wildly and spoke flashy or meretricious words about mystries of the Divine Unity. People were devoid of the capacity to understand them). The Sultan refers in his 'Futuhat' to "the Chief of a sect which wore the garments of atheism and having thrown off all restraints led men astray. He dwelt in

with those of the Sufi thinkers, who are known as 'Shuhudia'. But in their interpretation of the Wahdat-ul-Wujud they try to make their system conformable to the strictest standard of orthodoxy their doctrine of the identity of the Being, is not necessarily the same as that of the other exponents, and to identify their Sufism with unqualified Pantheism would be unfair and misleading. According to H. Sharfuddin, the traveller in 'Tafrid' (spiritual inwardness of the self) becomes so immeresed in the One as to lose consciousness of all "otherness", but he says that whatever the stage, whether of 'Ilm' (knowledge or gnosticism) or 'Shuhud' (spiritual vision) the salve remains a slave and God is God. The one reality (al-Haqq) or God is the Lord, the many (al-Khalq) or the created being or the phenomenal world are the slaves. A man does not become God. Fana or self effacement and dying-to-oneslf do not imply identity with God, but complete detachment from everything other than God, and a contact with God who alone exists in his eyes. The devotees dies to himself to live in God. There is no question of physical absorption, identification or reappearance and reincarnation. Indeed the Bihari Sufis were all strictly orthodox Sunni Muslims. The Quran and the Sunna (Traditions of the Prophet's words and deeds) were accepted by them as divine rules of faith and practice. They stood for a monothiestic faith, had firm belief in the transcendentality of God who is a personality endowed with qualities, and they recognised evils and sins as positive facts, and held men to be accountable for their deeds or misdeeds on the Judgement Day.

Paradoxical as this attitude may appear to many who can enither understand nor appreciate their stand, one thing should not be ignored that they were more mystic Muslims than dialecticians and philosophers dealing with logical subtleties. Always anxious to find justification of this mysticism in the Quran and the Prophetic Tradition they had to give their interpretatios of such conflicting passages as Ainama kuntum Hawa Maakum (wherever you are God is with you), Howa Khaliqo kullo shaiun (He is the creator of everything). It is difficult to say how far they have been consistent or have been successful in bringing the theory of Absolute Unity of God into harmony with that of duality wherein the creator is not identical with the creation.

behind all plurality, Reality behind the phenomenal multiplicity, of the people belonging to the subjective school who like Ibn-i-Arabi (d. 638=1240) identified the 'Haq' (Truth or Reality) with 'Khalq' (creation) as distinguished from appearance conceiving 'Khalq' in its unity and Ultimate Reality. the Wugudias say "the one reality is "God", "He is all" or "Everything is him" (Hama Ust). They hold that "There is nothing real but God, the only Existence, the Supreme Being or Essence", and they say that the one and the many are only names for tw objective aspects of the One Reality this Reality is "God". the Bihar saints are conscious about wujudiat not completely agreeing with the Islamic concept that God as the creater is transcendental to all that He has created. They also anticipate the views of those who are of the objective (Shuhudiya) school, though H. Sharfuddin does not mention its real founder who was Alauddin Simnani, his senior contemporary (d. 734= 1334) and who affirmed that "Everything is from Him" (Hama as Ust) implying a sort of duality despite the differences of "I" and "thou", for the shadow ('Zil'i.e.the world) can not become the substance (God)

The Firdausia saints of Bihar were fully aware of all the criticisms that were made in the history of Islamic thoughts, and all the objections which were raised against Ibn-i-Arabi and other monistic thinkers who are sometimes confused with pantheistic people. In fact, as against the views of more or less pantheistic (really, monistic) thinkers of Ibn-i-Arabi's school, some Sufis like Alauddin Simnani had advanced the view that just as shadow or 'Zil' is not identical with the substance or 'Dhat', 'Khalq' which is a 'Zil; of 'Haq'and as such does exist cannot be identical with 'Haq'. An urdu poet has beautifully expressed his belief in the theory of Wahdat-us-Shuhud in his line "Na Tha Kuchh To Khuda tha, Kuchh Na Hota to Khuda hota- Duboya Mujhko Hone ne Na Hota Main to Keya Hota" equally well the other theory of Wahadat-ul-Wajud been put by a Persian poet in his famous lines "Man Tu Shudham Tu Man Shudi Man Tan Shudam Tu Jan Shudi_ Ta Kas Nagoyad Bad Azin Man Digaram Tu Digaree"

The greatest of the Firdausia Sufis of Bihar and also others appear to be inclined, on the whole, less towards the views of Ibn-i-Arabi, than towards those of Attar, Rumi and Ain-ul-Quzzat Hamadani, and are 'Wajudia' in their views and these do not correspond

secrets of the Reality and knowlege for his fine and pregnant words about love and friendship and for his multifarious works on 'Tasawwuf'. He points out, we are told further, the secrets of the Divine Unity and knowledge of the One Reality as conceived by the unitarian and men of Truth like Imam Ahmad and Muhammad Ghazzali, Ain-ul-Quzzat, Ibn-i-Arabi, Attar, Iraqi, Rumi and these were expounded by him in India as none had done before. Prior to him very few in India had studied the observations of these great men, and if some had gone through them, they had not realised their real purport and import. Very seldom the Malfuzat of the Indian saints had made mention of the views and sayings of those great men and if they mentioned them they did that in a sarcastic tone. As for instance in Chapter 8 of Siraj-ul-Arifin of Shaikh Nizamuddin Aulia, the latter is said to have remarked that whatever might he said about the child of the Hamadani Qazi as a learned man and as a knower (Arif), he could not attain 'Darweshi' at the age of 20. Ain-ul-Quzzat was also found fault with for having gone beyond the limits of the the canon law in his letters. On the other hand, H. Sharfuddin Maneri, has praised very much the observations of "that self-effacing lover, that inebrieted one with the love of the Eternal God, Qazi-Ainul Quzzat. He has said in Ma´dan-ul-Ma´ni' (chapter 20) that "although every one has written something on knowledge of God, yet few have done so in such a way as to be in accord with the rules and principles of the faith as we find in the Tamhidat of Ainul Quzzat"

About Awarif, the great saint, Makhdum Sharfuddin said that it was a standard work on Tasawwuf but something more and better was expected from its great author. H. Shuaib says that 'Ainul-Quzzat's views were shared by Imam Muhammad Ghazzali (d. 505= 1111) and other great men. He had Ahmad Ghazzali (d. 517=1123) as his spiritual preceptor and died very young in 533 1138 (527 according to Haji Khalfa). His letters which consist of highly speculative comments on esoteric meanings of the Quranic texts and precepts of the Muslim creed have been criticized instead of being commended by many. H. Sharfuddin Maneri and his Balkhi successors seem to have been fully acquainted with all that had been written and said on the characteristic themes of Islamic Sufism by scholastic theologians, philosophers, and the Sufi mystics. They were familiar with the views on 'Tauhid' or Divine Unity, unity

commentary in Persian of his father's Arabic Risala. Hasan's son and successor, Ahmad Langar-i-Darya (d. 891-1486), was an eminent saint, a good scholar and a poet with a small Diwan to his credit. He is more well known because of his very valuable Malfuz, Munis-ul-Qulub, which contains a mine of information about the Bihari Saints of the Firdausia Order. This Malfuz supplements the earliest works such as Manaqib-ul-Asfia, Malfuz of Maulana Amun, and Risalai-Bahram Bihari and it amplifies the references in them and gives additional information of historical and cultural value.

The writings of these Sufi Saints of Bihar, show that they were thoroughly acquainted with the works of master thinkers and theorists, not only of Sufism but those of other sections of the Muslims. Sufistic theosophy had already reached its highest point before its introduction in Bihar in the 13th century. H. Sharfuddin Maneri made use, in his own way, of what his great predecessors had written and said on the subject of Islamic mysticism, and quoted from them, in support of his own contention, arguments of his own. He has frequently made mention of, and given extracts from, the works of such celebrated mystic writers as Khawaja Ziauddin Abun Najib (Adabul-Muridin), Shaikh-us-Shuyukh Shihab-uddin (Awarif), Abu Talib Makki (Quwwat-ul-Qulub), Hujjatul Islam Imam Ghazzali (Ihya-ul-Ulum, Wasaya) Abul Qasim-al-Qushairi (Risala), Qazi-ul-Quzzat Hamadani (Tamhidat, Zubda, Maktubat, etc.). Shaikh Abu Nasar-as-Sarraj (Allama) Mohiuddin Ibn-i-Arabi (Fususul-Hikam and Futuhat-i-Makkia), Abdullah-al-Harith bin Asad-al-Muhasabi Basari (Muhasiba and Ar Riaya), Shaikh Abdul Qadir Jilani (Ghuniat-ul-Talibin) and Futuhul Ghaib), Ali bin Uthmani Jullabi Hujwiri (Kashf-ul-Mahjub). He has drawn copiously upon the classical mystic poems of Maulana Jalaluddin Rumi (Mathnavi), Khawaja Fariduddin Attar (Mantiq-ul-Tair, Asrar Nama, etc.) Iraqi (Lama't) Khawaja Abu Sayeed, Abul Khair (Rubayyat), Thanai, (Hadiqat-ul-Haqiqa) Amir Khusro, Saadi, Khaqani etc. Qazi Hamiduddin Naguri, Siyar ul Arifin, and Tazkirat-ul-Aulia have been also utilized.

The saintly author of Manaqib-ul-Asfia, while dilating on the distinctive position of H. Sharfuddin, his great cousin, rightly gives him credit for his high discourses on the subtleties of the path and the

Ahmed Maneri fell, we should consider here the four really outstanding figures who were all men of great piety and learning, poets and authors. The learned Maulana Muzaffar Shams-Balkhi, who had given up his professional job in Firuz Shah Tughlaq's Arabic College, situated in Khuski-i-Lal, at Delhi, to become the disciple of H. Sharfuddin of Bihar, in preference to his senior cousin, H. Ahmad Chirmposh of Amber, of whom his father, Shamsuddin, had become a 'Murid' and devotee, had a very self-denying and puritanical outlook. He shunned all wordly things, gave away in charity all that came into his hands, including his valued books, used knots instead of needle and thread to mend his torn clothes, tied his 'Izar' or trousers with 'Munj' string, and divorced his wives and himself married them with others whenever he found that his growing affection for them was likely to affect his love and devotion to God. And yet he was on terms of correspondence not only with Shaikhs and Ulemas and common people but also officials, nobles and a king of Bengal, as we find from his voluminous Maktubat containing 181 letters. His Sharh-i-Mashriq-ul-Anwar, a standard work on Tradition, Sharh-i-Aqida-i-Hafizia, and a small Diwan of mystic poems, have been preserved for posterity. Equally learned, but perhaps less rigid and more liberal in outlook was H. Husain Muiz, entitled Nausha-i-Tauhid, his fellow disciple (Mustarshid), nephew, pupil, and constant companion in his frequent journeys to the holy places in Arabia and Aden in which latter place he died in 803 and lies buried. Shaikh Husain's Malfuz, entitled Ganj-i-la Yakhfa, containing the discourses of 57 Majlis, his Maktubat consisting of 154 letters on mystic subjects including one addressed to Ibrahim Shaqi of Jaunpur, a treatise in Arabic named Hazarat-i-Khams (5 different planes of Existence) on the problem of Divine Unity, and his collections of mystic poems, including a Mathanavi entitled Chahar Darwesh, are more generally known, but the Fatuha Khanqah of the Balkhis has some other works also such as Risala-i-Khair-o-Sharr, Qaza-o-Qadar, Risala-i-Muhammadia, Aurad-i-Dah Fasli, Risala-i-Tauhid, and Risala-i-Akhasy-ul-Khas. His mosque and tomb at Paharpur in Bihar Sharif where he died in 844=1440 and lies buried can still be seen. Husain's son Shaikh Hasan Balkhi (d. 855=1451), wrote small tracts such as Risala-i-ma'ni-dhat-Wajh-o-Nafs, Risala-i-Hast, and was the compiler of Lataef-ul-Ma'ni, but his most well known work is Kashif-ul-Asrar, a

the last compilation of Zain, is a short tract containing 20 printed pages. It gives some account of what the great Saint said and did in his last 10 Majlis, shortly before his death, on 6 Shawwal, 782=January, 4, 1381.

The books from the pen of the great Saint which are easily available include such tracts as Irshad-ul-Talibin (also called Burhan-ul-Arifin), Irshad-us-Salikin, Risala-i-Makki, which deal with the seeker of God, unitysm, and spiritual practices of Dhikr and Muraqaba respectively and three sets of 'Aurad', big, middling and small, (prayer exercises). Aqaid-i-Sharafi is also a book of prayer and it also deals with mystic beliefs, and Fawaid-ul Muridin contains religious and moral instructions for the followers. The very title of 'Risala-i-Wujudia' is suggestive of its contents. Fawaid-i-Rukni and Ajwaba-i-Zahidi, though small, are important treaties, the first being written in response to a request for mystic instructions of a pilgrim to Mecca, Haji Ruknuddin Zair-ul-Haramain, and the other, containing replies in simple and easily intelligible language to a set of 40 or more questions of Sufistic import raised by different devotees. 'Isharat-i-Sharafia' which contains 36 short letters of which each sentence is pregnant with deep ideas, is mainly concerned with the Sufistic conception of 'Wahdat-ul-Wujud' or Unity of Being. Six of the letters were addressed to Mirdad, who has probably given his name to a Muhalla which still exists in Bihar Sharif, and four are in the names of "Sahbaz alias Gorakh". Last, but not the least, is what has been taken to be a standard work on Sufism in Bihar. It is a voluminous 'Sharah' or commentary, spread over 453 folios, with 19 lines to a page, on the well-known Arabic treatise, Adab-ul-Muridin, by Shaikh Ziauddin Abun Najib Abdul Qahir Suhrawardi, the uncle of the celebrated Shihabuddin Suhrawardi, who died in 563=1167 and 532=1234-35 respectively. The commentary was begun at the request of Qazi Ashraf in Rabi, I, 765=December, 1363, and finished in Dhilhijja 766=August, 1364. Some marginal notes (Hashia) on this commentary, largely used in Bihar, are from the pen of the 18th century scholar and logician, Qazi Ghulam Yahya of Barh.

Of the Balkhi Saints who traced their direct descent from the famous Sufi, Ibrahim-bin-Adham, and on whom the mantle of the great Saint, H. Sharfuddin

sometimes named as Maktubat-i-Do Sadi. The manuscript copy of the Khuda Bakhsh Library, Patna, contains the additional 40 letters and the compiler's name given in it is "Mohammad Bin Isa-al-Balkhi". There is another copy of this work in the Balkhi Khanqah of Fatuha (Patna district). There is a third collection of letters on Sufistic topics, called 'Maktubat-i-Seh Sadi' and published in Lahore, but the number of letters in it is slightly less than 300, and the first 200 are the same as in the second collection. The additional letters include one addressed to Sultan Muhammad Tughlaq, sent in reply to one of his own. The fourth collection of 28 letters, called 'Maktubat-i-Bist-o-Hasht, has been referred to above. The cataloguer of India Office Library wrongly ascribes two other sets of letters, one to the great saint, and the other to his father which he names 'Maktubat-i-Hazrat Yahya Maneri". The names of the addressees given appear to have had little or no connection with the great Saint of Bihar.

As regards the Malfuzat, Lataif-i-Ma´ni, is really an abridged version of Ma´dan-ul-Ma´ni. A supplement to the latter, Khan-i-Pur-N´mat, compiled by Zain Badr-i-Arabi, contains the discourses delivered between 15 shaban, 749=Nov. 9, 1348, and the end of Shawwal, 751 December 1350. Besides mystic matters, it contains some valuable observation of cultural interest. Ganj-i-La-Yafna and Tuhfa-i-Ghaibi containing the discourses of the years 760=1358 and 770=1368, were compiled by Zain-Badr-i-Arabi. The undated Mukh-ul-Ma´ni, which gives us the discourses of 51 Majlis was compiled by Syed Shihabuddin Halifi. He was the compiler of 'Maghzul-Ma´ni' also which has been divided into 33 (Fasals). The contents of both were checked and verified by the Saint at the request of the compiler. Bahrul-Ma´ni, also called Kanz-ul-Ma´ni, which relates to the period between Sha´ban, 757=July, 1356, and Safar, 760=January, 1358, and Malfuz-us-Safar of 762=1360-61 were compiled by the same Zain-Badr-i-Arabi, while Munis-ul-Muridin, covering the discourses of 21 Majlis from Muharram to Shaban, 775-(June 1372 to January, 1373), was compiled by Salah Makhlis Daud Khani, a devoted disciple of the Saint. Among other things these Malfuzat contain some new points of historical interest which will be considered later. Other less known Malfuzats include Asbab-ul-Najat and Mirat-ul-Muhaqqiqin. The widely used Rahat-ul-Qulub,

persuaded to stay there permanently "Friends", he said, "your association with me has brought me to such a pass as to be installed in this place of idols" It was from about this time that this great saint began to use his pen and paper for solving the mystic problems raised by his inquisitive and religious minded disciples in their letters. Though he had already begun to deliver his oral discourses, these were now compiled in the shape of his Maktubat and M..lfuzat.

The best known, widely used, and the most highly spoken of his works, Maktubat Sadi, is a collection of 100 letters on mystical doctrines and the basic principles of Islam which were addressed mostly to, and at the request of Qazi Shamsuddin, "Hakim-i-Chausa" (near Buxar in Shahabad district). The letters practically cover the chief topics of Sufism and Islam and they were compiled in 747=1346 by Zainuddin Badr-i-Arabi, the chief attendant of the Saint. Aurangzeb, the learned Mughal emperor, had it by his side and Abul Fazl his nephew, Addus Samad, Maulana Abdul Haque, and others took it to be the best of his works and have given extracts from it in their books. They also refer to the earliest collection of the discourses of the Saint entitled 'Madanul-Mani', delivered up to 15 Shaban, 746, December 2, 1346 which were compiled in two volumes by Zain Badr-i-Arabi and were verified and checked by the Saint himself. The language of these discourses or the Malfuzat is a little different from that of the Maktubat and is naturally simpler and suited to the needs and understanding of the questioners in the Majlis or assemblies of the Saint. Not only intricate problems of mystical philosophy and Sufistic doctrines were discussed but Juristic points, ethical principles, and social precepts were explained and taught in those religious assemblies which were attended by people from far and near, high and low. Illustrative anecdotes from past events and copious apt verses of classical mystic poets were also given. Therefore the value of these Malfuzat or collections of sayings and utterances of the Saint is greater for the general reader than for the Sufistic expert. Their number is also greater than that of the Maktubat.

A second collection of 152 letters on similar Sufistic points as the first compiled by the same Zain Badr-i-Arabi, 22 years after, in 769=1328 and addressed to a greater number of people than the first has been

voice of an ostrich threw him in such an ecstatic condition that he flew into the then dense jungle of Behea (Shahabad) and was heard of no more for 12 years. He wandered about in jungles of Shahabad and hills of Rajgir, Monghyr and Morang for about 30 years practising austeristies and leading the life of a religious recluse, like the Hindu Sannayasis, subsisting on what he could get from the hands of Nature and also what came unasked from others. It was in the hills of Rajgir, that he was discovered by Nizam Maula, a disciple of Nizamuddin Aulia, and was requested to pay a visit to Bihar town. After some time the saint volunteered to come on foot every Friday to Bihar Sharif to impart instructions to his admiring devotees.

The weekly visits to Bihar town must have begun in the twenties of the eighth century, for once when Qazi Zahid, a devotee, asked him "who is the man of God in India?", the reply came "He is the same mad (inspired) man of Panipat" Obviously, this refers to H. Sharfuddin Bu Ali Qalandar who was alive till 724 or 1324. Abul Fazal, his nephew, Abdus Samad, and their contemporary, the great Traditionist, Maulana Abdul Haque of Delhi, the author of Akhbar-ul-Akhyar, obviously relied upon a common source which misled them to write that Nizamuddin Aulia had died before the arrival of the great saint of Bihar in Delhi. He has himself referred to his having seen Maulana Ziauddin Simnani who as strictly orthodox Muslim, was always up against 'Sama' and use of music and singing therein, and bitterly criticized H. Nizamuddin Aulia (d. 725) whom he predeceased. "He was both a traditionist and commentator of the Holy Book. One day I attended a "Tadhkir" (religious discourse) delivered by him". This must have happened before 725=1325.

After some time Nizam Maula set up a "Do-Chapra" for the weekly sermons of the great Saints of Bihar out of his Mal-i-Muzakka (legitimately earned money). This was later converted into a residential house, outside the general habitations, which came to be called Safipur. The Saint continued the pactice of descending from the hills of Rajgir, where his 'Chilla' cave still exists, and walking all the way on foot every week to and from Bihar so long as his health permitted it, His aged mother and his only son had already been brought from Manner to Bihar town and he was also at last

special favour. Indeed, God the most High, had Himself favoured this land and the country in that He enabled Shaikh Sharfuddin, the Soldier of God, to stay here. Although Sultan Firuz (Shah Tughlaq) and the people on that side made earnest requests that the reverend Shaikh should write something separatly for, and send the same to them, but he did not give much heed to it and sent nothing which might serve as his memorial with them. On the other hand, very agreeably to his heart, he wrote very often many letters to "Sultan-i-Shaheed" (Sikandar, who died fighting against his own son after a glorious reign of 37 years in 795=1313), and he was very much satisfied and pleased with him, you enjoy the effects of those blessing (Letter 162)." All efforts to search out or even find other clue to these letters which the celebrated 14th century Saint of Bihar wrote to Sultan Sikandar, son of Shamsuddin Haji Ilyas, founder of a new dynasty of Bengal kings bearing his name and also of Hajipur and Samastipur (corruption of Shamsuddinpur) in North Bihar have proved so far to be futile.

Of the large number of works which this great, saintly and scholarly son of Bihar, Hazrat Sharfuddin Yahya Maneri, wrote or caused to be written, only a few not exceeding 30, have come down to us, and all these were written or compiled during about the last five decades of his earthly career. Born at Maner, then a flourishing town in Patna District in 661=1262 he died and was buried in Bihar Sharif in 782=1380. He was a boy in his teens reading Masadir and Miftahul Lughat when he was taken to Sunargaon by his namesake, Maulana Sharfuddin Tawwama, a great sage and savant of Bukhara, then on his way from Delhi to Bengal, under orders of the then sovereign to Delhi. Though he completed his scholastic attainments and became well verned in all the branches of Muslim learning including the mystic philosophy, he did not write any book at Sonargaon. Owing to his excessive devotion to learning and austere spiritual practices, he fell ill, was advised to marry, and had a son born to him whom he took to Maner on the death of his saintly father in 690. He soon left for Delhi in quest of spiritual preceptor, met the renowned saints Nizamuddin Aulia and Sharfuddin Bu Ali Qalandar Panipati, but accepted as his Shaikh, Najibuddin Firdausi who died in 691=1291, a few days after handing over to him his written instructions. On the way back to his home with his elder brother Jaliluddin, the

"not to show his letters on any account to others" and says "I too did not bring out the letters of my Shaikh (Sharfuddin Maneri). You will cause annoyance to me if any one sees my letters", and he gives the reason "the volatile and conventional people will not comprehend the discourses of this poor man". Hundreds of letters which H. Sharfuddin Maneri wrote to his greatest disciple and successor, Maulana Muzaffar, during the course of a quarter of a century were buried, according to his will, with him, and only 28 of them which fortunately escaped the notice of his successor were found later and published under the name of "Muktubat-i-Bist-o-Hasht". There are a few such letters also in the Maktubat of the Maulana.

The injunction not to make the abstruse dissertations generally known to the public, especially on God, creation, soul, will or determination and predestination, etc. had an unfortunate result in that even other things which might have been valuable for a student of history were tied up in manuscripts and kept out from the public till they were lost for ever.

A sure indication of the loss of such precious records is available in what we find in one of the 10 long letters which the scholarly Balkhi saint, Maulana Muzaffar Shams, wrote in reply to that of Sultan Ghayathuddin 'Azam Shah of Bengal "I pour out these mystic things unto you so that what is hidden (Batin) may be open to you. It behoves you not to show my letters to any one. Every time that you peruse my words you will get new meaning and fresh enlightenment...one or two expeditions that you, my son, have on hands, on account of this land of external appearance (Mulki-i-Zahir) are indeed, in the cause of Islam, and all the Musalmans including me, the poor Darwesh, are with you. Separation or distance does not count. You should acquaint me with the success you achieve in any momentous business. you should overthrow heresy and innovations not sanctioned by the canon law; and you should enforce the command in regard to the "Zakat" (a portion of a Muslim's property given in charity agreeably to the Quranic rules)...Surely God the Most High has endowed you with these virtues (fear of God, piety, humility, and well-wishing for God's creations)...I, the slave of God, had always noticed how Shaikh-ul-Islam Sharf-ul-Haq waddin, may God sanctify his grave! had held this land (Bengal) in

was not visited by the celebrities of the times and which did not become the home of the saints of the Suhrawardia Order. Many of them have gone under the dust there, while the descendants and followers of other eminent saints are still alive."

Though some of the great saints of Bihar, specially of the Chishti order, were a gift of Bengal, and the greatest of the Bihar saints completed his education at Sonargaon in Bengal, as has been referred to above, Bengal appears to have forgotten about most of its Muslim saints, their religious activities, works and contributions and even their names. But things are a little different in Bihar. The 'Urs' or death anniversaries of most of the saints still attract a large mass of people and some contemporary works by and about the Firdausia and Shutaria saints are still available. The name of H. Sharfuddin Maneri is a household word in Bihar and of his numerous works and those of his Balkhi successors, some have been printed, while others, though still in manuscript are well worth publication. Much has been written about his family life, education, austerities, piety, learning and works and one of the best and largely used work on the subject, Sirat-us-Sharaf, is in Urdu. It would suffice to refer here to the earliest biographical notices of Sharfuddin. One is Tahqiqat-ul-Ma´ni, better known as the Matlub-ul-Mubarak, a Malfuz of Maulana Amun, one of his disciples who died two years after him, in 784_1382. A small 'Risala' is ascribed, to another disciple, Bahram Bihari. Manaqib-ul-Asfia, by Makhdum Shaikh Shuaib of Shaikhpura (Monghyr) the yongest cousin and disciple of the great saint is a very valuable work and one of the earliest sources for the history of the Firdausia saints of Bihar and elsewhere. It was written sometimes between Taimur's invasion in 1399 (for we are told in it about "the Mughals coming and sacking Delhi") and the death of H. Hussain Muiz Balkhi, in 844=1496 as the author prays for his long life ("Mattaallah-ul-Muminina Be-Tule Baqa, ehi" i.e. May God allow the believers the benefit of his long life.)

The saintly authors did not write anything about themselves sometimes they did not like their mystical writings to be in the hands of all and sundry. H. Muzaffar Shams Balkhi (d. 803=1400) strongly enjoined upon one of his addressees, Qazi Zainuddin (L. 127)

that we shall devote ourselves in this second lecture.

Many of the early Sufis of eastern India were not only devotees of God and men of piety and austere habits and practices but were also learned and scholarly people. Unfortunately many of their works have been lost owing to the ravages of times & climates, fire and disturbance and neglect and distractions of their owners, specially in recent times of shifting population.

Bihar and Bengal had such a long series and such a galaxy of Sufi mystics of the various orders that they may claim to be regarded as the home of Indian Sufism. The two provinces were bound by the closest of ties not only political, but also religious, cultural and ideological. Unfortunately, much that could dispel the mist of ignorance clouding our knowledge of those who worked for their faith in Bengal where "the Muslim missionaries achieved the greatest success as far as number is concerned" is no longer within our reach. But for some stray references and only two or three works, still locked up in manuscripts, of the Pandua saints, and some inscriptions mentioning their names, we might not have known anything about even some well known saints of Bengal.

H. Ashraf Jahangir Simnani of Kachaucha (Faizabad district in U.P.) a disciple, of the well known saint of Pandua, H. Alaul Haque (d. 786-1384) while exhorting Sultan Ibrahim, the greatest of the Sharqi kings of Jaunpur to respond to the appeal of his 'Pir Bhai (fellow-disciple), H. Nur Qutub Alam (d. 808-1405) for help against Raja Kans or Ganesh writes in his Maktubat "God be praised! What an admirable dominion is this of Bengal where several saints came from different directions and settled down! Deogaon, for example is the resting place of as many as 70 of the faithful disciples of Shaikh-us-Shuyukh, Shihabuddin Suhrawardi. In Mahsum also there are many Suharwardia saints. Deotala has many saints of the Jalalia Order. In Narkoti some of the best followers of Shaikh-us-Shuyukh including Ahmad Damishqi are lying buried. Sharfuddin Tawwama whose pupil was reverend Sharfuddin Maneri is having his eternal rest at Sonargaon. The father of H. Badr-i-Alam Zahidi (of the Choti Dargah in Bihar town) also flourished there. In short, in the dominion of Bengal there is hardly a city, town or village which

special importance in Bihar, it deserves a separate notice in the second lecture.

II

From the first lecture which besides some general observations on the subject of Islamic Mysticism contained a brief account of the advent and progress of Islamic Sufism in Bihar of the early medieval period, it may have been realised that of the 14 Orders of Khanwadahs those of the highest repute were represented in Bihar, and each had a share in the general spread and development of Islam in different parts of the province. There was no difference in the cardinal principles and tenets of the various orders and there was no bar to people of one Order getting 'permission' (Ijazat) and 'initiation' (Bai' at) from the saints of the other orders. They differed from one another in name, sometimes in respect of garb or dress, and mostly about the rules and methods of meditation (Fikr) recitation (Zikr) and their attitude towards Dhikr audition (Sama) and vocal music. The Shuttaria called Madhhab or Mashrab (mode or conduct) rather than an order (Khanwadah) were closely connected with the Firdausia and Suharwardia, but unlike them and the Chishtia, and like the Naqshbandia, and even the Qadria, they rejected Sama, Music and Singing. The Shutaria and also the Madaria and Qalandria which at one time occupied an important position in Bihar have now sunk into the background. The Naqshbandia did not attain any vogue in early times in Bihar. The oldest and the most widely-dispersed were the orders of the Suharwardia and the Chistia, and though they still hold the field like the Qadria in many parts, they were all eclipsed by the Firduausia order. In fact, owing to the towering personalities of H. Sharfuddin Yahya Maneri and of his immediate successors, the Balkhi saints, the Firdausia order has always held a position of special prominence in Bihar. The saints of this 'Silsila' which was an offshoot of the great Suhrawardia order constantly added to its strength, and what is more important, fortunately for us, they have left behind a considerable literatue in the form of Maktubat, Malfuzat, Isharat, Aurads, and other mystical tracts from which we can form some idea of their beliefs, preachings and outlook, and also get something that is of cultural and historical value. It is to their lives and works and their exposition of Sufistic doctrines

saying of the saint, who disliked publicity and preferred selfless work in silence. He would not allow his followers to become ease-loving and decided to shift to another place for preaching his faith among the wild tribes. To the simple minded head "Gawala" who had become a convert and was named Sadiq and who had expressed surprise at this move, the saint said "Namana jayyo inhan na rahna". (I dont wish to stay here I must go) This is not the only authentic, nor the earliest specimen of Hindustani in Bihar, as we shall see in the third lecture, but the significant and characteristically Bihari pronunciation of 'Inhan' for "Yahan" and "Jayyo" can not but attract one's notice. A grandson of this Qadri saint, the author of Fatawa-i-Masudia had allowed himself to be appointed Mufti of Bihar under Akbar as is evident from a Sanad bearing the seal, among others of Qazi Yaqub, the 'Sadr' An important Qadri saint of Hajipur, Bihar, was Mulla Khwaja Bihari a disciple of celebrated Lahori saint, Miyan Mir, the spiritual guide of Prince Dara Shikoh (d. 1045). He predicted the future greatness and Vizirship of the famous Sa´dullah Khan, the Prime Minister of Shajahan. Another great but later Qadri saint of all-Bihar importance was Diwan Syed Muhammad Jafar Binodpuri of Barh whose father was also a saintly personage. The Diwan died 1106=1694 and has left behind some works.

The Madaria Order was also strong in Bihar at one time. Perhaps the greatest of the four disciples of H. Badiuddin Madar, sometime a teacher of H. Husain Muiz Balkhi at Zafarabad, Jaunpur, whose mausoleum at Makanpur is still an object of veneration of both Hindus and Muslims, was the extremely pious and ascetic personage H. Jamaluddin Hurmuzi known as Jaman Jati (Yati). He lies buried at Hilsa, within a domed mausoleum built in 950=1543 by Jaman Madari of Darbhanga. Shah Kangan Diwana who lies buried in Bihar Sharif was also a disciple of H. Shah Badiuddin Madar of Makanpur. The Madaria Qalandars who performed their devotion every year in a peculiar Indian way by walking on fire have disappeared. H. Abdul Quddus Gangohi of the 15th century writes about his 'Pir', H. Abdul Haque of Rudauli that the latter met some 'Majdhubans' in Bihar while he was on his way to and from Pandua, Bengal. Such distracted bare-bodied religious zealots, often referred to in early literature are not found now. As regards the Firdausia Order, in view of its

Bihar (town), Saran, Purnea etc. Among the most important and direct disciples in Bihar of H. Diwan Abdur Rashid were Maulana Syed Muhammad Jafar of Shariatabad (Patna), Mir Syed Nur of Patna, Maulana Shaikh Abdus Shakur of Maner (d. 1095), Mulla Shaikh Muinuddin of Maner, Maulana Shaikh Muhammad Naseeb of Maner, Shaikh Ismail of Siwan (Saran), & Mir Syed Sa'dullah alias Mir Madari of Tajpur, Saran.

As regards the Qadria order, which was introduced in Bihar in comparatively later times, but is now very strong with its chief centre at Phulwari Sharif notable saints, were Shaikh Manjhan Kunjnashin who lies buried in mahalla Sakunat of Bihar Sharif and H Qumais of Sadhaura where 'Takia' is situated within the fort area of the town. He was a contemporary of Akbar. He died in Bihar on his way from Bengal to his native place, Sadhaura where his dead body was carried to be buried. But the first important personage of whom we have a contemporary account by one of his Meccan companions, Ali Sher, who lies buried at Kutumba in Aurangabad subdivision of Gaya, was Syed Muhammad of Amjhar (Gaya District), a direct descendant of the celebrated Abdul Qadir Jilani (d. 561=1166). We learn from Manaqib-i-Muhammadi of Ali Sher that a Muslim missionary, named Shaikh Muhammad Ali, who was working for his faith in the wild tracts bordering on Chotanagpur division, ruled over by the Kols, was oppressed and his brother and whole family were killed by the fanatical natives on the orders of Jiwan, the Kol Chief. Shaikh Ali's frantic appeals for help to the then powerful Governor of Bihar, Darya Khan Nuhani, evoked no response. He went to Mecca where his pathetic story made an impression on Syed Muhammad Qadri of Baghdad, and Kolanh and Domra in Aurangabad subdivision of Gaya have been mentioned as the places where the self-imposed work of preaching had resulted in a calamity. The saint came with a number of followers from the west via Multan and Surharpur in U.P., in 846-47, (1442-43) met Jiwan and asked him in vain to allow the work of peaceful propaganda. Excessive rain caused the demolition of the part of the mud-fort of the Kol Chief who was killed and his brother, Karmun, and son, Chandra, also met with their death in a miraculous manner. Hearing of the Qadri saint and of the gathering of large number of people around him, Darya Khan ordered a Kushk or villa to be built for him at a place which came to be known as 'Narahna' from the Hindi

and successor of Alaul Haque. He was sent to Bihar along with 3 others, including Shah Sa'adat of Benolia in Bihar Sharif and H. Ataullah Baghdadi, a descendant of the founder of the Qadri order, who lies buried in Mariam Tola, Biharsharif, and whose 'Silsila' is still functioning in Bihar. Sixth in direct line from Farid Tawaila Bukhsh was Diwan Abdul Wahhab (d. 1096=1684), of Choti Takia, a learned and saintly personage, who converted a large number of people of what came to be known as Barahgawan. The tomb of Shah Jalal Ganj-i-Rawan is situated on Takia-i-Kalan, Biharsharif. Another branch of this Chishti Silsila was represented by the saints of Daira or Barahdari. The Chishti saints of Ashrafia Khanqah of Beetho (Gaya), founded by Syed Abu Sayeed Kathanawaz, also were linked with Akhi Siraj and Alaul Haque of Pandua, Bengal, through the latter's disciple, H. Ashraf Jahangir Simnani of Kachhauchha (Faizabad, U.P).

There was a strong link connecting the Chishtis of Bihar with those of Jaunpur. Only a few instances will do. Abdul Malik of Ushri, Saran, (d. 911=1505) the father-in-law of M. Syed Hasan, the ancestor of Pir Damaria saints of the Suhrawardia order, already referred to, was the spiritual disciple of H. Muhammad Isa Taj Siddiqui of Jaunpur (d. 911) who had settled there ever since Delhi was invaded by Timur the Lame. Qutbuddin Binadil of Jaunpur (d. 925=1518), was not only the spiritual guide and father-in-law of H. Fazlullah Gosain of Daira, Bihar town, but the inspirer of a large number of the Chishtia, Qalandria, Madaria, and Qadria saints of Bihar. Khwaja Zainul Abedin, alias Syed Zahid Sarani, the father-in-law of the celebrated Qazin Ola Shuttari of Bania Basarh, and the author of Khazana-i-Zahidi, a commentary on Tafsir-ul-Ahkam of Malik-ul-Ulama Shihabuddin Daulatabadi of Jaunpur (d. 848=1444), was also a Chishti. Shah Hafiz, a Chishti saint of Saran, and the spiritual guide of Shah Daulat of Maner (d. 1017=1608), was the disciple of Miyan Abdullah, son and successor of the well known Jaunpur Saint, Khawaja Jalalul Haque Qazi Khan Yusuf Nasihi of Zafarabad (d. 944=1537), who was courted by both Humayun and Sher Shah. Shaikh Mustafa Jamal-ul-Haque (d. 990=1582), the father of the celebrated Diwan Abdur Rashid Chishti of Jaunpur (d. 1083=1672), died and lies buried in Purnea. The Rashidia Chishtia Silsila which produced many eminently pious and intellectual people in Bihar and U.P. still continues, specially in Maner,

Makhdum Sultan Hussain who died in 815=1412.

There was a very close connection between the Chishti saints of Pandua, Bengal, and those of Bihar. Abdul Fattah Chishti, the founder of Qazitola in Dinapur (b. 887=1482, d. 993=1527), seventh in direct descent from Syed Mubarak Rizvi, came with his cousin, Mir Ali Sher, from Jajnair to Bihar in the time of the Khaljis. Ali Sher died fighting with the natives and he lies buried in Bihar town, but Syed Mubarak went to Bengal, became a disciple of Akhi Sirajuddin Uthman of Gaur (d. 743=1342), a disciple of the celebrated Nizamuddin Aulia of Delhi, and returned to Dinapur, where he built a mosque and a Khanqah at a place where his 'Pir' had once stayed. He was followed by a long line of saints many of whom worked as Qazis till the end of the 17th century.

Akhi Siraj had taken from Bihar Syed Ibrahim, the young son of Jamal Aulia, a first cousin of Nizamuddin Aulia, and had him married with the sister of the wife of his famous disciple and successor, Shaikh Alaul Haque of Pandua (d. 786=1384), both being sisters of the Bihar saint of Choti Dargah, named H. Badr-i-Alam Badr Zahidi. Pir Badr-i-Alam of Junaidia order (d. 844=1440) was the great grandson of Shaikh Fakhruddin Zahid (d. 704=1304) and the grandson of Shaikh Shihabuddin Haqqo who was killed by the orders of Muhammad Tughlaq for denying the justification of the title of Sultan-i-Adl assumed by him. Being invited by H. Sharafuddin Maneri he left Merath for Bihar where he arrived after the death of the great Maneri Saint in 782-1380. His descendants through the daughter of a Rajput chief are to be found in Bihar Sharif, Soh, Chawki in Saran district and other places in the Bihar province. He is said to have married another lady of the ruling family of Jaunpur. He is also famous in Bengal, specially among the class, whom he converted to Islam during the course of his travels in East Bengal and Chittagong, the name is invariably invoked by those in Bengal who ply their boats on the water there. One of the most reverenced saints of Bihar, H. Fariduddin Tawaila Bukhsh Chishti (d. 897=1491), of Chandpura which has a mosque containing an inscription, dated 710, was the son of Syed Ibrahim Chishti referred to above. He was brought up at Pandua and, after practising severe austerities, became a disciple of the famous Nur Qutb Alam of Pandua (d. 818=1415), the son

Ahmad and the latter's sister's son, Syed Muhammad, called Mamoon Bhanja, died as martyrs for the faith at Jaruha, near Hajipur, where their mausoleum, damaged in the earthquake of 1934, was built, it is said, at the instance of Shiva Singh, the Hindu Rajah of Simraon in Tirhut. The mother of Naseeb (Nusrat) Shah of Bengal caused the water of 'Zamzam', the holy spring of Mecca, to be brought and thrown into the well adjoining this mausoleum to sanctify its water. Raja Man Singh Kachwaha, when Govrenor of Bihar, granted, in 999=1590, 15 Bighas of land for the upkeep of the mausoleum, and the facsimili of the bilingual 'Sanad' which refers to the "Sanads granted by the previous rulers" and their verification by the deceased Sadr, Qazi Yaqub, (son-in-law of Qazi Fazilat of Sher Shah's time) has been already published in Bengal Past and Present Calcutta 1. Traces and evidences are available of many others of 14th century who lost their lives while preaching their faith, such as Ali Sher of Bihar. Sheikh Fattu and Shaikh Burhan of Salimabad Pargana who lie buried in village Bargazer in South Bihar. Chandan Shahid, Shah Budhan and Shah Shamsul Haque of Sasaram also belonged to the Chistia order.

Only a few of the very large number of early Chishti saints of Bihar can be mentioned here. The earlier were Shah Mahmud Bihari and Syed Tajuddin of Dinapur, the disciples of Qutbuddin Bakhtiyar Kaki (d. 633=1233), Maulana Ali Bihari, a disciple of Baba Farid Shakarganj (d. 664=1265). Makhdum Adam Sufi (d. 697=1297), son of Syed Ibrahim Chishti of later Hajipur (d. 657=1258), and his son M. Hamiduddin (d. 736=1329), a son-in-law of Shihabuddin Pirjagjot of Jethuli (derived from 'Ji-uthli').Makhdum Hamiduddin Chishti's son, Taimullah Sufaid Baz (d. 790=1388), was the spiritual guide of his son Faizullah of Kurji, near Dinapur (d. 831=1427), of Shamsuddin alias Shah Saman of Arval (Gaya), and of Sufi Ziauddin of chand-haus (d. 821=1418), a direct descendant of the celebrated Qutbuddin Munawwar (d. 760=1358), and Jamal Hanswi (d. 670=1271), the grandson of Baba Farid Shakarganj. Taimullah Sufaid Baz was married in Mahalla 'Chistiana' of Biharsharif which was adjacent to 'Bhainsasur' where lie buried a large number of Chishti Saints including Ahmad Isa Taj, the younger brother of the celebrated Chishti saint, Muhammad Isa Taj of Jaunpur, a son-in-law of Syed Jalal Bukhari Makhdum Jahanian. An important Chishti saint of Darbhanga was

his cousin (son of mother's sister). H. Ahmad Sharafuddin Yahya Maneri.The author of the rare History, Sirat-i-Firuz Shahi, gives a detailed account of the interview between the Sultan of Delhi and H. Ahmad Chirmposh. Besides those already mentioned, there were other saints of Suhrawardi order who did much for the faith, had a great following in their times, and still command the respect of large sections of the Muslim population of Bihar. It would suffice to mention here only two outstanding personalities of the 17th century. One was the Pushto-speaking Diwan Shah Arzan (d. 1028=1618) of Patna who with Shaikh Hussain of Lahore received the Khirqah (religious robe) and Irshad (spiritual direction) from Shaikh Bahlol Qadri, of Punjab but became a disciple of Shaikh Abu Turab Madani Suhrawardi, on the occasion of his pilgrimage to Mecca. He used to practise austerities in solitary deserted places during day times and night engaged himself in carrying water to the mosques of the town. He is said to have been approached for his blessings by Prince Khurram Shahjahan when he visited Patna and was a state of revolt against his father. He was succeeded by Shah Shujawal who was buried near him in Patna. The other was Maulana Muhammad Shabbaz (d. 1077=1666), a great traditionist and a founder of the long-continued Madrasa or College of Mulna Chak, Bhagalpur, and the spiritual disciple of Maulana Yasin Suhrawardi who lies buried in Biharsharif besides the road to Daira. The mausoleum of H. Mir Syed Muhammad Kan M. Bada Badesustani and the tomb of his sister's son, Shah Husain in Kaghzi muhalla are still objects of veneration in Biharsharif, but their "Silsila" has become extinct. Makhdum Bade Sustani was one of the greatest saints of Bihar and the celebrated 14th century saint, H. Sharfuddin paid annual visits to his Kauza for 12 years to offer Fatiha.

More numerous, and among the earliest to come to Bihar, were the Muslim preachers of the Chishtia Order. A precursor of the great pioneer of the Chishti order of Sufis, the oldest Darwesh order in India, Khawaja Muinuddin of Ajmer (d. 627=1230), was Syed Husain Khingsawar who, according to the author of Akhbar-ul-Asfia and Mirat-ul-Asrar, was appointed Governor of Ajmer but was killed in 610=1213, the year of the death of Qutbuddin Aibak, and lies buried at Tara hill, there. Local traditions, supported by later documents, say that two of Khingawar's nearest relations, Syed

eighth in direct descent from Imam Taj Faqih through Shah Khaliluddin, a son of Shah Yahya Maneri, and called Choti Dargah, has always been held in great veneration and was visited, among others, by princes and kings including Sultan Sikandar Lodi and Babar. Khwaja Abdus Samad the sister's son of Abul Fazl and Faizi, in his rare work, Akhbarul Asfia, writes "Shaikh Yahya bin Israil, the author of Siraj-ul-Majd, was one of the great personalities of his time. His grandfather (Imam Taj Faqih) came from the holy place of Khalil (Jerusalem) to Maner where he fixed up the standard of Islam and then went back to his home. Shaikh Yahya received spiritual inspiration (indirectly) from Shaikh Shihabuddin Suhrawardi and Shaikh Najmuddin Firdausi (Kubra). Although he was a product of the Indian realm, yet in this very country he traversed the world of reality with his bold steps and stuck to the right path laid down by his predecessors. He perfected his spiritual experiences at Maner where he found his final resting place on 12 Sha'ban 690 = 11 August 1291. Although he had reached a very advanced age and his physical strength had declined, yet for fulfilling the spiritual inspiration of God's creations he continued to seek help from the sacred teachings of the holy personages of his times" The statement of this 16th century biographer of saints that Yahya Maneri met H. Sharafuddin of Panipat (d 724=1324) and named his eldest and greatest son after him may or may not be true, but he was certainly misinformed to say that the former was a contemporary of Muhammad Tughlaq. He has himself given the correct date of Yahya's death as A.H. 690.

Next in importance was H. Ahmad Chirmposh, the Saint of Amber the spiritual disciple of Shaikh Alauddin Chirmposh of Puraini (Bhagalpur) who was linked through Shaikh Sulaiman of Mahsun to the famous Maulana Taqiuddin Suhrawardi of Mahsun referred to above. He, according to Mr. Oldham, who writes on the authority of a manuscript by Mir Amanullah of Aurangzeb's time, was the spiritual guide of the founder of Ghazipur the warrior-saint Syed Masud, entitled Malik-us-Saadat-i-Ghazi, the father of Syed Rajah, after whom Sarai Syed Rajah was named. The 17th century Shuttari Saint, Pir Ruknuddin of Jandaha (Muzaffarpur district), tells us how Firuz Shah Tughlaq, on the occasion of his expedition to Bengal, came to Bihar town, paid a visit to Ahmad Chirmposh and

short distance to the east of the old Patna City. He belonged to the Suhrawardia order but we donot know about his initiation and investiture. Of his 4 saintly daughters, one was married to H. Yahya Maneri, father of H. Sharafuddin, his 3 brothers and another to Musa Hamadani, the father of the celebrated Suharwardia Saint of Bihar, H. Ahmad Chirmposh (d. 775=1373) of Amber, the disciple of Maulana Alauddin Chirmposh of Puraini (Bhagalpur district) who was himself the disciple of Maulana Sulaiman Suharwardi of Mahsun (now in Bengal). Pir Jagjot's daughter who was married to Sulaiman Langar Zamin gave birth to the famous female saint, Bibi Kamal, the mother of another important Suhrawardi saint, H. Husain Gharib Dhukkarposh of Tajpur, Purnea. He died on 10 Safar, 892=October 1490. The fourth daughter was married to Syed Hamid Sufi, son of Adam Sufi and father of Taimullah Sufaidbaz who is buried at Bihar Sharif.

The famous Suhrawardi saint, Shaikh Jalal Tabrizi, one of the chief disciples of Shihabuddin Suhrawardi, also came to Bihar via Delhi and Badaun and from here went to Bengal where his 'Chillakhanas' are still found. Bihar also felt the influence of the Suhrawardi order through the activities of the followers of Syed Jalal Bukhari Makhdum Jahanian (d. 785=1383) and of still earlier, the celebrated H. Bahauddin Zakaria Multani. Makhdum Syed Hasan, a contemporary of Humayun and Sher Shah, after whom Hasanpura in Saran district is named, and his sons and grandsons, Syed Ahmad of Hajipur, Syed Muhammad of Mansurganj, Patna and Syed Husain of Bhagalpur all called 'Pir Damaria' were Suharwardia saints and were linked in the chain of spiritual discipleship to Makhdum Jahanian. Maulana Ahmad Damishqi, one of the 'Khalifas' of Bahauddin Zakaria Multani was the spiritual guide of Maulana Taqiuddin Suhrawardi of Mahsum in Bengal. The last mentioned personage was the author of Multaqat, which is an abridged version of 'Ihya-ul-ulum' of the celebrated Imam Ghazzali, and he was the inspirer of many Suhrawardi saints of Bihar including M. Yahya Maneri, the father of the renowned Makhdum Sharafuddin, the greatest Muslim saint that Bihar produced.

The tomb of Makhdum Yahya Maneri is called Barhi Dargah at Maner, as distinguished from the magnificent mausoleum of Shaikh Bayazid, known as Shah Daulat;

emperor Humayun when the latter was in a state of war with Sher Shah. The fame of Shaikh Qazin, the author of Ma'dan-ul-Asrar, and of his youngest son, Abul Fath, spread far and wide through their chief disciple, Shaikh Zahur Haji Hamid Huzur (b. 835=1431) of Ratansarai in Saran. He was the spiritual guide of the two famous brothers, Shaikh Phool (murdered by Prince Hindal) and the renowned Muhammad Ghaus of Gwalior who died in A.H. 970 and has been mentioned by Babar and Abul Fazl etc. The last was the Murshid of the scholarly and saintly Shaikh Wajihuddin Gujarati Ahmadabad. Thus the influence of Shaikh Qazin Ola travelled beyond Bihar to UP., Gujarat, M.P. and also to the Punjab. Among the other most notable and representative saints of the Shuttari Order of Bihar, mention may be made of Shah Ali, the son of Makhdum Owais Shahid, and the founder of Jandaha, his son, Shah Alauddin, and the latter's great grandson Ruknuddin Abdul Bari (d. 1117=1705). Syed Ali Manjhan Danishmand Rajgiri, the son-in-law of Shaikh Qazin of Bania Basarh, his son, Mir Shihabuddin (d. 985=1575), and the latter's famous descendants, Maulana Syed Mansur Mahaddith Sufi alias Mir Syed Jiw, the founder of the Rajgir Madrasa, and his brother's son, the celebrated Pir Syed Imamuddin, the author of many works, including Manahij-us-Shuttar (finished on 1 Rajab 1115=1793) were other representative saints of this Order. Makhdoom Shaikh Mangan and M. Shaikh Taj who lie buried in Maharagghat, Patna City, near mosque of Aurangzeb's time also belonged to the Shuttari order and were the disciples of H. Abul Fath Hadit-ullah Sarmarst of Tankd.

More important than the Shuttaria were the orders of the Suharwardia and Firdausia, specially in South Bihar, the most celebrated and the earliest personalities whereof were the descendants of, or connected with, the family of Imam Taj Faqih. His eldest son, Israil, and youngest, Abdul Aziz, and the former's son, Makhdum Yahya Maneri, and the latter's two sons, Jalal Maneri and Sulaiman Langar Zamin Kakavi, were all Suhrawardia saints. The father-in-law of M. Yahya Maneri and Sulaiman Kakavi, was Shihabuddin Pir Jagjot, a former Qazi of Kashghar who came to preach the faith in Bihar, settled down and died at Jethuli, on 21 Zilhijja, 664=15 September 1266, in the time of Balban, and was buried at what is still known as Kachchi Dargah, on the bank of the Ganges, at a

Ismail, and Abdul Aziz, to carry on the work of the faith in both south and north Bihar. They did not bother themselves about the conquered area and its administration which is said to have been handed over to the Turks led by Muhammad-bin-Bakhtiyar and his followers for, as members of the great Suharwardi order they were the missionaries of the faith and their work lay in spiritual and educational spheres. Excepting Ismail, the second son of Imam Taj Faqih, who was sent across the Ganges to North Bihar, and his son Salahuddin and grandson, Sulaiman who were opposed by, and had to fight against the Hindus, there is nothing on record or even preserved by local traditions that the descendants of the Imam had anything to do with active politics. According to the Bayaz of Mulla Taçia of Akbar's time and Futuhat-i-Asfia, written in 1071 = 1660 only a few extracts whereof, relating to Tirhut, were copied out by the late Maulavi Ilyas of Darbhanga before the rare manuscript was destroyed in the great earthquake of 1934, Ismail lived upto the time of Alauddin Khalji and fought thrice with the Raja of Tirhut and was eventually victorious. Perhaps Mulla Taqia really meant Ali Mardan Khalji who is said to have murdered Bakhtiyar after the latter's return from his unsuccessful expedition north of Assam and succeeded him for a time. Seventh in direct descent from Ismail was the celebrated 15th century saint of Bania Basarh near Vaishali, named Shaikh Muhammad Faizullah Qazin bin Ola Shutari (d. 901=1495), the greatest disciple of Shaikh Abdullah Shutari of Mandu (d. 890=1485), the pioneer of the Shutari order in India. The Saint of Mandu was fifth in direct line from Shaikh-us-Shayukh Shihabuddin Suhrawardi.

Qazin bin Ola was the progenitor of a long line of saints of the Shuttari order. Of the three sons of Shaikh Qazin, Makhdum Owais Shahid, according to the Nasab-i-Nama-i-Maner, died at the hands of a Chero chief attempting to build a mosque at Bania Basarh where he is buried. The tomb of Shaikh Abdul Rahman, the second son, is situated in Mahalla Thrayyaganj of Muzaffarpur town, and Abul Fath Hidayatullah Sarmast, the third son worked and died at Tankol on the bank of Gandak at Hajipur. The Tankol saint (b. 882 = 1477, d. 946 = 1539) was observing his 'Tai' (continuous) fast at the age of 14 when Sultan Husain, the exiled Sharqi king of Jaunpur, paid a visit to his revered father, and he himself received the visit and devotion of

of Islam, was a great theologian of Jerusalem and the ancestor and fore-runner of a long line of the Suhrawardia, Shattaria and Firdausia mystic saints and missionaries of Bihar. He is said to have been induced to come in response to a call for help from an oppressed Muslim missionary, Momin Arif, and he established himself at Maner in 576 = 1180 A.D. as is evident from a Qita-e Tarikh or Chronogram found in some printed books, including Wasilat-us-Sharaf Zaria-i-Daulat etc. It says "when he became victorious over the Raja of Maniar, the Imam created a new world by his justice. It has come down from the ancestors of the past;that year the faith of Muhammad was strengthened". "Din-i-Muhammad Shud Qavi" is the chronogram which yields the year 576. The 'Kursinama' or the genealogical table of Maner saints contains a list of the companions of the Imam including Tajuddin Khandagah, Ali Turk Larbak, and Qutb Salar, the standard bearer and the general of the Imam's party, who died fighting for the faith. The general's tomb is still pointed out at the neighbouring village, Mehdavan. There is a stone still preserved in the stone-and-brick structure called 'Rawaq' which is known as 'Takia' for the Imam is said to have sat leaning against it and washed his sword. The whole of the Dargah area is covered by what must definitely have been the mud fort of the ancient Hindu kings. Very large bricks and the polished stone chips of the Mauryan age called N.B.P. and other relics have been found there. The name of the Hindu chief who is said to have been overthrown by the Imam's party has not been preserved, but Tradition says that a Hindu place of worship was situated where the Barhi Dargah containing the tombs of Makhdum Shah Yahya Maneri, a grandson of Imam Taj Faqih now stands, and that the Muslim zealots demolished every thing except a colossal stone lion standing over a small elephant which lay there and which can still be seen in a mutilated form. It is significant that an exactly similar stone statue bearing no inscriptien, but obviously of ancient Hindu workmanship, which presumably once adorned the gate-way of the old Hindu temple erected by the Gaharwala of Kannauj is still found intact on the roadway to the south of the massive stone bridge built by Akbar's general, Mun'im Khan-i-Khanan, in 1564, at Jaunpur.

The Imam is reported to have gone back to Jerusalem leaving behind his three sons, Israel,

monasteries of Udantapuri and Vikramshila is significant only because it refers to the Muslim settlers and those who helped Bakhtiyar Khalji. More reliable would have been the evidence of the Nepalese Buddhist monk Chag Lo-Tsa-ba or Dharmaswamin (7) who started for Magadh via Tirhut (Patala) in 1234 and studied at Rajgir and Nalanda for about 3 years showing that though largely deserted and damaged, scholastic institutions and activities still continued in 1236-37 there; but he does not, unfortunately, say anything about the activities of the Muslims in the time of Bakhtiyar or prior to it.

There is some historical evidence, however, about the Ghaznavids having led their raids upto Banaràs. The still-persisting annual festival associated with Ghazi miyan, the epithet of the Ghaznavid officer of Mahmud of Ghazni, who according to the 17th century author of Mirat-i-Masudi, made several lightning raids far into eastern India, and was eventually killed by Raja Hardeva or Sahdeo on 18 Rajab. 424 or A.D. 1033 and was, soon after his burial at Bahraich, canonized as a Saint, appears to have had some truth in it. The mausoleum of Salar Masud at Bahraich was visited by Sultan Muhammad Tughlaq and Firoz Shah of Delhi and Haji Ilyas, the king of Bengal in the 14th century, and he has also been mentioned by the celebrated 14th century saint of Bihar. H. Sharafuddin Maneri. The popular and picturesque annual festival associated with his name and death was noticed at Maner by Von Graaf, the Dutch traveller, while he was travelling by boat in 1661, and still earlier, Sultan Sikandar Lodi tried in vain to stop that because the singing and dancing of Hindus and Muslims particularly by a set or mendicants, round a long bamboo pole wrapped in coloured rags with horse-hair tied on its top smacked of practices contrary to orthodox beliefs. It is just possible that the legend of Ghazi Mian was the outcome of, or became mixed up with, the eastern raids of the Ghaznavid general, Ahmad Niyaltagin. The 'ascription' of a tomb near the western gate at Barhi Dargah at Maner to Tajuddin Khandagah, and another to the west of the tank there to Momin Arif. one of the associates of Maulana Muhammad better known as Imam Taj Faqih, the traditional conqueror of Maner, cannot also be ignored.

Imam Taj Faqih, eleventh in direct descent from Abu Darda bin Abdul Mutallib, an uncle of the Prophet

safest path. They firmly and sincerely believed in the religion that was revealed through Hzt. Muhammad, the Last of the past hundreds and thousands of Prophets, and thought that his teachings freed and purified from the incrustation that had crept in the original true religion, during the course of the ages, contain the fullest and the most perfect measure of truth, and are well worth following for the eventual salvation. For this the Sufis left their homes and relations, undertook long and arduous journeys across hills and dales, seas and deserts, penetrated inaccessible regions, and worked amongst people alien to them in race, religion, traditions, and culture. Some had to pay even with their lives for their labour of love. Prompted by a desire to serve God and His creatures, imbued with the democratic spirit of Islam, and proclaiming and practising equality of all believers of the faith, they very often succeeded in creating a congenial atmosphere for their mission in a land which was torn by political strifes and was divided by sharp distinctions between caste and noncaste people, the latter being, despite their overwhelming numbers, despised and condemned by the former.

The history of Islam in eastern India before its final conquest by the Turks has yet to be reconstructed. There is practically no reliable contemporary evidence in recorded form except what little we find in the mystic literature of the 14th and the 15th centuries. But persistent local traditions recorded in some later documents can not be easily and summarily dismissed. That the impact of Islam in eastern India must have been felt long before Muhammad-bin-Bakhtiyar Khalji effected the conquest of Bihar and Bengal is attested by the Maner copper plate of the Gahadwala king, Govind Chandra of Kanauj, granted to a Brahman of Pergana Maniari (Maner) in 1183 V.S. or 1126 A.D. which can still be seen. It refers, among other things, to the obligatory payment of 'Turush ka Danda' or the Turk's duty. Taranath, the 16th century Tibetan scholar, would have us believe that a minister of the "Turushaka king of Karna land" in the west came to Magadha before its conquest by Muhammad Bin Bakhtiyar. The vague and cryptic and confused statement that "Chandra, king of the Turushka of Antarveda, entered into alliance with a number of Turushka kings in Bengal (?) and other places and conquered all the kingdom of Magadha, exterminated the priests, and destroyed the

chief orders, Chistia, Suhrawardia, Qadiria, Firdausia, Shuttaria, etc., they were all strictly orthodox, Ba-shar' (with law) and not 'Be Shar' (without law). They followed the Quran and the Sunnat (traditions), accepted all the cardinal principles of Islam, denounced all innovations in the sphere of dogmas as Bid'at (heresy), insisted upon strict adherence to, or observance of, the obligatory duties of their faith, even attempted to reconcile religion with philosophy, and tried to explain or discard all that was obviously antagonistic to the fundamental teachings of Islam. They did not stand alone in all this, for, those who had flourished before them also did the same. Sufism came to Bihar long after it had passed through its earliest phases of development such as the ascetic and ecstatic stage followed by speculative, pantheistic, and theosophical stages. Foundations had already been laid of the great Sufi Orders with their hospices and monastic establishments variously called Zawiyah, Takya, Daira, Jama'atkhana and Khanqah, and the great theorists and founder-saints had already produced their standard works, laying down the pattern of thought which was followed by others:

The Sufis of Bihar, as elsewhere, were different from the Mulla and, unlike the dry theologians or the clergy, they clung not to the letter but went to the spirit of the faith. They preferred a mystic and spiritual interpretation of the Quranic law to its mere literal sense. They considered service to God's creatures and fulfilment of their duties and responsibilities towards their fellow beings as essential for their discipline. They put aside their own desires to render themselves agreeable to all, irrespective of caste and creed, and they were free from all complexes and shackles of colour and race. They believed in gentle persuasion and infectious example of their character and devotion rather than in dialectics and argumentation to win others over to their side. It is the Sufis, not the Mullas, who proved to be the best and the most successful missionaries of Islam. They believed that a 'Kafir', unlike a 'Mushrik', could be a 'Muwahhid' (unitarian) and they quoted Ain-ul-Quzzat who said that all religions or at least a majority of them, were in essence the same. But as Muslims they were quite conscious of their duty which is to show to others what they considered to be the shortest, straightest, and smoothest, and the

theory of the independent origin or spontaneous growth trace the origin of Sufism from the life time of the Prophet and see its natural development within the framework of Islam, it being only the esoteric aspects (with emphasis on hidden or 'Batin' rather than apparent or 'Zahir' or literal meanings of the Quran) of that great religion. They bring out the examples of such companions of the Prophet as Uthman bin Maazun, Abu Dhar Ghifari, Tamim-ad-Dari, Abu-Darda, and a host of others who gave the first impulse to Islamic mysticism, because they not only denounced but also renounced wordly wealth and carnal desires, lived solely for God, and raised their voices against what they considered to be the growth of the grossly materialistic and disgustingly impious and irreligious outlook of the people. These (men of God) have been variously called As´hab-i-Safa (purity) Saff (bench) and Suffa (row), and Soof (wool). and came to be styled, in course of time, as Sufis. The derivation of the word from the Greek ´Sophist' is repudiated and the expression 'Labesa-as-Suf' (clad in wool) is considered preferable. The word Suffi in its theosophical connotation first appears in the middle of the 8th century when it was definitely applied to a certain class of ascetics and quietists who were clad in wool and practised austerities. According to Jami, Abu Hashim Kufi, was the first to get the name 'Sufi' in 150=766. Even a little earlier than him flourished the famous Sufi, Hasan-al-Basri (D. 110=728), and it is from him, through Ali, the Propht's son-in-law, that almost all the important Sufi orders trace their origin.

The theory of independent origin or esoteric Islam theory does not wholly commend itself to the western scholars. Even those who are not inclined, like many biased Christian or Jewish writers to ascribe everything good or attractive in Islam to a foreign source, find it difficult for themselves to accept any exclusive cause of the mystical movement in Islam. One cannot disregard their sober view that Sufism being essentially ecclectic, it may be said to owe its origin not to one but to various factors, internal and external.

Be that what it may, certain it is that the lives of the early Sufis of Bihar and their writings clearly show that whether they belonged to one or the other of

Dionysius, the Syrian monk, who developed a mystical theosophy, based on Hellenic sources, are said to have been the inspirers of the philosophy of Sufis. But some scholars have raised the question as to what elements of their philosophy did the Neo-Platonists originally borrow from the East, Persia and India? Does not their philosophy of Ultimate Reality and the restless soul aspiring to gain its basic unity with the Supreme one suggest the influence of oriental cults.

There is no dearth of those who question the validity of the theories of 'foreign innoculation' on the ground that definite and adequate historical evidence is lacking to prove that Islamic mysticism was a product of foreign culture, Greek or Neo-platonic ideas, Christian asceticism and monasticism, Persian and Zoroastrian beliefs, and Indian or Buddhistic and Hindu principles, practices and influences. Some like Massignon, Clarke, etc. hold that Sufism is as old as Islam itself, that Hazrat Muhammad was something of a mystic, and that the foundations of Sufism must be sought in the Quranic words which lend themselves to mystical and spiritual interpretations. The tendency to mystical life which is not confined to this or that people was not lacking in Arabian Islam of the first two centuries. Considering the universality of human mind which is essentially one, despite the barriers of distance, time and tradition, there is nothing surprising if common notions are found to run parallel in the minds of the different peoples. Similarity and unconscious coincidences need not necessarily be taken to connote borrowing or indebtedness. A like cause may give rise to a like result. Political strifes, social turmoil, and worldly outlook began in Islam soon after the death of the second Orthodox Caliph and became aggravated under the rule of the materialistic. Ummayyads of Damascus. The disgust felt at the existing state of things soon assumed a sort of spiritual revolt of which one phase was a revolt against the cold formalism, ritualism, and traditionalism of rigid orthodoxy. Even European scholars admit that the seeds of Sufism are to be found in the powerful and widely spread tendencies which arose within Islam during the first century and it was not till the third century of the Hijra that the non-Islamic influences began to affect the character of Sufism.

The advocates of the Esoteric Islam theory or the

thoughts, experiences and action, and there is nothing improbable if Sufism in Indian environment took on a Buddistic or Hinduistic touch or colour, we need not take it that Sufism in Bihar or elsewhere was merely a Muslim version of Vedantism or Yoga, Bhakti or Buddhistic system.

There are divergent theories about the origin of Sufism and scholars differ in assessing the extent of the various extra non-Islamic elements in its making. Some of them, as has been pointed out by scholars like Dr. Arberry, are mutually contradictory. Points of contact between Christianity and Sufism have been detected. It has been suggested that the earlier Arabian type of Sufism was quietism and asceticism which was influenced by Christian monasticism. The earliest Sufi is said to be like Hindu ascetics and hermits. But it is also said that the Muslim conception of Allah with His Majesty, Awe and Vengeance over-shadow the attributes of Mercy and Love. In the Islamic idea of God and Satan, the Zarathrushtrian conception of dualism and belief in the perpetual conflict between good and evil, light and darkness, has been discovered. But in Islam good and evil are two separate things and not two phases of Godhhead. H. Sharafuddin Ahmad Maneri has shown how a woman silenced an exponent of the theory of "Ahraman" and "Yazdan", and he opined that one woman, who is a gnosis is thousand times superior to an "Abid" or "Zahid" who is ignorant and is not gnostic.

Some have described Sufism as an Iranian reaction to the Arabian faith. E.H. Palmer has tried to show that Sufism is really the development of the primeval religions of the Aryan races. Those who believed in the Aryan reaction theory say that anti-Semetic reaction took two forms, Persian and Indian. Browne says that there is no historical proof that India had any direct influence on early Sufism. But the Persian theory which refers to the introduction of pantheistic element in Islam also can not explain the whole situation. Some of the early Sufis were not of Persian nationality and some of the pioneers of Islamic mysticism were Arabs and natives of Syria and Egypt and Spain. Then there are the advocates of the Neo-platonistic theory which is said to explain the origin of Sufism more adequately than other theories. Plotinus, the Egyptian (203_207 A.D.), who reinterpreted the philosophy of Plato and

parda-i-talbis ra. (6) Dar nazar farq e na manad adam-o-Iblis ra. But these are taken to be exceptions and they are interpreted to mean that every thing has its being in Him, who alone exists. A man exists with the existence of God and he can not become God and God never becomes man. The unity preached by a good Sufi is the unity of the personality of God as an object of worship and is not an abstract unity and Muslim conception is unlike the Hindu theory of Maya which treats all diversity as illusion. The Sufi does not believe like the Vedantist that the 'Jiva' is absolutely identical with the 'Brahman' and that liberation means the realization of his self with the Brahman by the removal of illusion or Maya. According to him the relation between the True Reality (Al-Haqq) and the manifested many (Khalq) which he calls Al-Ayan-al-Thabita or entities fixed in Knowledge is not of identity but of 'otherness', even as ideas of God the thing or 'Shay' are not identical with the Essence or Dhat of God. The Sufi's God, unlike the 'Nirguna' or attributeless entity, Para Brahman, is very much 'Shaguna' or possessed of attributes. He is ever alive (Howal Hayy). He is self sustaining, (Howal Qayyaum). He is Merciful (Rahman), Compassionate (Rahim) 'Howas sami-ul-baseer' (He is the hearer and the seer.) They, like Hujwiri, the author of Kashful Mahjub written in India in the Ghaznavid period, describe union or (Wasl) as the 'discovery of the way of God'. Sufism means effacement of one's desires in the will of God. While Nirvan is purely negative, Fana is accompanied by 'Baqa' or ever-lasting life in God, and the Sufi says that he who dies to self lives in God. Self-dification, 'Ittihad' or identification, 'Hulul' or incarnation, and 'Tanasukh' or transmigration are foreign to the teachings of the Sufis. Rumi's conception is 'Irtiqa' or evolution rather than 'Tanasukh' or metempsychosis. The theory of ascent (Taraqqiat) is quite different from that of descent or 'Nuzul'. Rumi writes "I died as an inanimate matter and arose as a plant. I died as a plant and arose again as an animal. I died as an animal and arose as a man; why should I fear to become less by dying. I shall die once again as a man to arise as an angel, perfect from head to foot. I shall become what is beyond the conception of man-let me then become nonexistent. To Him shall we return". And as for the other comparatively minor resemblances, though it would be unhistorical to deny the possibility of cultural contact with, and permeation of, Indian ideas in their

The Buddhistic Nirvana is said to be practically the same as the Sufistic doctrine of Fana or self effacement whose first exponent was the saint, Bayazid Bustami, a grandson of a Persian magi, and a pupil of Abu Ali Sindhi. The Sufi concept of the world of phenomena and of senses as mere mirage or mirror or reflection is said to be something like Maya. Some even mark a tendency to the belief in metempsychosis in the Sufi doctrine of 'Successive Existences' and a line from the Mathnavi of Maulana Jalaluddin Rumi, "Haft sad haftad qalib dida am;hamchu sabza bar-ha royeeda am" (I have witnessed seven hundred and seventy forms-I have grown so many times as the vegetable plants) is quoted in this connection. Legendry tales of Prince begger, Ibrahim Bin Adham (the ancestor of the Balkhi saints of Bihar) and of the begging bowl reminds such people of the Gautama theory, and Buddhistic influences are traced in the rise of monastic establishments of Khanqah, in the institution of religious orders, the system of Maqamat or stations on the road of beautitude, and the use of rosary with 90 beads. Parallel ascetic discipline, and corresponding methods of spiritual culture are found in 'Dhikr' or 'Jap', 'Pas-i-Anfas' or Pranayama, Muraqaba or Samadhi, 'Jalsa' or Asan. The idea of Awalim-i-Sab' or the seven worlds of the Sufi is considered as analogous to Sapta Loka and resemblance is found between 'Wali' or 'Arhat'. 'Insan-i-Kamil' or 'Tatha gata'. The veneration of spiritual teachers, saints, Pirs and Murshids as a sure and certain mediatory agency is taken to be comparable to the blind obedience to, and veneration of, the Hindu Guru. Procession and pilgrimages to tombs are said to hold much more important place in the estimation of the Indian Muslims than elsewhere.

A careful perusal of the works of the early Sufis of Bihar, which will be considered in the next lecture, will show that though they belonged to the 'Wujudia' rather than to the 'Shuhudia' school of Sufism, their creed being 'Hama Ust' (Every thing is Him) and not 'Hama az ust' (Everything is from Him), yet their idea of unity of God was not exactly the same as that of the Pantheistic Hindus. The ecstatic sayings and utterances of Hallaj and others have never been taken by them as the model. In an ecstatic condition the Bihar Saint, Shaikh Husain Muiz, would utter (5) 'Adam o iblis arad sajda-i pesh-i husain;gar man az rukh barku shayam

dan-o-yake been;khuda-i dar haqiqat la tanahist. (2)"Cho din-o-kufr ra yakrang didam;ze dam-i-kufr-o-din har do ba jastam".(3)"Cho raz-i-dil hama ma'lum kardam;darun-i-ka'ba aknun but parastam".(4)"Islam-o-kufr jumla yake shud barah-e-ishq;anra ke oo ba bahr-i khudawand ashnast". The 15th century Awadhi poet, Malik Muhammad Jaisi, and the 16th century Persian poet, Sa'ib, who stayed long in India have very aptly put the attitude of the Sufis in their Akhrawat and Diwan respectively "Bidhna ke marg hain tete sarag nakhat rowan jete" (various are the ways of (reaching) God;they are as numerous as the stars in the sky or the hairs on the head). "Guftugu-i-kufr-o-din akhir ba yakja mikashad;khwab yak khwab Ast amma mukhtalif tabirha" (All talks about faith and infidelity at last converge on one point Dream is one but its interpretations are many).

The Sufi, with his fervent love of, and devotion to the one Eternal Reality, immanent in all things and known through Divine Illumination and Grace, with his belief in the moral exaltation of life in pursuit of duty, with his ideas of asceticism, seclusion, control and regulation of breath, repetition of Divine Names, and with his frenzied devotion through singing, dancing and music, found a fruitful soil to thrive in India, the land of the Vedanta, Yoga and Bhakti, more than elsewhere. Certain points of resemblances between Indian systems and Islamic mysticism have led astray some people who are inclined to father the one on the other. Some have gone so far as to think that Sufism owes its origin mainly to the schools of Indian philosophy. Parallel philosophical conceptions are pointed out and striking points of contrast between Vandantism and Sufism are emphasised upon by those who take such ecstatic utterance of Husain Mansur Hallaj and Bayazid Bustami as "Aanal Haque" (I am the Truth), "I went from God to God, until He cried, from me to me O thou I". "Glory to me! How great is my Majesty" to be the echoes of the Vedantic and Upanishadic ideas and expressions like 'Tat Twam Asi (thou art), Ekam Advaitam' (one without the second), 'Aham Brahma Asmi' (I am the Supreme Spirit) The author of the Dabistan is quoted to say that the Sufi holds that God alone exists and besides Him there is no reality. As in Indian thought there is said to be in Sufism the same emanation of all things from one Supreme and the same final absorption of all things into the Divine Essence.

etc., are the virtues he has to cultivate. By self-restraint and living a life of isolation and withdrawal from the world (Khalwat wa uzla) he keeps his heart pure and rids himself of evil habits. Meditation and concentration on God (Muraqaba), self examination (Muhasaba), self mortification (Riyazat), and above all, rememberance of the names and attributes of God (Dhikr) which means repeated recital of God's name in rapid cadence with physical movements and restraints of breaths are some of the distinctive forms of Sufi's devotions. The devotional exercises were very often, and specially among the 'Chistis' and the 'Suhrawardis', accompanied by religious songs and ecstatic movements of the body called dances.

Love, liberalism, latitudinarianism and eclecticism have been the distinctive features of Sufism. Those who love God love everything in universe as the handiwork of God (Madan-ul-Maani). The Sufi represents himself as entirely devoted to the search for truth and thinks that there may be partial truth in all the different religions of the world. He holds that the foundation of all the religious beliefs must be essentially true. The different forms of worship result from a variety of names and attributes by which God reveals Himself in the creation. There is a magnificient broadmindedness in the observation of the Sufis that the ways of God are as numerous as the souls of men ("Al-turuqu-ilallah-i ka nufus-i-bani adamq") The celebrated 13th century Chisti Saint of Delhi, H. Nizamuddin Aulia, once observed "Every nation has its own way, its own faith, its own place turned to when at prayer" (Har qaum rast rahe dine wa qiblagahe.) The 14th century Sufi Saint of Amber (Bihar) of the Suhrawardi order, H. Ahmed Chirmposh, (d.775) composed many verses which emphasized the essential oneness of all schools of thought and all creeds and the importance of love for the mystics. In one of his mystic Ghazals he wrote 'Ishq ra rahnuma yake didam;ke munazzah ze kufr-o-din didam (I saw love as one and the true guide. I found it free from faith and infidelity); "Ishq shud rahbar-i-hama dinha; ishq ba kufr-o-din qareen didam" (Love has served as the guide in all religions. I saw love continguous to infidelity and faith). Elsewhere he says "Dar mazhab-i-ma dui na gunjad;ma jumla jahan yake shumarem" (There is no room for duality in our religion;we take the totality of the world as one.) He is more explicit :(1)"Hama adyan yake

(Bihar) as "Maujud Juz Az Wujud-i Ma Neest;Dar Harche Nigah Kunaim Mayaim; Har Qatra Ke Bingari Ze Darya;Daryab Ke Qatra Neest Ma yaim" (Nothing exists except our existence; whichever things we look at we will find ourselves: every drop which you see in the river;know that it is we and not the drop). Husain Muiz Balkhi said "Agarche Surat-i-Ashya Ta´addud Ast wa laik;Hama Haqiqat-i Ashya Shumul-i-Wahdat-i-ust" (Although there is a multiplicity of forms;yet the reality of these forms is inherent in Him, The One Reality.)

The aim of the Sufi is to realise the One Reality diffused over the whole universe. He considers human life as a journey (Safar) and himself as a traveller (Salik), a seeker of God. He sets out in the quest of God by slow stages (Manazil or Maqamat), the first of which is humanity (Nasut) in which he must live by action conforming to the cannon law (Shariat) and precepts and practices of Islam. The second stage is considered to be angelic in nature (malakut) which he reaches by keen perception and meditation and through the path-way of purity (Tariqat). Passing through the third stage of power (Jabarut) by requisitioning the aid of knowledge or gnosis (Marifat), he attains the Truth or Reality (Haqiqat) which is the stage of Lahut (absoption in Divinity). Hafiz says "Miyan-i-ashiq-o-mashuq hech ha'il neest;tu khud hijab-i khudi hafiz az meyan barkhez'' (Nothing stands between the lover and the beloved. You are your own curtain, Oh Hafiz! remove that). Annihilation or self effacement (Fana) does not imply the end of the Sufi 'ways' for it leads to eternal abiding in God (Baqa bad-al-fana).

The Sufi has to undergo a long course of austere and exacting disciplines prescribed by a spiritual preceptor, called Shaikh, Pir or Murshid to whom he must surrender himself completely. The rules and the methods of devotion inculcated by the Shaikh and followed by the disciples called 'Murid' constitute the 'way' or Tariqah of the Sufi. He has to fight against the temptations of the flesh or carnal desires (Nafs) and practise puritanical abstinence from wordly pleasures and enjoyments. Repentence and conversion (Tauba), renunciation (Zuhd), poverty (Faqr) patience and resignation (Sabr-o-Riza), Trust in God (Tawakkul), contentment (qana´at), humility (Inkisar), charity and generosity (Jud-o Sakha), good disposition (Khulq)

religious, moral, and social precepts they preached can hardly be ignored.

The mystic saints and Sufis played a very important part in shaping the character of Islamic thought in Bihar and elsewhere. All true and genuine Muslims in early medieval times were really mystics. Mysticism, asceticism and devotion have always been among the foremost features of Indian life and thought. But mysticism is not a monopoly of any prticiular people of racial group or country. It has appeared under various aspects among all races and in all periods. It is the religion of heart rather than of mind, and the art of awakening love of, and finding direct intercourse with, God, and the mystic's aim is self effacement to live in the Sanctuary of the One Absolute Divinity. Mysticism, according to Mubad, the 16th century Parsi author of Dabistan-i-Madhahib, written in the suburbs of Patna, belongs to all the religions and is to be found among all the nations of the world. Its adherents in India are known as Bhaktas and Sadhakas, Sufis, Faqirs and Darwishes, who all form a true mystic brotherhood. Medieval India, including Bihar, was dominated by theistic religions'Bhakti in Hinduism and Islamic mysticism or Sufism. They were both overwhelmed by a sense of love of God and the quest of the soul for the One Ultimate Reality. Sufism does not, as the suffix 'ism' would suggest, imply a body of uniform religious doctrines, dogmatic and systematized, nor is it an organized sect of Islam. Mystical principles prevailed as much among the Shia'hs as among the Sunnis.

Sufism was a common appellation of all Mualims who wanted to attain the knowledge of, get nearer to, and find union with God, through certain spiritual experiences and devotional exercises and not by mere observance of empty rituals and outward formalities. Supreme devotion to the One Real Existence of which the whole universe was taken to be a mere manifestation made the Sufi forget the non-essentials of creeds and dogmas. As a Muslim, a Sufi believes in the unitarian God of the Quran, saying there is no God but God or there is but one God, the lord of the world, and not a God of any particular nation, but he also attempts to reconcile it with the pantheistic unification which implies that there is nothing but God. The pantheistic strain is evident from such lines of the Saint of Amber

of Islamic mysticism or Sufism. But during the course of my search for, and efforts to salvage the Persian and Arabic manuscripts, I came across many copies of the Maktubat and Malfuzat (Collections of letters and of utterances) of the mystic saints, 'Diwans' (collection of mystic poems) and 'Tadhkirahs' (biographies) of the adherents of the various 'Silsilas' or orders about which people outside the province, particularly the English-reading public, know very little. Very few provinces of India could compare favourably with Bihar in preserving the religious records of the Middle Ages.

There is a tendency nowadays, however, to belittle the value of mystic and devotional literatures. Muslim mystics are generally taken to have been much more interested in spiritual practices, devotional excercises, and absorption in, and love of, the one Ultimate Reality than in the socio-economic changes and political developments that were going on around them, and their works are considered to be too dogmatic and conventional in their treatment to serve the purpose of a general reader, particularly of a student of history and culture. While it is true that in Mulfuzat and Maktubat and other miscellaneous tracts that have come down to us, we get more of the mystic philosophy, doctrines and practices of 'Tasawwuf', and attempts to reconcile them to the orthodox Islamic thoughts and traditions than what may be considered as purely political, biographical, and cultural sides of history, yet it would be wrong to ignore this type of literature altogether. A careful and somewhat painstaking examination of the contents of the Sufistic works and of even hagiological literature will show that notwithstanding much that is purely religious in it, we can yet glean from them something that may even serve as an indirect source-material of history, particularly in its cultural aspects. Considering the part played by the Sufi Mystics of Bihar in the socio-religious affairs of the community, the hold they had on the masses and even on the classes including nobles, princes and kings, the encouragement they gave to linguistic assimilation and to cultural synthesis, and the role they played in the propagation of their faith as a result of which Islam obtained a lasting foothold in the eastern provinces, the glimpses that we get in their writing of their lives and activities, piety and learning, and the information that we gather about the

It was with a mixed feeling that I received the invitation of the Registrar of the Calcutta University through my learned and esteemed friend and fellow-townsman, Dr. Md. Zubair Siddiqi, to deliver a course of Sir Abdullah Suhrawardi Lectures on a subject concerning Islamic thought and culture. Deeply conscious as I am of my own limitations, I could not but feel hesitant in accepting the offer of addressing a gathering of scholars in Calcutta. I was, however, sensible of the signal honour that was being conferred on me, and some times human vanity gets the better of one's judgement and natural reluctance to undertake a difficult task. I felt encouraged by the choice of the actual subject being left to me. The great name of Suhrawardi suggested to me the idea of presenting some aspects of Sufistic thought and culture; for Islam, in medieval Bihar, practically meant what the great followers of the celebrated Abu Najib Abdul Qadir Suharwardi (d. 563=1168) and of his disciples, Shaikh-us-Shuyukh Shihabuddin Suharwardi (d. 632=1234), and Khawaja Najmuddin Kubra (d. 540=1145) (the last being the founder of the Kubrawia, later Firdausia, and of Shuttari orders) thought, and taught in Bihar and Bengal. Claiming direct descent as I do from the great Suhrawardi saint of India, Syed Jalal Bukhari called Makhdum Jahanian of Uch (d. 785=1384) and his descendants, Burhanuddin Qutub Alam of Butuwa (d. 856=1453), and his son, Syed Muhammad Shah Alam of Rasulabad (d. 880=1475), the patron saints of Gujarat, I could not but feel interested in the subject of "Sufism in its Indian environments'. Fortunately, there is a rich and generally neglected and unknown source of knowledge of the religious activities and spiritual lives and thoughts of the Bihari mystic saints, especially of the Firdausia and Shuttaria orders, in the annals of mystic and devotional literature left by them and I could not resist the temptation of introducing them to a larger public.

I do not claim to have specialized in any particular aspect of the vast and fascinating subject

Sufism in Medieval Bihar

CONTENTS

PROF.SYED HASAN ASKARI (b.1901),Khujwa, Siwan/Saran, graduated, 1922, from G.B.B. (now L.S.) College Muzaffarpur, got his M.A.(in History) from Patna University, 1924, and B.L. 1925. Was Lecturer in History, Patna College, 1927, Asstt. Professor from 1934 to 1950, and Professor of History from 1950 to 1956.

Associate Member of Indian Historical Records Commission, Member of Bihar Research Society's Council and Editorial Board of the Medieval India Quarterly. Served as Hon. Secretary of the Bihar Regional Records Survey Committee, Hon. Joint Director of the K.P.Jaiswal Research Institute, Patna.

He was conferred 'Honoriscausa' by Magadh University in recognition of his valuable contribution to Medieval Indian History and Culture.

Islam and Muslims
in
Medieval Bihar

by
Prof. S. H. Askari

C O N T E N T S

Printer : Liberty Art Press,1528, Pataudi House, New Delhi.
Publisher : Mustafa Kamal Hashmi for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone : 50109, Telex : 22-430 KBL IN).
Editor : Dr. A. R. Bedar.
Annual Subscription :Rs.100/-(Inland) U$ 20 (Asian Countries), U$ 40 (Other Countries).Rs. 25/- Per Copy

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL





1989

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL



50

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
PATNA